کالا دل والا
محی الدّین نواب

ساون کی پہلی جھڑی بھی کیا ہوتی ہے؟دھرتی کے سینے پر پڑتے ہی مٹی کو مہکنا اور جذبوں کو ہمکنا سکھا دیتی ہے۔مہ پارہ نے برآمدے میں آکر ایک گہری سانس کھینچی.... ہائے! کچے آنگن میں مٹی کی سوندھی سوندھی مہک کورے احساسات کو گدگدا رہی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ چھجے سے آگے پھیلا دیئے۔کھلی ہوئی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔ان کی اجلی چکنی سطح پر پانی کی ننھی ننھی بوندیں یوں پھدکنے لگیں' جیسے پیل دوج کھیل رہی ہوں۔وہ بھیگی ہوئی ہتھیلیوں کو چہرے پر پھیر کر انہیں پھر بھگونے لگی۔ٹپ ٹپا ٹپ۔ٹپ ٹپا ٹپ۔بوندوں سے کھیلنے لگی۔

گھر سے باہر امبوا کی ڈالیوں پر جھولے پڑ گئے تھے۔برکھا رُت میں چہچہاہٹ خاموش ہو جاتی ہے۔ایسی رم جھم میں ہنستی کھلکھلاتی چھوریوں کی چہکار نے دھوم مچا رکھی تھی۔یہ موسم ہی ایسا ہوتا ہے۔سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولنے' پینگیں بڑھانے اور ناچنے گانے کی سحر انگیزی ساری دنیا بھلا دیتی ہے۔

سہیلیوں کے گیت اور قہقہے آنگن تک سنائی دے رہے تھے۔دل اُدھر جانے کے لئے مچلنے لگا۔اس نے بے چین ہو کر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔پھر آسمان پر نظر ڈالی۔گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ دھیمی دھیمی چھیڑ چھاڑ کرنے والی برکھا منہ زور ہونے والی ہے۔صبح سے شام' شام سے رات اور رات سے پھر صبح کرنے والی ہے۔

اس نے سر گھما کر رسوئی کی طرف دیکھا، چولہا گرم ہو چکا تھا۔سوکھی لکڑیاں

بھکا بھک جل رہی تھیں۔ پارو کی ماں سلطانی بیگم اپنی دو بوڑھی سہیلیوں کے ساتھ موسم کے خاص پکوان میں مصروف تھی۔ چولہے پر دھری کڑاہی میں کڑکڑاتا ہوا تیل پوریاں اور کچوریاں تلنے کے لئے بے قرار تھا۔یعنی باہر برسات تھی اور اندر پکوانوں کی سوغات...لیکن اس کا دل تو سہیلیوں کی طرف اٹک کر رہ گیا تھا۔

کچے آنگن میں ایک ایک قدم کے فاصلے پر پتھر رکھے گئے تھے تاکہ کیچڑ میں پاؤں آلودہ نہ ہوں۔اس نے ست رنگی چنری کو سر پر اوڑھتے ہوئے ایک پتھر پر پاؤں رکھا۔تیز بارش نے دیکھتے دیکھتے ہی چوڑی دار پاجامے کو گھٹنوں تک بھگو ڈالا۔ پھر اس نے ذرا آگے بڑھ کر دوسرے پتھر پر دوسرا پاؤں رکھا تو پوری کی پوری بھیگتی چلی گئی۔

بچپن میں وہ پاؤں پاؤں چلتی تھی۔اماں نے سمجھایا۔''اب بچی نہیں رہی ہو۔پھونک پھونک کر قدم رکھا کرو۔''

وہ ایک ایک پتھر پر پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی گھر سے باہر آ گئی۔باہر ہری بھری گھاس دھل کر نکھر گئی تھی۔اس نے ہتھیلی کا چھجا بنا کر ذرا دور آم کی درختوں کی سمت دیکھا۔بارش کی دھند میں کئی سہیلیاں جھولا جھولتی' ناچتی گاتی دکھائی دے رہی تھیں۔وہ خوش ہوکر ان کی طرف جانے لگی۔گیلی گھاس چکنی اور ملائم ہوگئی تھی۔وہ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچتے ہوئے چلائی۔

''اری او چندا!سویرا...!پھر کی...!میں بھی آ رہی ہوں۔میں بھی جھولوں گی.... آ....آ....آ۔آ آ آ....''

تمام سہیلیوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ایک ذرا پاؤں پھسلا تھا۔وہ چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی پانی میں گر پڑی۔سہیلیوں نے قہقہہ لگایا۔''ارے دیکھو!پارو گر گئی۔''

چندا نے کہا۔''ہائے راما!ہمری پارو پھسل گئی۔''

چار سہیلیاں اسے سنبھالنے کے لئے لپکیں۔مگر ان سے پہلے منصور پہنچ گیا۔ سہارے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ایک تو برسات اوپر سے یہ کیچڑ کھانچا۔دیوانوں کی طرح دوڑنے کی کیا

ضرورت تھی؟چلو اٹھو...''

وہ اسے دیکھ کر جھینپ سی گئی۔دوپٹے میں منہ چھپاتے ہوئے بولی۔''دوڑ کہاں رہی تھی؟میں تو سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔''

پھر کی منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔''ہم سب ہی سنبھلتی ہیں۔مگر کیا کریں یہ پھسلنے کی عمر ہے۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگیں۔منصور نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔''میرا ہاتھ پکڑو اور اُٹھو۔''

سویرا نے شوخی سے کہا۔''شرماتی کیوں ہو؟ہمارا آسرا نہ تکو۔جو عمر بھر تھامنے والا ہے،اسی کو ہاتھ تھماؤ۔''

اس نے شرماتے ہوئے منصور کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔پھر کی نے کہا۔''منصور بھیا!ہم نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔لپک لو اُسے....''

وہ پھر قہقہے لگانے لگیں۔منصور نے بڑی محبت سے اس کی کلائی پکڑ لی۔وہ پہلی بار ہاتھ آئی تھی اور جو پہلی بار ہاتھ آئے وہ مصری کی ڈلی لگتی ہے۔پتہ نہیں کتنی بار رال ٹپکی ہوگی' تب کہیں جا کر مل رہی تھی۔کیسی نرم اور اجلی کلائی تھی۔گرفت میں آئی تھی اور بتاشے کی طرح گھل رہی تھی۔

پھر واقعی وہ گھل گئی۔ہاتھ سے پھسل گئی۔وہ اس کے سہارے اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر سہارا دینے والے نے اچانک ہی اسے چھوڑ دیا۔کلائی چھوٹی تو وہ اٹھتے اٹھتے پھر گر پڑی۔اسے سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔

وہ دور کسی اور کو تک رہا تھا۔اس کے ابّا میاں سر پر چھتری تانے دکھائی دیئے۔ وہ گلی سے نکل کر دوسری طرف جا رہے تھے۔انہوں نے بیٹے کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ مگر بیٹا وہاں سے سرپٹ بھاگتا چلا گیا۔

ساری سہیلیاں قہقہے لگانے لگیں۔مہ پارہ نے جھینپ کر اسے بھاگتے ہوئے دیکھا۔سب کے سامنے سبکی ہو رہی تھی۔سہارا دینے والا باپ کے خوف سے فرار ہو گیا تھا۔

پھر کی نے کہا۔''اے لو...منصور بھیا تو کھسک لئے۔اب ہماری پارو کو کون

اٹھائے گا؟''

وہ خود ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پہلے بھی اٹھ سکتی تھی۔ اس کی محتاج نہیں تھی۔ مگر ایک مان تھا کہ اسے اٹھانے والا آیا ہے۔ اسی کے سہارے اٹھے گی۔ نہیں تو بیٹھی رہ جائے گی۔ ابھی یہ سمجھنے کی عمر نہیں تھی کہ کوئی اٹھانے والا نہ آئے تو لڑکیاں بیٹھی ہی رہ جاتی ہیں۔

چندا نے پاس آکر کہا۔''بہت ہی ڈرپوک ہیں۔ لبّا میاں کی بُو پاتے ہی کنی کھا کر نکل جاتے ہیں۔''

وہ حیا والی تھی۔ پہلے کبھی ہاتھ تو کیا' انگلی پکڑنے کا بھی موقع نہیں دیتی تھی۔ آج موقع کی مناسبت سے ہاتھ بڑھایا تو وہ ناقدرا پیار کی پہلی سوغات چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بیچاری کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔

وہ سہیلیوں سے نظریں چرا کر لباس درست کرتے ہوئے بولی۔''سارے کپڑے گندے ہوگئے۔ گھر جا کر دھونا ہوگا۔''

سویرا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔''ابھی بارش میں جھولوگی تو سب دھل جائے گا۔''

اب جھولنے کو کس کا دل کر رہا تھا؟ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔''نہیں.... کیچڑ پانی سے الجھن ہوتی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔''

دراصل پہلے دل جھومتا ہے، پھر جھولنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت نہ ہو اور جھولنا چاہو تو سر گھومنے لگتا ہے۔

وہ ان کے درمیان ٹھہر نہ سکی۔ گھر کی سمت چل پڑی۔ بڑے ارمان سے' بڑے شوق سے جھولے پر کھڑی ہو کر بل کھا کر جھولنے اور پینگیں بڑھانے آئی تھی۔ مگر پینگیں بڑھانے والے نے اسے دو کوڑی کا کر دیا تھا۔

وہ گھر کے پاس آئی تو دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ وہاں محبوب علی ہاتھ میں چھتری اٹھائے کھڑا تھا۔ دستک کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر رک گیا۔ وہ بھیگی سی لڑکی نگاہوں کے سامنے یوں چلی آئی تھی' جیسے اچانک ہی برسات میں دھوپ نکل آئی ہو۔

چہرے اور ہاتھوں پر کیچڑ کے دھبے نظر آرہے تھے۔ لباس بھی آلودہ تھا۔ حسن کی آرائش کے لئے سولہ سنگھار کئے جاتے ہیں۔ مگر وہ تو کیچڑ میں کنول کی طرح کھل رہی تھی۔ خوشبو کی طرح احساسات کو چھو رہی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا مگر سو رہا تھا۔ کھڑے کھڑے خواب دیکھ رہا تھا۔

پارو نے ایک نظر اسے دیکھا۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ نظروں سے ''اونہہ..'' کہتی ہوئی سامنے سے گزر گئی۔ محبوب علی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ایک وہی کیا' کوئی بھی اسے نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔

اللہ میاں نے جانے کیوں اسے بناتے بناتے بگاڑ دیا تھا؟ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا، رات کو سیاہ لگتا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں خوبصورت لگتی تھیں مگر سیاہی کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بھیانک سی دکھائی دیتی تھیں۔ سفید دیدوں میں سرخ ڈورے پڑے رہتے تھے۔ یہ اس لئے کہ کبھی کبھی دارو پی لیا کرتا تھا۔

ناک نقشہ دیکھو تو ناک پھیلی ہوئی تھی۔ نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ نقشہ بگڑا سا گیا تھا۔ اگرچہ بہت ہی نرم اور ٹھنڈا مزاج رکھتا تھا مگر پھولے ہوئے نتھنوں سے لگتا تھا' جیسے غصے میں ہے۔

کان معمول سے کچھ بڑے تھے۔ ان کے اوپری حصے رامپوری ٹوپی میں چھپ جاتے تھے۔ وہ ٹوپی اسے کسی حد تک مضحکہ خیز بنا دیتی تھی۔ قدرت نے دوسروں کو بڑھ چڑھ کر دیا تھا مگر اسے دیتے وقت گھٹا دیا تھا۔ اس سے زیادہ گھٹیا پن دیکھنے والوں کی نظروں میں ہوتا تھا۔ ان کی آنکھیں کہہ دیتی تھیں کہ تم ہم سے کمتر ہو۔

مہ پارہ بھی نگاہوں سے پتھر مار کر گئی تھی۔ وہ بھی کیا کرے؟ یہ انسانی فطرت ہے' جو آنکھوں کو اچھا نہ لگے۔ وہ دل کو بھی نہیں لگتا۔ کڑوا تو کڑوا ہی ہوتا ہے۔ بھولے سے بھی منہ میں آجائے تو تھوک دیا جاتا ہے۔

اس نے ایک سرد آہ بھر کر اپنے آپ سے کہا۔''محبوب میاں! ہم بگڑی ہوئی صورتِ حال کو سنوار سکتے ہیں۔ مگر بگڑی ہوئی صورت کسی صورت سنوار نہیں پائیں گے۔''

سر پر ٹپا ٹپ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ وہ خیالات سے چونک گیا۔ نہ جانے کس

گھڑی میں چھتری والا ہاتھ نیچے ہو گیا تھا۔ وہ لباس سمیت بھیگ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی چھتری سیدھی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ نہیں تھی، دل نے مچل کر کہا کہ ابھی تو یہیں نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر اچانک کہاں چلی گئی؟

''کیا وہ سچ مچ نہیں تھی؟ خیالوں میں آئی تھی؟ وہ اُونہہ کہہ کر' منہ پھیر کر نہیں گئی تھی....؟''

فریبِ نظر بھی کیا ہوتا ہے؟ غائب کو حاضر اور حاضر کو غائب کر دیتا ہے۔ وہ خوش گمان تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ''یہ میرا وہم ہے۔ اس نے اُونہہ نہیں کہا ہے۔ پتھر نہیں مارا ہے۔''

محبت کے انداز بھی عجیب ہیں۔ کنکر مارو تو محبت کا اشارہ ہے۔ پتھر مارو تو خوش فہمی فنا ہو جاتی ہے۔

اسے وہم تھا کہ وہ نام کی مناسبت سے محبوب ہے۔

یہ وہم بدگمان کرتا ہے۔ ہاں ہونے والی ہو تو ناں کہہ کر دل دھڑکاتا ہے۔ دل کہہ رہا تھا۔ ''پارو سمجھدار ہے۔ منہ کے سامنے دل توڑنے والی بات نہیں کرے گی۔''

اور واقعی پارو نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ جو لاشعور میں تھا' وہ آنکھیں بول کر چلی گئی تھیں۔ اس نے آنے والے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔

ان ہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

وہ پتھروں پر چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ سلطانی بیگم استقبال کے لئے برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''جگ جگ جیو... مگر یہ کیا؟ تم بھیگے ہوئے کیوں ہو؟''

وہ اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے بولا۔ ''دو چار بوندیں پڑ گئی ہیں۔ خشک ہو جائیں گی۔''

وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''دو چار...؟ میاں! تمہاری تو پوری شیروانی بھیگی ہوئی ہے۔ لگتا ہے' چھتری بغل میں دبا کر غسل کرتے آ رہے ہو۔ جب یہ ہاتھ

میں ہے تو یہ حالت کیونکر ہوئی؟ ذرا دکھاؤ تو سہی۔''

وہ چھتری اس کے ہاتھ سے لے کر روشنی کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا اس موئی میں چھید ہو گئے ہیں؟''

وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ اسے کیا بتاتا کہ دماغ میں چھید ہو گئے ہیں۔ پارو وہاں سے چھما چھم برستی رہتی ہے۔ آگے ہو سکتا ہے' دماغ کو چھلنی کر دے۔

پھر کیا ہوگا؟ کچھ تو کرنا ہی ہوگا...

وہ اپنی چھتری لیتے ہوئے بولا۔ ''اس میں کوئی چھید نہیں ہے۔ بارش بہت تیز ہے۔ ایک ذرا ہاتھ بہکا تھا' یہ ذرا اِدھر سے اُدھر ہوئی اور ہم بھیگ گئے۔''

اس نے چھتری بند کر دی۔ ایسے ہی وقت پارو وہاں پہنچ گئی۔ محبوب نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ نظر بھر کر دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ کہیں ناراض نہ ہو جائے۔

سلطانی بیگم نے کہا۔ ''تُو اب تک یونہی پھر رہی ہے؟ نہا دھو کر کپڑے کیوں نہیں بدلتی؟ بارش کا پانی ہے۔ سر میں جوئیں پڑ جائیں گی۔ جا.... جلدی سے نہا لے۔''

بیٹی کا منہ ماں کی طرف تھا، وہ جیسے آنے والے کو نہیں دیکھ رہی تھی، مگر دھیان اسی طرف تھا۔ محض اس سے کترانا مقصود تھا۔ اس نے کہا۔ ''نہانے ہی جا رہی ہوں۔ لیکن میرا وہ کیسری دوپٹہ نہیں مل رہا ہے، کہاں رکھا ہے؟''

''تُو دوپٹوں کو کیڑا لگنے کے لئے اِدھر اُدھر پھینک دیتی ہے۔ میں نے کافور کی گولیاں ڈال کر اسے صندوق میں رکھا ہے۔''

وہ فوراً ہی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ ماں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''سنبھال کر نکالیو۔ دوسرے کپڑوں کی تہہ خراب ہوئی تو تیری خیر نہیں۔''

پھر اس نے محبوب علی سے کہا۔ ''اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ بچوں کی طرح کیچڑ میں لوٹ پوٹ کر آئی ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر بجھ رہا تھا۔ کیونکہ اس نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ یہ امید نہیں تھی کہ اسے اپنائیت سے دیکھتی مگر اخلاقاً خوش آمدید کہنے کے انداز میں تو دیکھ سکتی تھی۔

آدمی صرف دیکھتا نہیں ہے۔خود کو دکھانا بھی چاہتا ہے۔ ہر شخص دیکھنے میں کچھ تو اچھا لگتا ہے۔اچھا نہ لگے تب بھی نظریں ملاتے ہوئے سلام کلام رکھنا چاہئے۔مگر اس نے سلام کلام کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔

وہ خیالوں سے چونک گیا۔سلطانی بیگم کہہ رہی تھی۔''تم یہ شیروانی اور ٹوپی اتار دو۔گرمی ہو یا سردی' تن پر گیلے کپڑے موسمی بخار لے آتے ہیں۔''

اس نے ٹوپی اتارتے ہوئے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔جانے والی واپس آرہی تھی۔غسل خانہ آنگن کے اُس پار تھا۔وہ برآمدے سے اتر کر اُدھر جانے لگی۔

محبوب علی نے فوراً ہی چھتری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''اسے لے لو نہیں تو واپس آتے آتے بھیگ جاؤ گی۔''

اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کتراتے ہوئے کہا۔''نہیں بھیگوں گی۔یہاں سے غسل خانے تک کا فاصلہ ہی کتنا ہے؟یوں جاؤں گی اور یوں آجاؤں گی۔''

ماں نے کہا۔''چھوڑو میاں!اسے تو بارش میں بھیگنے کا خبط ہے۔تم اپنی شیروانی اور ٹوپی اسے دے کر اندر چلو۔یہ انہیں برآمدے کی الگنی پر ڈال دے گی۔''

پارو نے ایک ذرا ٹھٹک کر ماں کو دیکھا۔محبوب علی نے جلدی سے کہا۔''رہنے دیں خالہ!ہم انہیں یہاں چارپائی پر ہی پھیلا دیں گے۔تم جاؤ پارو!''

اس کے سر سے بوجھ اتر گیا۔وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔اس نے شیروانی اتاری۔سلطانی بیگم نے اسے لے کر چارپائی پر پھیلاتے ہوئے کہا۔''بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی تمہارا انتظار کررہی تھی۔''

دل میں خوش فہمی پیدا ہوئی۔اس نے بے چین ہوکر پوچھا۔''کون انتظار کررہی تھی؟''

''میں....اور کون....؟''

دل کی دھڑکنیں پل بھر کو تیز ہوئی تھیں' پھر رفتار بھول گئیں۔اپنے حالات' اپنی اوقات کے مطابق نہ چلو تو رفتار گڑبڑا جاتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔''میں تمہاری اچھی خالہ سے کہہ رہی تھی' تم رُت کا میوہ کھانے ضرور آؤ گے۔''

اس نے پوچھا۔''کیا اچھی خالہ یہاں ہیں؟''

''وہ اور کہاں ہوں گی؟اچھی اور میمونہ میری بچپن کی سہیلیاں ہیں۔اندر گرما گرم کچوریاں اتاررہی ہیں۔حلوہ پوری اور آلو کی چٹ پٹی ترکاری بنائی ہے۔دو گھڑی میں پکوڑے بھی تیار ہوجائیں گے۔آؤ۔اندر چلو....میں ابھی دستر خوان لگائے دیتی ہوں۔''

وہ پلٹ کر اندر جانے لگی۔اس نے سر گھما کر غسل خانے کی طرف دیکھا۔پھر ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا۔میمونہ اور اچھی خالہ کو سلام کرکے ایک تخت پر بیٹھ گیا۔

میمونہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔''اے میاں!تم عید بقرعید' ہولی دیوالی سب ہی تہواروں پر ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہو۔ایک چولہا گرم کرنے والی کو کیوں نہیں لے آتے؟''

اچھی خالہ نے اس کی تائید میں کہا۔''اور نہیں تو کیا؟ تمہاری عمر کے سب ہی چھوکرے بال بچوں والے ہوگئے ہیں۔تم کب تک یونہی لنڈورے پھرتے رہوگے؟''

اس نے مسکرا کر کہا۔''ہم اسی لئے یہاں آتے ہیں کہ آپ سب مل کر ہمارے لئے کچھ کریں گی۔''

ایسا کہتے ہوئے اس نے ذرا سر گھما کر دروازے کی طرف یوں دیکھا' جیسے آنگن کی طرف دیکھنا چاہتا ہو۔ان خواتین نے ایک دوسرے پر معنی خیز نظریں ڈالیں۔پھر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگیں۔

انہوں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے۔ان سب کے ہاں جوان بیٹیاں تھیں۔محبوب علی ان کے گھروں میں آتا جاتا رہتا تھا۔کبھی موسم کے پھل اور میوے لاتا تھا' کبھی ان کی ضرورتوں کے مطابق اپنی بگھی میں بٹھا کر اسٹیشن' ہسپتال یا بازار لے جاتا تھا۔یوں آنے جانے اور تعلقات بنائے رکھنے کی راہیں نکالتا رہتا تھا۔

سلطانی بیگم نے جلدی سے کہا۔''میں تو دونوں آنکھوں سے تمہارے لئے لڑکی ڈھونڈ رہی ہوں۔میرے بس میں ہوتا تو تمہیں اپنا ہی داماد بنالیتی۔''

وہ ایکدم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، جیسے مہ پارہ اس کے پاس آ کر بیٹھنے والی ہو۔
سلطانی بیگم نے کہا۔ ''مگر کیا کروں؟ تمہیں داماد نہیں بنا سکتی۔''
وہ مایوس ہو کر بولا۔ ''کیا اس لئے کہ ہم....''
وہ بولتے بولتے اٹک گیا۔ اپنے منہ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بدصورت ہے۔
سلطانی بیگم نے کہا۔ ''نہیں بیٹے! خوبصورتی بدصورتی کی بات نہیں ہے۔ دراصل میری پارو کا رشتہ بچپن میں ہی پھوپھی کے بیٹے سے طے ہو چکا ہے۔''
وہ بولتے وقت محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ منہ لٹک گیا تھا' جیسے پھانسی پر لٹک گیا ہو۔ اچھی خالہ نے کہا۔ ''محبوب! تمہیں یاد ہے ناں' میں چار ماہ پہلے بریلی گئی تھی؟''
وہ سر ہلا کر بولا۔ ''جی۔ اپنی آپا سے ملنے گئی تھیں۔''
''آپا نے مجھے نئے رشتے کی زنجیر پہنادی میری جمیلہ کو چوڑیاں پہنا کر کہہ دیا۔ اب یہ میری ہونے والی بہو ہے۔ اسے کسی اور کے نام کی چوڑیاں نہ پہنانا۔''
وہ محبوب کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''اسی لئے تو میں باہر تمہارے لئے لڑکی ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔''
میمونہ نے گرما گرم حلوہ پوری اور آلو کی چٹ پٹی ترکاری لا کر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''لو میاں! بسم اللہ کرو۔''
اس نے سر اٹھا کر میمونہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی چندا کا رشتہ بھی ضرور کہیں ہو چکا ہے؟''
''نہیں میاں! جب نہیں ہوا تو کاہے کو بولوں کہ ہو چکا ہے۔ البتہ میری بیٹی منہ پھٹ ہے۔ جو بولتی ہے منہ پر بولتی ہے۔ میں نے تمہاری بات کی تو صاف کہہ دیا کہ شادی کا نام ہی نہ لوں۔ اسکول کے بعد کالج کی چھ جماعتیں پڑھے گی۔ یعنی چھ برسوں کے لئے اس نے شادی کا معاملہ ٹال دیا ہے۔''
اسے ان منہ بولی خالاؤں کی بیٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان کے گھروں میں جاتا تھا۔ مگر ہر جگہ مہ پارہ اس کے اندر گھسی رہتی تھی۔ وہ اسی کی خاطر اب تک کنوارا پھر رہا تھا۔ آج تو سلطانی بیگم نے یہ کہہ کر کنی کاٹ دی تھی کہ مہ پارہ کا رشتہ

اس کے پھوپھی زاد سے ہو چکا ہے۔
میمونہ نے کہا۔ ''تم نے تو ہاتھ روک لیا ہے۔ کھانا تو شروع کرو۔''
وہ دسترخوان سے پرے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا جی نہیں کر رہا، پھر کسی وقت آ کر کھائیں گے۔''
سلطانی بیگم نے کہا۔ ''اے میاں! میں نے تمہیں اپنا بنا کر رکھنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ جب بھی آتے ہو' صدقے واری جاتی ہوں اور تم ہو کہ دل چھوٹا کر رہے ہو۔''
اچھی خالہ نے کہا۔ ''ہمارا وعدہ ہے' ہم تمہارے لئے چاند سی دلہن ڈھونڈ کر لائیں گے۔ چلو! کھانے سے ہاتھ نہ کھینچو۔ شروع کرو۔''
''نہیں خالہ! ابھی کھائیں گے تو اُلٹ کر آئے گا۔ ذرا طبیعت بحال ہو گی تو ہم کسی دن آ جائیں گے۔''
ایسے وقت آنگن سے بنّے میاں کی آواز سنائی دی۔ ''آپا! کہاں ہیں آپ...؟ یہ آنگن تو بارش میں دلدل ہو جاتا ہے۔ کیا مشکل ہے، ایک ایک اینٹ پر پاؤں رکھ کر سرکس دکھانا پڑتا ہے۔''
وہ پتھروں پر پاؤں رکھتا ہوا' دونوں ہاتھوں کو اوپر نیچے کرتا ہوا توازن برقرار رکھتا ہوا آ رہا تھا۔ پھر چھجے کے نیچے آ کر بولا۔ ''شکر ہے' پل صراط پار کر کے آ ہی گیا۔''
سلطانی بیگم ہنسنے لگی۔ ایسے وقت محبوب علی کمرے سے باہر آیا۔ بنّے میاں نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''
سلطانی بیگم نے بھائی کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اے ہے... یہ کیا بول رہے ہو؟ یہ تو ہمیشہ ہی آتا ہے اور آتا رہے گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے اسے بیٹا بنایا ہے۔''
وہ بولا۔ ''کوئی بیٹا ویٹا نہیں ہے۔ کیا آپ دارُو پینے والے کو بیٹا بنائیں گی؟''
''دارُو....؟''
تینوں خواتین بے یقینی سے محبوب علی کو دیکھنے لگیں۔ ایک نے کہا۔ ''اے بنّے میاں! کیسی باتیں کرتے ہو؟ ہم نے تو کبھی انہیں بیڑی پیتے' پان کھاتے نہیں

دیکھا۔"

بنّے میاں نے کہا۔"میں نے تو دیکھا ہے۔یہ کل رات دارُو کی بھٹی میں گیا تھا۔پوچھیں گیا تھا یا نہیں؟"

سب نے محبوب علی پر نظریں گاڑ دیں۔وہ ان سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔"ہم جا رہے ہیں۔پھر بلائیں گی تو سلام کرنے آجائیں گے۔"

بنّے میاں نے کہا۔"ابھی تو سامنے ہو۔کیوں منہ چھپا کر جا رہے ہو؟ہم شریف لوگ ہیں۔ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے نشے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ہمارے گھروں میں جوان بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔تم یہاں آؤ گے تو کیا لوگ باتیں نہیں بنائیں گے؟"

محبوب نے جھکی جھکی نظروں سے خواتین کو دیکھا۔پھر کہا۔"لوگ ہماری ایک خرابی پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور دس خوبیوں کو یکسر بھول جاتے ہیں۔"

میمونہ نے کہا۔"یہ ایک خرابی کیوں ہے؟وہ بھی دارُو جیسی گندی چیز....توبہ توبہ...."

بارش تھمی نہیں تھی۔مسلسل ہو رہی تھی۔محبوب علی چھتری ٹیکتا ہوا بھیگتا ہوا آنگن میں آتے ہوئے بولا۔"جب' دنیا والے بہت زیادہ پتھر مارنے لگتے ہیں اور چوٹ برداشت نہیں ہوتی تو کبھی کبھی پی لیتے ہیں۔غم غلط ہو جاتا ہے۔ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتے ہیں کہ دنیا کیسی دوغلی ہے؟"

وہ بھیگ رہا تھا۔چھتری نہیں کھول رہا تھا۔اس نے اینٹوں پر پاؤں نہیں دھرے تھے۔کیچڑ آلود آنگن میں ٹخنوں تک ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا۔"گرو گووِندا کو آپ سب جانتی ہیں۔وہ اپنے محلے کے بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے بوڑھے ہو گئے۔انہوں نے کبھی پیسے لے کر تعلیم نہیں دی۔کسی کے گھر سے کھانا آجاتا تو کھا لیتے۔ہولی دیوالی پر کپڑے ملتے تو پہن لیتے۔"

وہ چھتری ٹیکتا ہوا دو قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔"انہیں پچھلے ہفتے چیچک ہو گئی۔یہ ایسا مرض ہے کہ سب ہی دور بھاگتے ہیں۔پچیس برسوں سے تعلیم حاصل کرنے والے بچے اور ان بچوں کے ماں باپ ان کے پاس نہیں گئے۔"

وہ بھیگ رہا تھا۔اس نے سر گھما کر آنگن کے آخری سرے پر غسل خانے کی

طرف دیکھا۔پھر کہا۔"مہ پارہ' چندا' جمیلہ' بنّے میاں نے اور ہم نے پہلی دوسری جماعت کی کتابیں ان سے پڑھی ہیں۔وہ ابتدائی بنیادی تعلیم ہمارے اندر ہے اور رہے گی۔مگر گرو جی کو ہمارے ضمیر نے بھلا دیا۔کوئی ان کے قریب نہیں گیا۔چیچک کی بیماری ایسی ہی ہوتی ہے، سب ڈرتے ہیں۔ہم اور دو چار ہندو عورتیں اور مرد اُن کی تیمارداری کے لئے جاتے تھے۔کل رات ان کا دیہانت ہو گیا۔"

سلطانی بیگم نے کہا۔"ہمیں ان کی موت کی خبر ملی تھی۔سن کر بہت دکھ ہوا۔مگر یہ باتیں ہمیں کیوں سنا رہے ہو؟"

"گرو جی کی تعلیم اس گھر میں بھی آئی ہے۔مگر اس گھر سے بنے ماموں ان کے کریا کرم میں نہیں گئے۔"

بنے نے تڑخ کر کہا۔"ہاں نہیں گیا...میں نے تمہاری ایک بد عادت پکڑی ہے تو مجھ پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔تمہیں کیا پتہ' میں وہاں گرو جی کی ارتھی کے پاس موجود تھا۔"

"پاس نہیں تھے، دوسرے لوگوں کی طرح وہاں سے سینکڑوں گز کے فاصلے پر تھے۔سب ہی خوفزدہ تھے کہ مردے کی بیماری انہیں لگ جائے گی۔"

اچھی خالہ نے پوچھا۔"تم اس بات کا جھگڑا یہاں کیوں اٹھا رہے ہو؟"

وہ بھیگتا ہوا آنگن پار کرتے ہوئے بولا۔"بتا رہا ہوں کہ سارے شہر نے گرو جی کی تمام نیکیوں کو بھلا دیا۔انہیں صرف ان کی چیچک دکھائی دی۔کسی نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ وہ ہماری دنیا میں کسی سے ایک پیسہ بھی لینے نہیں آئے تھے۔صرف علم دیتے رہے تھے۔آخری وقت کسی نے انہیں چِتا کی لکڑیوں تک نہیں پہنچایا، ہم نے پہنچایا۔ہم ہی نے چتا کو آگ لگائی۔"

بارش موسلا دھار ہو گئی تھی۔رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔اس کے شور میں محبوب کی آواز ڈوب رہی تھی۔وہ دروازے کی طرف کہتا جا رہا تھا۔"جب بے ضمیر ہو کر سچائی کو اور اچھائی کو چتا میں جلا دیا جاتا ہے یا مٹی میں ملا دیا جاتا ہے' تب ہمیں پتھر لگتے ہیں اور ہم غم غلط کرنے چلے جاتے ہیں۔"

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔"گرو جی اچھے رہے۔انہیں کچھ پتہ نہ چلا

کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ انہیں کس طرح دنیا سے نکالا گیا؟ ہمیں معلوم ہو رہا ہے کیونکہ ہم جیتے جی نکل رہے ہیں۔"

وہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہاں سے ایک سمت مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بارش کا شور بڑھ گیا تھا اور سب ہی کو چپ لگ گئی تھی۔

مہ پارہ نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر کہا۔ "شکر ہے' حضرت چلے گئے۔ پتہ نہیں کیا بول رہے تھے؟ بارش کے شور میں سنائی نہیں دیا۔"

وہ بڑا سا ٹاٹ سر پر رکھ کر اپنے وجود کو چھپاتی ہوئی چھجے تلے آگئی۔ بنّے میاں نے کہا۔ "اچھی خالہ! یہ جاتے جاتے چھینٹے مار گیا ہے کہ ہم ایک شریف اور نیک بندے کو گھر سے نکال رہے ہیں۔"

مہ پارہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا واقعی انہیں نکال دیا گیا ہے؟ اب وہ کبھی نہیں آئیں گے؟"

"نہیں آئے گا۔ ہم دارو پینے والے کو دہلیز پر پاؤں نہیں رکھنے دیں گے۔"

"دارو....؟" مہ پارہ نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "وہ کون سے گلفام ہیں، جو دارو پی کر فلمی ہیرو بنتے ہیں؟ توبہ ہے' پینے کے بعد اور بھیانک لگتے ہوں گے۔"

میمونہ نے کہا۔ "رسوئی میں چلو۔ موسم کا مزہ اٹھاؤ۔ اس کا دانا پانی یہاں سے اٹھ گیا ہے۔ رزق سامنے تھا اور وہ سوکھا منہ لے کر چلا گیا۔"

وہ سب باتیں کرتے ہوئے رسوئی میں آ کر بڑی سی چٹائی بچھا کر بیٹھ گئے۔

میمونہ اور اچھی خالہ نے چولہا گرم کیا۔ کڑاہی چڑھائی پھر پوریاں تلنے لگیں۔ سلطانی بیگم نے کہا۔ "آج پہلی بار اس کی ایک برائی معلوم ہوئی' ورنہ سچ پوچھو تو اس میں بڑی اچھائیاں ہیں۔"

بنّے میاں نے کہا۔ "کیا خاک اچھائیاں ہیں؟ سب ہی اسے پیٹھ پیچھے بن مانس کہتے ہیں۔"

"انسان کی اچھائیاں چہرے مہرے سے نہیں سمجھی جاتیں۔"

مہ پارہ نے کہا۔ "تو کیا اسے دولت سے ناپا تولا جاتا ہے؟ اماں! آپ ان کی حمایت میں اس لئے بولتی ہیں کہ ہم غریب ہیں۔"

بنّے میاں نے کہا۔ "خدا نہ کرے' ہم غریب ہوں۔ میں پورے سو روپے مہینہ کماتا ہوں۔ ہم تینوں وقت اچھا کھاتے ہیں اور اچھا پہنتے ہیں۔"

پھر وہ سینہ تان کر بولا۔ "یاد ہے' میں کمپنی کی طرف سے ہوائی جہاز میں لکھنؤ سے دہلی گیا تھا؟ محبوب علی کو ایسے مہنگے ہوائی جہاز میں بیٹھنا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔"

سلطانی بیگم نے کہا۔ "اس کے پاس بہت پیسہ ہے۔ وہ جب چاہے ہوائی جہاز میں کہیں بھی جا سکتا ہے۔"

بنّے میاں نے تن کر کہا۔ "اس کا باپ بھی نہیں جا سکتا۔ جہاز میں دارو پینے والوں کا سر چکراتا ہے۔ مجھے تو ویسے ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ تو جہاز میں بیٹھ ہی نہیں سکے گا۔"

پھر وہ پہلو بدل کر بولا۔ "اگر اس کے پاس پیسہ ہے تو ہمارے پاس بھی تھا۔ دادا جان نے ایک گاؤں برابر زمینیں چھوڑی تھیں۔ ابا جان شراب کباب میں مست رہ کر ہمیں کنگال بنا گئے۔"

پوریاں' پکوڑیاں' آلو کے قتلے چولہے سے اتر رہے تھے اور دسترخوان پر آ رہے تھے۔ گرما گرم کھاتے وقت بارش کی رم جھم مزہ دے رہی تھی۔

میمونہ نے چونک کر بنّے میاں کو دیکھا پھر کہا۔ "اے میاں! ابھی تو تم نے کہا تھا 'تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے نشے کو ہاتھ نہیں لگایا؟"

سلطانی بیگم نے چھوٹے بھائی کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی جوتی اٹھا کر منہ لال کر دوں گی۔ ابا مرحوم کے بارے میں ایسا کہتے شرم نہیں آتی؟"

بنّے میاں نے سر جھکا لیا۔ میمونہ نے کہا۔ "اے ہے سلطانی! کیوں اسے غصہ دکھا رہی ہو؟ میرے میاں بھی پیتے ہیں۔ مگر ہاں' دیسی کو چھوتے بھی نہیں۔ تمہارے ابا جان تو پڑھے لکھے تھے۔ انگریزی بولتے تھے۔ میرے میاں کی طرح ضرور ولایتی پیتے ہوں گے؟"

اچھی خالہ نے کہا۔ "ولایتی کی شان ہی الگ ہے۔ میرے سسر بھی پیا کرتے تھے اور میرے میاں بھی بس کبھی کبھی منہ لگا لیا کرتے ہیں۔"

سلطانی بیگم ان کی باتیں سن رہی تھیں اور ایک ایک کا منہ تک رہی تھیں۔ اس

نے پوچھا۔ ''پھر بیچارے محبوب علی کو معتوب کیوں سمجھا گیا؟''

بنّے میاں نے کہا۔ ''اس لئے کہ دارو بہت ہی گندی چیز ہے۔ اسے چھوٹے اور گرے پڑے لوگ منہ لگاتے ہیں۔ ایسی سڑی بو ہوتی ہے کہ مچھر مر جاتے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ وہ مچھر مارنے والی دوا پیتا ہے۔''

خواتین نے ایسے منہ بنایا جیسے ابکائی آ رہی ہو۔ ایک نے کہا۔ ''توبہ ہے' یہ لعنتی چیز کیسے حلق سے اترتی ہے؟''

''کہتے ہیں' کوے کی ناک نہیں ہوتی، وہ غلاظت کھا لیتا ہے، وہ بھی کوے کی طرح کالا ہے ناں....''

میمونہ نے کہا۔ ''انگریز بہادر ولایتی پیتے ہیں۔ اس کا ایک اونچا معیار ہے۔ اسے تو اونچے لوگ ہی پیا کرتے ہیں۔''

انسان فطرت سے مجبور ہے۔ وہ حالات سے اور ضرورت سے مجبور ہو کر کسی بھی چیز کو جائز یا ناجائز ٹھہراتا ہے۔ وہ بھی اپنی باتوں سے اور حوالوں سے ولایتی کو جائز قرار دے رہی تھیں۔ یوں دیسی پینے والے کو گرے ہوئے لوگوں میں شمار کر رہی تھیں۔

مہ پارہ نے کہا۔ ''یہ کیا آپ لوگوں نے دیسی اور ولایتی کی بحث چھیڑ دی ہے؟ کوئی دوسری بات نہیں کی جا سکتی؟''

دوسری بات شروع ہوئی تو میمونہ نے کہا۔ ''مجھے جلدی جانا ہے۔ جب آئی تھی تو میرے پوتے کو بخار تھا۔''

سلطانی بیگم نے کہا۔ ''یاد ہے میمونہ! جب تمہاری بہو کی زچگی ہو رہی تھی اور کچھ ایسی خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ دائی ماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تب محبوب علی ہم سب کو اپنی بگھی میں ہسپتال لے گیا تھا۔''

وہ مردہ سی آواز میں بولی۔ ''ہاں، یاد ہے۔ میں تو بلراج کی بیل گاڑی منگوانے والی تھی۔''

''مگر دیر ہو جاتی۔ محبوب علی نے بروقت پہنچایا تھا۔ ہسپتال والوں نے پورے چار سو روپے مانگے تھے۔''

میمونہ سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ میں نے کبھی چار سو روپے ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے۔ جب محبوب نے اتنے سارے روپے دیئے تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔''

اس نے اپنی آنکھوں پر دوپٹہ رکھ لیا۔ آنسو بھری آواز میں کہا۔ ''خدا مجھے معاف کرے، میں اس کی نیکیاں بھول گئی تھی۔''

اچھّی خالہ نے کہا۔ ''یہ تو ماننا پڑتا ہے۔ وہ سب ہی کے کام آتا رہتا ہے۔ کئی بار میرے برے وقت میں پچیس پچاس روپے سے مدد کر چکا ہے۔ میرے بچوں کو اور محلے کے بچوں کو اسکول پہنچاتا ہے۔''

سلطانی بیگم نے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔ دل ہی دل میں کہا۔ ''تمہارے سو روپے میں اب گزارہ نہیں ہوتا، مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں کپڑے سلائی کرتی ہوں۔ بچوں کو پڑھاتی ہوں پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔''

وہ مہ پارہ کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ ''جوان بیٹی کا جہیز جوڑتے جوڑتے ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ایک روز محبوب علی نے پوچھا۔ ''آپ مجھے بیٹا سمجھتی ہیں یا نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''دل و جان سے سمجھتی ہوں۔ میرا کوئی بیٹا ہوتا تو تمہاری طرح محبت کرنے والا ہوتا۔''

تب محبوب نے میرے ہاتھ میں پچیس روپے رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کے بیٹے کی کمائی ہے۔ آئندہ ہر ماہ یہ رقم آپ کو ملتی رہے گی۔''

میں نے لینے سے انکار کیا۔ اس نے کہا۔ '' پھر تو آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتیں۔ بیٹے کی کمائی نہیں لیں گی تو میں یہاں نہیں آؤں گا۔''

اچھی خالہ نے پوچھا۔ ''سلطانی! کیا سوچ رہی ہو؟''

''آں....'' اس نے چونک کر ایک ایک کو دیکھا۔ میمونہ نے کہا۔ ''بہت دور پہنچی ہوئی تھیں؟''

سلطانی بیگم نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اتنی دور پہنچی ہوئی تھی کہ جہاں مجبور ہو کر اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے۔ یہ محبوب کا بڑا پن تھا کہ اس نے ماہانہ

پچیس روپے دینے والی بات آج تک کسی سے نہیں کہی تھی۔ اگر دیوار سے بھی کہہ دیتا تو بات کو پر لگ جاتے اور وہ گھر گھر عورتوں کے پیٹ میں گھس جاتی۔

وہ ایک ہاتھ سے دینے والا دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہونے دیتا تھا۔ گویا نیکی کرتا تھا اور دریا میں ڈال دیتا تھا۔ اتنی خوبیوں کے باوجود ایک ماں اپنی چاند جیسی بیٹی کو دریا میں نہیں پھینک سکتی تھی۔ وہ کھلتی ہوئی تروتازہ کلی تھی۔ اسے کاغذ کے ایک بے رنگ پھول کے ساتھ گلدان میں سجایا نہیں جا سکتا تھا۔

❁

منصور اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے جاگتی آنکھوں سے اس کی کلائی تھامی تھی۔ مگر وہ بند آنکھوں کے سپنے کی طرح پھسل گئی تھی... ویسے پھسلی نہیں تھی۔ اس کی بزدلی نے ہاتھ آنے والی کا ہاتھ چھڑا دیا تھا۔

وہ بائیس برس کا ہٹا کٹا جوان تھا اور بوڑھے باپ سے ڈرتا تھا۔ ڈرنے کی معقول وجہ تھی۔ باپ نے اپنی ساری دولت اور کاروبار اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ دو جوان بیٹے اس کے محتاج تھے۔ بڑی تابعداری سے اس کا کاروبار سنبھالتے تھے۔

ایک بار منصور نے ماں سے کہا تھا۔ ''پارو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

باپ نے سنا تو پاؤں سے ایک جوتی اتار کر کہا۔ ''اسے دیکھتے ہو' دس ماروں گا اور ایک گنوں گا۔ کاروبار میں منافع کمانا سکھاتا ہوں اور تم گھاٹے کا سودا کرنا چاہتے ہو؟ اس بیوہ سلطانی بیگم کے پاس ہے کیا؟ نقد پانچ دس روپے بھی نہیں ہوں گے۔ ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ اسے بیچا جائے تو پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ پھر اس میں بھی بنّے میاں کا حصہ ہے۔''

وہ مویشی پالتا تھا۔ منڈی میں بکریاں اور بکرے لے جا کر فروخت کرتا تھا۔ ایک جانور کے تیس چالیس یا پچاس روپے ملتے تھے۔ وہ پالے پوسے ہوئے جانوروں سے چاندی کماتا تھا۔ نام مقبول احمد تھا مگر مقبول بکرے والا کہلاتا تھا۔

اس نے بڑے بیٹے منظور کی شادی ایسی جگہ کی' جہاں سے بہو دس ہزار روپے کا جہیز اور سو بکرے لے کر آئی۔ اس علاقے میں کبھی کسی نے دیکھا تھا' نہ سنا تھا کہ کوئی

لڑکی کبھی دس ہزار کا جہیز لے کر آئی ہو۔ پھر یہ کہ ان سو بکروں کی مجموعی قیمت بھی چار پانچ ہزار لازمی تھی۔

باپ اپنے بیٹوں کو دولت بٹورنا سکھا رہا تھا۔ منصور کو یقین ہو گیا تھا کہ پارو دلہن بن کر کبھی اس کے گھر نہیں آسکے گی۔ وہ اس کے لئے تڑپتا تھا' راتیں جاگتا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ باپ سے بغاوت کرتا۔ اگر اس سے شادی کرنے کی ضد کرتا تو باپ اسے عاق کر دیتا۔ دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔

اور گھر سے دھتکارے جانے والے ننگے بھوکے کو سلطانی بیگم کبھی اپنا داماد نہ بناتی۔ باپ نے اسے بچپن سے مویشی کی دیکھ بھال میں لگا رکھا تھا۔ وہ کبھی اسکول نہیں گیا تھا۔ اس نے کسی طرح کا ہنر نہیں سیکھا تھا۔ گھر سے نکل کر کہیں چار پیسے کمانے کے قابل نہیں تھا۔ اس انسان کے بچے کو جانوروں کی دیکھ بھال کرنے سے ہی روٹیاں مل سکتی تھیں۔

وہ پچھلے کئی ماہ سے پارو کو ایک سچا عاشق ہونے کا یقین دلاتا رہا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اس کی طرف مائل ہوتی رہی تھی۔ مگر جب بھی کہیں ملتی تھی' اس سے فاصلہ رکھتی تھی۔ کہتی تھی۔ ''ماں باپ کو لے کر رشتہ مانگنے آؤ۔ نہیں تو جانتے ہو' میرے بہت طلبگار ہیں۔''

وہ کہتا تھا۔ ''مجھ پر بھی لڑکیاں مرتی ہیں۔ میں ایک اشارہ کروں تو وہ دوڑی چلی آئیں گی۔ لیکن میرا دل صرف تمہیں چاہتا ہے۔ میں جاگتی آنکھوں سے تمہارے خواب دیکھنے لگا ہوں۔''

''صرف خواب دیکھو گے تو تعبیر نہیں ملے گی۔ تم مرد ہو' مجھے ڈنکے کی چوٹ پر بیاہ کر لے جاسکتے ہو۔ میں لڑکی ہوں' اماں اور بنے ماموں کے سامنے تمہاری آرزو نہیں کر سکوں گی۔''

وہ قریب آ کر بھی دور رہتی تھی۔ ناک نقشہ ایسا تھا کہ دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ رنگ ایسا تھا' جیسے دودھ میں گلاب گھول دیا گیا ہو۔ اسے ایک ذرا چھو لینے کے لئے دل مچلتا تھا۔ وہ نگاہوں سے دور ہونے کے بعد بھی دکھائی دیتی تھی۔

اس نے کہا۔ ''تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں۔ میں چوڑیاں پہنانا چاہتا

ہوں۔''

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''اس بہانے مجھے چھو لینا چاہتے ہو؟''

وہ بہت محتاط رہنے والی لڑکی تھی۔ ہاتھ پکڑنا تو دور کی بات ہے، ایک انگلی سے چھونے کا بھی موقع نہیں دیتی تھی۔ مگر اس روز قسمت مہربان ہو گئی تھی۔ اس نے پھسلنے کے بعد اٹھنے کے لئے خود ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

اور اسے تھامنے کے بعد یوں لگا تھا' جیسے مکھن کی ٹکیا ہاتھ آگئی ہو۔ وہ ایسی چکنی' ایسی ملائم تھی کہ مرتے دم تک نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مگر اباجی کی ایک جھلک نے اسے چھڑا دیا تھا۔

باپ نے سختی سے تنبیہ کی تھی۔ ''میں نے کبھی تمہیں پارو کے ساتھ دیکھ بھی لیا تو سب کے سامنے جوتے مارتا ہوا گھر لاؤں گا۔ ایک بہت بڑے گھرانے میں تمہارا رشتہ کرنے والا ہوں۔ ان کا دہلی میں مویشیوں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ بہو جہیز کے علاوہ کم از کم دو سو بکرے ضرور لائے گی۔''

آہ....! باپ کی تنبیہ نے مکھن جیسی محبوبہ کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ تنہائی میں پچھتا رہا تھا اور سر پیٹ رہا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اسے دلہن نہیں بنا سکے گا۔ اپنے گھر نہیں لا سکے گا اور اس کی بزدلی کے پیش نظر اب وہ اسے منہ بھی نہیں لگائے گی۔

اس نے سوچا۔ ''اگر میں اسے سمجھاؤں گا' مناؤں گا اور وہ مان جائے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ وہ حیا والی ہے۔ دوبارہ اپنا ہاتھ پکڑنے نہیں دے گی اور میں پکڑنا چاہتا ہوں' جکڑ لینا چاہتا ہوں۔ اس کا حسن' اس کی کشش چیخ چیخ کر پوچھ رہی ہے کہ کلائی ایسی ہے تو وہ پوری کی پوری کیسی ہوگی؟

ہوس غالب آرہی تھی۔ ضد پیدا ہو رہی تھی۔ دماغ گرم ہو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''باپ کبھی اسے سیدھے راستے سے حاصل نہیں ہونے دے گا۔ اور وہ کلائی پکڑنے کے بعد پہونچے تک نہیں پہنچے گا تو دیوانہ پاگل ہو جائے گا۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ وہ اس کے اندر ہنستی رہے گی' کھلکھلاتی رہے گی اور ٹھینگا دکھاتی رہے گی۔''

وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچنے لگا۔ ''میں اس سے مل سکتا ہوں۔ بس ایک بار کسی طرح تنہائی میں ملاقات ہو جائے تو اسے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ سمجھانے منانے سے نہیں مانے گی تو کیا کروں گا؟''

وہ مویشیوں کے باڑے میں بیٹھا ہوا تھا۔ آگے نہ سوچ سکا۔ ابا جی آ رہے تھے۔ ان کے آنے کا انداز بتا رہا تھا کہ بہت خوش ہیں۔ بڑی ترنگ میں ہیں۔ انہوں نے دور ہی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! بہت بڑی خوشخبری ہے۔ وہ مان گئے ہیں۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ قریب آ کر بولا۔ ''وہ دو سو بکرے دیں گے۔ مگر جہیز دس کا نہیں آٹھ ہزار کا ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ ہم بکروں کے ذریعے چار ہزار سے زیادہ کمائیں گے۔ اس طرح جہیز ہمیں بارہ ہزار سے اوپر کا پڑے گا۔''

وہ ابھی ایک حسنِ لاجواب پر جھپٹنے والا تھا۔ ایسے وقت ابا جی آ کر اسے بکروں سے منافع حاصل کرنے کا حساب سمجھا رہے تھے اور یہ تو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا کہ کوئی دلہن دو سو بکروں کے ساتھ ہی اس گھر میں آئے گی۔ پارو قیامت تک اس کے ہاتھ نہیں آئے گی۔

وہ باپ کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ایک طرف غمِ جاناں تھا۔ پارو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی۔ دوسری طرف غمِ دوراں تھا۔ دال روٹی' کھانا کپڑا' وراثت جائیداد کا حصول تھا۔ اور یہ جو ضروریات زندگی ہیں' یہ تو آخری سانسوں تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ رنگ' خوشبو شاعری اور محبت تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ زندگی میں آئیں تو اچھا ہے۔ جائیں تو زیادہ دکھ نہیں ہوتا۔

دل اور پیٹ ایک دوسرے سے قریب رہتے ہیں۔ دل محبت کے لئے مچلتا ہے اور پیٹ روٹی مانگتا ہے۔ پیٹ کا مطالبہ مرتے دم تک اہم رہتا ہے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی دوسرے پیٹ والوں کو چالیسویں کی روٹیاں کھلاتا ہے۔

دل کے مطالبے میں حسن' احساسات اور حسین خیالات ہوتے ہیں اور یہ سب محض جذباتی ہوتے ہیں۔ ان کی تسلی کے لئے پارٹ ٹائم محبت کی جاسکتی ہے۔
عارضی محبت یا بہلاوے کو ہوس کہتے ہیں۔ یہ ہوس سیدھے راستے سے پوری نہ

ہو تو چکلے تک کا راستہ بنا دیا گیا ہے۔ اگر وہاں جانے سے نیک نامی پر دھبہ لگتا ہے تو پھر کسی سے زبردستی کی جاسکتی ہے۔ ضد پوری کرنے یا ہوس پوری کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیا جاتا ہے۔

سر پر ایک چپت پڑی تو وہ چونک گیا۔ باپ نے گالیاں دیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بیٹھے بیٹھے مر گئے ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟''

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''وہ...... وہ میں دو سو بکروں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اگر انہوں نے دو سو کی بھیڑ میں کچھ بیمار بکرے دیئے تو وہ بیماریاں ہماری مویشیوں کو لگ جائیں گی۔ آپ بہو کو دیکھ بھال کر لائیں۔ میں بکرے چھانٹ کر لاؤں گا۔''

وہ ہنستے ہوئے پھر اس کے سر پر ایک چپت مارتے ہوئے بولا۔ ''بہو کو کیا دیکھنا ہے؟ جیسی بھی ہو' یہاں آ کر بچے پیدا کرے گی۔ ہماری نسل بڑھائے گی۔ ہاں۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ میکے سے کوئی بیماری نہ لائے۔ عورت اور مویشی کو بہت ٹٹول کر باڑے میں لانا پڑتا ہے۔''

اس نے بیٹے کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھدار ہوتے جا رہے ہو۔ شاباش! آج رات باڑے میں سونا۔ میں تمہاری ماں کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے کہوں گا۔ وہ آنے والی کو ابھی سے ٹٹولتی رہے گی۔''

وہ چلا گیا۔ منصور چاروں طرف گھوم گھوم کر مویشیوں کو دیکھنے لگا۔ بکری بکرے اپنی اپنی بولی بول رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ ان سے زیادہ پارو کی طلب چیخ رہی تھی۔

وہ دور ایک طرف دیکھنے لگا۔ ادھر مہ پارہ کا چھوٹا سا مکان تھا۔ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیچ میں کئی مکانات تھے۔ جس گھر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ بستی کے آخری سرے پر تھا۔ دل مچل رہا تھا' کہہ رہا تھا کہ ابا جی سو جائیں گے تو ادھر ضرور جائے گا۔

مگر جانے سے کیا ملے گا؟ دستک دے گا تو وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ اس سے بری طرح ناراض ہوگی۔ پھر یہ کہ اس کی ماں اور اس کا بنے ماموں سانپ کی طرح

حسن وشباب کے خزانے پر پہرہ دے رہے ہوں گے۔

بنّے میاں کے متعلق سوچتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''منصور! کیا کررہے ہو؟''

وہ مویشیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور کیا کروں گا؟ رات ہوتے ہی ان کی چوکیداری کرنی پڑتی ہے۔''

''تمہارے باڑے سے کبھی کوئی جانور چوری نہیں ہوا۔ بس نام کی چوکیداری ہے۔ میں فلم دیکھنے جارہا ہوں۔ رادھا ٹاکیز میں اشوک کمار کی 'قسمت' لگی ہے۔ دوبار دیکھ چکا ہوں۔ بڑے مزے کی فلم ہے۔ تم بھی چلو۔''

وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''نہ بابا! اباجی نیند سے اٹھ کر ادھر آئے اور مجھے نہ پایا تو صبح الٹی چھری سے ذبح کردیں گے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''جب سے منظور بھائی کی شادی ہوئی ہے' تب سے تم یہاں چوکیداری کرنے لگے ہو۔ جب تمہاری شادی ہوجائے گی تو تم بھی اپنی بیوی کے ساتھ راتیں گزاروگے۔ پھر یہاں کون چوکیداری کرے گا؟''

''اباجی کریں گے۔ یہ مویشی تو ان کی جان ہیں۔ روز صبح اٹھ کر انہیں گنتے رہتے ہیں۔''

''تمہارے اباجی بھی خوب ہیں۔ مجھے تو سارے جانور ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وہ تو جیسے ایک ایک جانور کا چہرہ الگ الگ پہچانتے ہیں۔''

منصور نے کہا۔ ابا بکرا شناس ہیں۔ اسی لئے مقبول بکرے والا کے نام سے مشہور ہوگئے ہیں۔''

بنّے میاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں۔ یہاں سے سائیکل کرائے پر لے جاؤں گا۔ نو بجے تک سینما گھر پہنچ جاؤں گا۔''

وہ اس سے مصافحہ کرکے جانے لگا۔ منصور اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ''آخری شو دیکھنے جارہا ہے۔ آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ یعنی آدھا راستہ صاف ہے۔ اب گھر میں ایک ہی رکاوٹ ہوگی۔ اور وہ ہے' پارو کی ماں.... اگر وہ گہری نیند سوجائے' بیہوش ہوجائے یا مرجائے تو پھر آج رات پارو کہیں

نہیں گئی۔ میری آغوش میں بھری رہے گی۔''

وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ دل ادھر کھنچا جارہا تھا۔ ہوس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی' وہ آسانی سے نہیں ملے گی۔ اگر اس کی ماں کو رسیوں سے باندھ کر بھی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے تو آج رات یہ کرگزرنا چاہئے۔

اس نے محبوب علی کے بارے میں سوچا۔ ''وہ لنگور جیسا ہے۔ پتہ نہیں کیسے ان سے دوستی کرلی ہے؟ ان کے گھر جاتا ہے۔ وہاں کھاتا پیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' جیسے ان کا رشتہ دار بن گیا ہو۔ وہ ضرور پارو کے لئے جاتا ہوگا۔''

وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا رقیب اگرچہ صورت شکل سے گیا گزرا تھا۔ مگر دھن دولت والا تھا۔ ماں بیٹی اور بنّے میاں کو خرید سکتا تھا۔ یہ دھڑکا بھی تھا کہ وہ خرید لے گا اسے اپنی حویلی میں لے جائے گا تو پھر وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گی۔

یہ خیال دماغ میں جڑ پکڑ رہا تھا کہ ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ اسے پھر کبھی پا نہیں سکے گا..... بس آج ہی کی رات ہے۔

❀ ✪ ❀

رات کالی تھی۔ اُمڈ اُمڈ کر آنے والی گھٹائیں رات کے منہ پر اور کالک پھیلا رہی تھیں۔ وہ اتنا کالا تو نہیں تھا۔ گہرا سانولا رنگ تھا۔ رات کے وقت کچھ اور گہرا ہوجاتا تھا۔ لوگ پیٹھ پیچھے اسے کالا کوّا کہتے تھے۔

کیوں کہتے تھے؟ کسی کا مذاق اڑانا کیوں اچھا لگتا ہے؟ کسی کی صورت کو یا شخصیت کو بگاڑ کر عجیب طرح کی مسرتیں کیوں حاصل ہوتی ہیں؟

کہتے ہیں' تہذیب کی ابتدا سے پہلے انسان ہنسنا نہیں جانتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے کسی بات پر کسی شخص کے منہ پر کالک مل دی۔ اس کالک زدہ چہرے کو دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے۔

تب سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ کسی کو بدصورت بناؤ' کسی پر کیچڑ اچھالو' کسی کے کپڑے اتاردو یا پھر کسی کو اس کے مقام سے گرادو تو خوب ہنسی آتی ہے۔

آج تک جتنے چٹکلے اور لطیفے گھڑے گئے ہیں۔ انہیں پڑھ کر یا سن کر پتہ چلتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے عیب اُچھالتا ہے۔ اس کی توہین کرتا ہے۔

اسے انسان کے بجائے کوا کہتا ہے تو دوسروں کو ہنسی آتی ہے۔

دارو کی وسیع وعریض بھٹی کے اندر اور باہر اچھے خاصے پینے والے آیا کرتے تھے۔ شام ہوتے ہی لکڑیوں کی لانبی بینچ اور چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں۔ مستی میں آنے والے ہری بھری گھاس پر بھی بیٹھ جاتے تھے اور وہیں لوٹ پوٹ ہوتے رہتے تھے۔

محبوب علی جب کبھی دل برداشتہ ہوتا تھا۔ اُدھر چلا آتا تھا۔ اس کا شمار وہاں کے بڑے لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے آتے ہی ایک میز اور کرسیاں لاکر رکھ دی جاتی تھیں۔ کیا مسلمان؟ کیا ہندو؟ کیا امیر؟ کیا غریب؟ سب ہی اسے سلام کرتے تھے۔

وہ دنیاوی دوغلے دستور کو خوب سمجھتا تھا۔ منہ کے سامنے سلام کرو' کلام کرو اور پیٹھ پیچھے بدنام کرو۔ وہ ایسی باتیں سمجھتے ہوئے بھی بڑے صبر وتحمل سے دوغلوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ ایک خاموش تماشائی بن کر چپ رہتا تھا۔ اپنے اوپر ہنسنے والوں کے برے وقت میں کام آتا تھا۔ یوں کتنے ہی لوگ شرمندہ ہو کر اس کے گن گاتے تھے۔ جو بے حس ہوتے تھے' وہ اسے احمق سمجھتے تھے۔

اعمال اتنے بھی اچھے نہ ہوں کہ پتھر کھا کر پھول پیش کرو اور احمق سمجھے جاؤ۔ اس روز تو جیسے آخری پتھر لگا تھا۔ بقول شاعر بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے.....

وہ اپنی پارو کے گھر سے نکالا گیا تھا۔

دل ہی دل میں اسے اپنی پارو کہتے ہی ایسا لگتا تھا' جیسے وہ ایکدم سے اپنی ہوگئی ہو۔ وہ بوتل کھول کر گلاس بھرنے لگا۔ پیئے گا' نشہ ہوگا تو وہ کسی شک وشبے کے بغیر اپنی ہو جائے گی۔ پھر صبح تک کوئی اسے چھین نہیں پائے گا۔

وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک گھونٹ پینے کا عادی تھا۔ مگر زخم کاری لگا تھا۔ ایسے وقت دارو صرف پینے کی چیز نہیں ہوتی۔ دوا بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے دوا دارو کہا جاتا ہے۔ یہ دوا زود اثر ہوتی ہے اور غم غلط ہونے لگتا ہے.... اس نے غٹاغٹ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

پھر خالی گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ ''دھت تیری زندگانی کی ایسی کی تیسی.... ایک وہ نہیں ہے تو قبرستان کی سی ویرانی ہے۔ پہلے تو امید تھی کہ بات بنے گی۔ آج نہیں تو کل رشتے کی بات چلے گی۔''

وہ دوسرا گلاس بھرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''سالی بات کیا بنے گی؟ انہوں نے تو ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔''

اس نے بھرا ہوا گلاس آنکھوں کے سامنے لاکر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مکھی دودھ میں ہوتی ہے' شراب میں نہیں ہوتی۔ دودھ اُجلا ہوتا ہے۔ وہ لوگ اُجلے ہیں اور ہم مکھی کے جیسے میلے ہیں۔ قصور ہمارا ہی ہے۔ ہم دودھ ملائی میں جا گرے۔''

وہ بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ رہا تھا اور ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ اس میں بڑی مستقل مزاجی اور خود اعتمادی تھی۔ زمین جائیداد کے معاملات میں خود فیصلے کرتا تھا۔ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ مگر اس وقت دھڑکتے ہوئے دل کی سن رہا تھا اور دھڑکنوں کی ایک ہی ضد تھی۔ ''پارو چاہئے۔''

چاہنے کے لئے اور گھر بسانے کے لئے بیشمار حسین لڑکیاں مل سکتی تھیں۔ اس کی صورت پر نہیں' دولت کی مٹھاس پر ہزاروں مکھیاں آکر بیٹھ سکتی تھیں۔ کئی معزز گھرانوں سے رشتے کی بات بھی چلی تھی۔ مگر وہ شادی خانہ آبادی کی بات ٹالتا آرہا تھا۔ دل تھا کہ ایک ہی چوکھٹ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس مغرور لڑکی کے لئے مچل رہا تھا۔

پتہ نہیں اس میں کیا بات تھی؟ کبھی سامنا ہوتا تو بے اختیار اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ سامنے نہ ہوتی تو خیالوں میں آکر اور زیادہ مقناطیس بن جاتی تھی۔

وہ اکثر بڑی سنجیدگی سے سوچتا تھا۔ سمجھنا چاہتا تھا کہ جیسی دوسری تمام حسین لڑکیاں ہوتی ہیں' ویسی ہی پارو بھی ہے۔ پھر دل اسی کا دیوانہ کیوں ہے؟

اور وہ تھی کہ اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اتفاقاً نظر ملتی تو فوراً ہی منہ پھیر لیتی تھی۔ پھر بھی جانے کیوں اچھی لگتی تھی؟ آخر کیا تھی وہ....؟

دماغ کا فتور تھی' عشق کا جنون تھی' یا ایک مرد کی ضد تھی کہ اسی کو حاصل کرنا ہے اور ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔

مگر اس کی قیمت کیا تھی؟

وہ ماں بیٹی کا دل جیتنے کی انتہا کر چکا تھا۔ مالی امداد دینے کی آڑ میں یہ اشارہ دے چکا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ پارو کے نام کر سکتا ہے۔

اس سے بڑی قیمت اور کیا ہو سکتی تھی؟ وہ بڑی محبت سے' بڑی اپنائیت سے ان کے دکھ سکھ میں کام آتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود اسے گھر سے نکال دیا گیا۔

وہ گلاس کو منہ لگا کر ایک ہی سانس میں پینے لگا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں رہ رہ کر چمک رہی تھیں۔ آسمان سے سیدھی اس کے دل میں اتر رہی تھیں۔ اس نے خالی گلاس کو میز پر پٹخ دیا۔ ''دھت تیری زندگانی کی ایسی کی تیسی.... آج سے ساری محبت اور مروّت ساری' شرافت کی ایسی کی تیسی....''

اس نے بھٹی کی طرف منہ کرتے ہوئے آواز دی۔ ''ارے او دھنیا...! بوتل لا....''

بھٹی کا مالک دھن راج دوڑتا ہوا آیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''حجور! آپ ایک اَدھے سے زیادہ نہیں پیتے ہیں۔ بس کریں۔''

وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ ''کیوں بس کریں؟ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ محبوب علی مر جائے گا' بس کرو اور نظروں سے نہ گراؤ۔''

وہ بوتل کی بچی ہوئی داڑو گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ بوتل لاؤ۔ آج اتنا زہر پلاؤ کہ یہ دنیا ہمیشہ کے لئے مر جائے۔ جاؤ ایک نہیں' دو لاؤ۔''

وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ اچانک بارش ہونے لگی۔ جو باہر بیٹھے ہوئے پی رہے تھے' وہ اندر جانے لگے۔ وہ اپنی میز سے لگا بیٹھا رہا۔ سر اٹھا کر پوری طرح منہ کھول کر بارش کا پانی پینے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہیں یہ لوگ؟ ہماری امداد' ہمارے احسانات کے بدلے ایک چٹکی بھر محبت نہیں دیتے... کیوں نہیں دیتے؟''

یہ دنیا تو دو اور لو کے اصولوں پر قائم ہے۔

جب تک دو گے نہیں' کسی سے کچھ پاؤ گے نہیں۔

دنیا کے تمام انسانی رشتے ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ تب دیتے ہیں' جب کچھ نہ

کچھ لیتے ہیں۔

ماں باپ بھی اولاد کو پالتے پوستے ہیں' تا کہ فصل ہری بھری ہو کر بڑھاپے میں کام آئے۔ اولاد بھی جوانی میں لیتی ہے اور انہیں بڑھاپے میں دیتی ہے۔

لو اور دو۔

خدا سے بھی کچھ لینے کی شرط یہی ہے کہ اپنے سجدے دو۔ پھر کچھ لو۔

اس نے چند گھونٹ پینے کے بعد گلاس میز پر پٹخ دیا۔ ''دھت تیری لو اور دو کی ایسی کی تیسی... ہمارے معاملے میں یہ اصول کیوں بدل گئے ہیں؟ ہم نے اب تک وہاں بہت کچھ دیا ہے۔ مگر کچھ نہیں لیا۔ ہمیں محبت کا ایک تنکا بھی نہ ملا۔''

بارش کبھی تیز ہو رہی تھی' کبھی دھیمی ہو رہی تھی۔ دھن راج نے بوتل لا کر رکھتے ہوئے کہا۔ ''حجور! ساون کی پہلی جھڑی ہے۔ زیادہ نہ بھیگیں۔ اندر چلیں۔''

وہ اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ یہاں سے.... اپنا کام کرو۔''

وہ چلا گیا۔ بھٹی کے اندر کہیں کہیں لالٹین روشن تھیں۔ برآمدے میں چھجے کے نیچے مشعلوں کی روشنی دور تک پھیل رہی تھی۔ وہ باہر نیم تاریکی میں بھیگ رہا تھا۔ دھیمی دھیمی روشنی میں جھلک رہا تھا۔ دنیا والوں سے دوری کہہ رہی تھی کہ وہ تنہا رہنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔

اس نے نئی بوتل سے گلاس بھرتے ہوئے سامنے دیکھا تو وہ دھندلی دھندلی سی دکھائی دی۔ اسے یقین نہیں ہوا۔ بارش کے تیز رفتار پانی میں آنکھیں پوری طرح نہیں کھل رہی تھیں۔ وہ پوری طرح واضح نہیں تھیں۔

وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر دیکھنے لگا۔ اس نے اتنی پی لی تھی کہ داڑو' بوتل سے نکل کر پارو کی صورت میں مجسم ہو گئی تھی۔ ویسے وہ نشے میں نہیں رہتا تھا' تب بھی وہ اسے ستانے کے لئے آ جاتی تھی۔

ہائے کیسی بھرپور تھی؟ اس نے اسے سکھیوں کے ساتھ ناچتے گاتے دیکھا تھا۔ کیا ناچتی تھی اور کیسے بل کھاتی تھی؟ بدن میں ایسا لوچ تھا' ایسی لچک تھی کہ اس کی آرزو میں ارادے جھٹکے کھانے لگتے تھے۔

اس وقت بھی وہ ہولے ہولے ٹھمک رہی تھی۔ کبھی ادھر کبھی ادھر گھوم گھوم کر بدن کے زاویے پیش کر رہی تھی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی کانچ کی طرح آر پار دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''بس کرو۔ بس....ہمارے صبر کا امتحان ختم ہو چکا ہے۔ اب ہم سے رہا نہ جائے گا۔ ہم محبت سے تمہیں مانگ چکے۔ اب ہوس تمہیں مانگ رہی ہے۔

ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ مانگنے سے نہیں ملوگی۔ کوئی ہمیں تمہاری چوکھٹ پر قدم رکھنے نہیں دے گا۔ تم ہماری پہنچ سے بہت دور ہو رہی ہو اور ہم ہونے نہیں دیں گے۔''

بجلی زوردار آواز میں کڑکتی ہوئی ادھر سے اُدھر چلی گئی۔ وہ بادل کی طرح گرجتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم نے ہمارے اندر کے مرد کو ضدی بنا دیا ہے۔ تمہاری بے رخی کہتی ہے، تمہیں ایسے دبوچ لیں کہ پھڑ پھڑانے بھی نہ دیں۔

بس بہت ہو چکا۔ ہم نہیں چھوڑیں گے۔ تمہاری جن آنکھوں میں 'اونہہ' ہے۔ ان میں ہاں ہاں بھر دیں گے۔ تم ہمارا نام نہیں لینا چاہتیں۔ ہم تمہارے لبوں پر مردانگی کا سکہ جما دیں گے۔ پھر تم ہمارے ہی گن گاتی رہوگی۔''

وہ بول رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔ گلاس کے افق سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تجھے پانا ہے۔ ابھی پانا ہے اور ابھی نہیں تو کبھی نہیں... ہم بہت بے آبرو ہو کر نکلے ہیں۔ زخم تازہ ہے، گہرا ہے۔ ابھی مرہم چاہئے۔ آ... ہمارے پاس آ....نہیں تو ہم آ رہے ہیں۔''

وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''ہم تجھے جانے نہیں دیں گے۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔ میز اس سے ٹکرا کر ایک طرف جا پڑی۔ وہ آگے کی طرف ڈگمگاتا ہوا اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''کہاں گئی...؟''

دھن راج اور کچھ لوگ اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ''اے...! کوئی ادھر نہ آئے۔ یہ ہماری ہے۔ یہ بھاگ رہی ہے۔ بھاگنے دو۔ ہم

اسے نہیں چھوڑیں گے۔''

وہ ڈگمگاتا ہوا ایک سمت جاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ''محبت کی ایسی کی تیسی....دو اور لو کی ایسی کی تیسی... ہماری دنیا میں بس جوانی ہے۔ نادانی ہے۔ ہوس ہے اور آج جوانی کا '' فری پاس'' تیرے ہی پاس ملے گا۔''

بادل گرج رہے تھے، بارش اور زور پکڑ رہی تھی۔ وہ لالٹین اور مشعلوں کی روشنی سے دور بڑبڑاتا ہوا تاریکی میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

سلطانی بیگم فرش پر بیٹھی مشین چلا رہی تھی۔ایک شلوار سی رہی تھی۔مہ پارہ سامنے بیٹھی کُرتے کا گلا بنا رہی تھی۔ایسے وقت لالٹین کی روشنی دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔اس نے لو بڑھاتے ہوئے کہا۔''تیل ختم ہو گیا ہے۔ ماموں سے لانے کو کہا تھا' وہ فلم دیکھنے چلے گئے۔''

سلطانی نے کہا۔''ابھی یہ بجھے گی اور سلائی دھری کی دھری رہ جائے گی۔''

اس نے ہاتھ روک دیا۔مشین رک گئی۔آنکھوں میں پانی آ رہا تھا۔وہ دوپٹے سے پانی خشک کرتے ہوئے بولی۔''لالٹین کی روشنی میں آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔اب یہ باقی کام کل ہی کروں گی۔''

''آپ بستر پر جائیں۔میں اسے بجھاتی ہوں۔تیل جتنا بھی ہے' اسے بچا کر رکھنا ہوگا۔نہیں تو ماموں اندھیرے میں ٹھوکریں کھائیں گے۔''

سلطانی وہاں سے اٹھ گئی۔ایک ہاتھ سے کمر پکڑ کر کراہتی ہوئی بستر پر جا کر لیٹ گئی۔مہ پارہ نے تمام سامان سمیٹ کر ایک طرف کیا۔پھر لالٹین بجھا کر اپنی چارپائی پر آ گئی۔

مکان کے اندر گہری تاریکی چھا گئی تھی۔باہر بارش کا شور تھا۔اندر خاموشی تھی۔تاریکی ہو' تنہائی ہو اور برکھا رُت کی گنگناتی رات ہو تو جوانی نہیں سوتی۔کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔وہ کروٹیں بدلنے لگی۔

اسے فطرتاً چاہے جانے کی خواہش تھی۔دن رات آئینہ دیکھتی تھی اور اپنے حسن پر ناز کرتی تھی۔یہ فخر تھا کہ جو اسے دیکھتا ہے' چلتے چلتے رک جاتا ہے۔جانے والے

پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔

جب وہ پڑھنے کے لئے شہر گئی تھی تو قدردانوں اور دیوانوں کا حلقہ اور وسیع ہو گیا تھا۔آس پاس کے گاؤں کھیڑوں میں بھی اس کے حسن و دلکشی کا خوب چرچہ تھا۔پھر وہ مغرور کیوں نہ ہوتی؟ جہاں جاتی تھی' نگاہوں سے تولی جاتی تھی۔جذبوں اور آہوں سے پکاری جاتی تھی۔ایسے میں محبوب علی اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اور کیوں نہ ہوتا؟ آخر وہ بھی انسان تھا۔خوبرو نہیں تھا۔مگر صنف نازک کی خوبصورتی اسے بھی اپنی طرف کھینچ سکتی تھی اور کھینچ رہی تھی۔مہ پارہ اس پر ظلم کر رہی تھی۔اس سے کبھی کچھ بولنا تو کیا' اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔منہ پھیر کر کسی بات کا جواب دے کر چلی جاتی تھی۔

وہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔آج اسے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔وہ ایسی آسودگی محسوس کر رہی تھی' جیسے کسی موذی مرض سے نجات مل گئی ہو۔اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کروٹ بدلی پھر ذرا چونک گئی۔باہر آنگن کی طرف ہلکی سی دھب کی آواز سنائی دی تھی۔

بارش دھیمی پڑ گئی تھی۔وہ توجہ سے کان لگا کر سننے لگی۔باہر ٹپا ٹپ' بوندیں پڑنے کی آوازیں تھیں اور کچھ نہیں تھا۔اس کا وہم تھا۔اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔

بادل گرجتے ہوئے کہہ رہے تھے۔''آواز کیسے نہیں ہے؟ ہم ہیں۔''

بجلی کڑکتی ہوئی کہہ رہی تھی۔''میں کسی وقت بھی کسی پر بھی گر سکتی ہوں۔''

بادل گرجتے ہوئے کہہ رہے تھے۔''ہم آ گئے ہیں۔''

بُرا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔باہر سے ناگہانی شامت نے پکارا۔''میاؤں.... میاؤں.....''

بادل پھر گرجنے لگے۔سلطانی بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔''یہ موئی بلی کہاں سے آ گئی؟ پارو! کیا سو گئیں؟''

''نہیں امی....!''

باہر ٹپا ٹپ کے شور میں پھر وہی آواز سنائی دی۔''میاؤں....میاؤں....''

سلطانی بیگم چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولی۔''لالٹین جلا۔یہ کم بخت رسوئی میں

گھسے گی تو سارے پکوان کا ستیاناس کر دے گی۔"

اس نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے سرہانے رکھی ہوئی ماچس اٹھائی پھر لالٹین کو روشن کیا۔تیل ختم ہو چکا تھا یا ختم ہونے والا تھا۔ بہت ہی دھیمی سی روشنی تھی۔

سلطانی بیگم نے لالٹین اٹھاتے ہوئے اس کی لو بڑھائی پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائی۔"رسوئی کی کھڑکی ٹوٹی ہوئی ہے۔یہ کم بخت اُدھر نہ چلی جائے...اری ہش....تجھے ہمارا ہی گھر ملا ہے۔بھاگ یہاں سے۔"

وہ دروازہ کھول کر برآمدے میں آئی۔ایکدم سے دارو کا بھپکا محسوس ہوا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیکھتی یا سمجھتی۔اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔کسی سخت چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔وہ تکلیف کی شدت سے چیخ بھی نہ سکی۔کراہتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔لالٹین ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گئی۔پھر دو چار بار بھڑک بھڑک کر بجھ گئی۔گھر کے اندر اور باہر گہری تاریکی چھا گئی۔

پارو نے آواز دی۔"اماں...!لالٹین بجھ ہی گئی۔آپ کہاں ہیں؟"

بادل گرجنے لگے۔بجلی کی چمک نے چند ساعتوں کے لئے برآمدے اور آنگن کو روشن کیا۔اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔اس نے لمحاتی روشنی میں ماں کو مردہ حالت میں دیکھا۔وہ برآمدے کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔روشنی کے بعد تاریکی اور گہری ہو جاتی ہے۔اب اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ رو پڑی۔فرش پر گھٹنوں کے بل ہو کر راستہ ٹٹولتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔ پھر اسے جھنجھوڑتے ہوئے آواز دی۔"اماں...!آپ یہاں کیسے گر پڑیں؟ بولتیں کیوں نہیں...؟"

اچانک ہی اس کا منہ بند ہو گیا۔کسی نے اسے دبوچ لیا تھا۔ایک ہاتھ منہ پر اتنی سختی سے جما ہوا تھا کہ وہ صرف "اُوں آں" کر رہی تھی۔خود کو اس کی گرفت سے چھڑا نہیں پا رہی تھی۔

پھر وہ ایکدم سے ساکت ہو گئی۔اسے اپنے سینے پر چبھن سی محسوس ہوئی۔چاقو کی نوک چبھ رہی تھی۔پھر اس چاقو کا پھل اس کے حلق پر آیا۔وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اسے اپنی زندگی سے 'اپنے خوبصورت وجود سے بہت پیار تھا۔وہ مرنا نہیں چاہتی

تھی۔

اس نے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔حلق پر رکھا ہوا چاقو کہہ رہا تھا کہ منہ سے آواز نکلتے ہی وہ بھی ماں کی طرح مردہ ہو جائے گی۔

وہ اس پر جھک گیا تھا۔اپنا چہرہ اس کے چہرے پر رکھ کر ادھر سے ادھر ہو رہا تھا۔کبھی چہرے سے چہرہ سہلا رہا تھا۔کبھی اسے چوم رہا تھا۔دارُو کی بُو ناقابلِ برداشت تھی۔مگر وہ برداشت کر رہی تھی۔

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔"میں پہچان رہی ہوں۔تم کون ہو؟"

اس نے آگے بولنے نہیں دیا۔اس کے لبوں پر چھا گیا۔اس کا تو جیسے دم رکنے لگا۔سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔منہ بند ہو گیا تھا اور ناک کے پاس دارُو مہک رہی تھی۔

جو نہ چاہو'وہ جبراً ہوتا رہے تو اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔وہ اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کرتی تھی۔اگر وہ سیدھے راستے سے بارات لے کر آتا۔نکاح قبول کراتا اور سر پر کلام پاک رکھ کر اسے لے جانا چاہتا تو وہ اسے قبول نہ کرتی۔کبھی اس کے ساتھ نہ جاتی۔

اسے تو دیکھتے ہی ناگواری سی محسوس ہوتی تھی۔سوچتی تھی۔"کیسا میلا میلا سا لگتا ہے۔چھوئے گا تو میلی ہو جاؤں گی۔توبہ ہے' میں تو کبھی اس کا سایہ بھی اپنے اوپر نہیں پڑنے دوں گی۔"

مگر اب اس میل خورے کا پورا وجود اس پر آ پڑا تھا۔وہ خنجر کی نوک پر قابل قبول ہو گیا تھا۔

خوبصورتی اور بدصورتی کا فرق مٹ چکا تھا۔دنیا کے تمام حسین چہرے تاریکی میں مٹ جاتے ہیں۔کسی کا حسن و جمال نہیں رہتا۔صرف وجود رہتا ہے۔کوئی میل خورا بھی دکھائی نہیں دیتا۔صرف دو ہاتھ اور دو پاؤں والے انسان رہ جاتے ہیں۔

باہر بارش شور مچا رہی تھی۔اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا اور وہ آنے والا بھی جا چکا تھا۔وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ایسے ہی وقت ماں کی کراہیں سنائی دیں۔

اس نے ایکدم سے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ پھر فرش پر گھسٹتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔ اس سے لپٹ کر بولی۔ ''اماں! اماں....! آپ زندہ ہیں؟ آپ بیہوش ہوگئی تھیں؟''

پھر وہ بڑے کرب سے روتے ہوئے بولی۔ ''اماں! آپ ایک مردہ بیٹی کو دیکھنے کے لئے زندہ ہیں۔ یہ بیٹی مر چکی ہے۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سلطانی بیگم اندھیرے میں اسے ٹٹول کر' چھو کر تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ''لالٹین جلاؤ۔''

''تیل نہیں ہے۔ کیسے جلاؤں....؟ اماں! میری عجیب حالت ہے۔ میں اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہوں۔ چپ رہنا چاہتی ہوں۔ اچھا ہے کہ اندھیرا ہے۔ میں آپ کو منہ نہیں دکھا سکوں گی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے الفاظ اور اس کے آنسوؤں نے ماں کو چونکا دیا۔ وہ بڑی حد تک سمجھ گئی کہ بیٹی کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا۔

''کون آیا تھا؟ جو بھی آیا تھا' خدا اسے غارت کرے۔ پتہ نہیں کس چیز سے مجھے مارا ہے؟ پیشانی پر گومڑ نکل آیا ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر پیشانی پر لائی۔ اندھیرے میں چھونے سے معلوم ہوا واقعی گومڑ نکل آیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''ہائے میری بچی! کون تھا وہ؟ کیا تُو نے اسے دیکھا ہے؟ اسے پہچانا ہے؟''

''کیسی باتیں کرتی ہیں؟ یہاں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کس کو دیکھتی؟ کس کو پہچانتی؟ اور پہچان کر بھی اس کا کیا بگاڑ لیتی؟ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ شور مچاتی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔''

وہ چپ ہوگئی۔ ماں بھی چپ تھی۔ چاقو کی نوک پر بیٹی کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہوگی' اسے تصور میں دیکھ رہی تھی۔ یہ سوچ کر کلیجہ کٹ رہا تھا کہ پھول جیسی بیٹی کا کنوارا پن لٹ چکا ہے۔

ان لمحات میں جی کر رہا تھا کہ چھاتی پیٹ پیٹ کر رونا شروع کردے۔ مگر رات کے سناٹے میں واویلا کرنے سے بات گھر گھر پہنچتی۔ عقل سمجھا رہی تھی' صبر و تحمل

سے کام لیا جائے۔ مہ پارہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ رونے کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ سینے سے دبی دبی آہیں اور کراہیں نکل رہی تھیں۔

سلطانی بیگم آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بیٹی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اپنی تکلیف بھول کر آبرو کی میت پر آنسو بہانے لگی۔

وہ ماں کی چھاتی سے لگی ہوئی تھی۔ سسکتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس کے بڑے گن گاتی تھیں۔ قصیدے پڑھتی تھیں۔ بیٹا بیٹا کہہ کر سر پر چڑھاتی تھیں۔ وہ کتا ہے...کمینہ ہے.....''

سلطانی نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا محبوب علی کی بات کر رہی ہو؟''

مہ پارہ کے حلق سے چیختی ہوئی کراہ نکلی۔ ''اور نہیں تو کیا....ہمارے گھر میں آنے والا اور کوئی دارو نہیں پیتا۔ وہی پیتا ہے۔''

سلطانی بیگم تاریک خلا میں تکنے لگی۔ اسے یاد آیا' جب اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔ تب اس نے اپنے قریب دارو کی بو محسوس کی تھی۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے سوچنے لگی۔ ''کیا محبوب علی اتنا گر سکتا ہے...؟

''ہاں۔ آج ہم نے دارو پینے پر اسے باتیں سنائی تھیں۔ بنے میاں نے اسے گھر میں آنے سے منع کیا تھا۔ وہ ہمارے برے وقت پر کام آنے والا' ہم پر احسان کرتے رہنے والا اچانک ہی مہربان سے نا مہربان بن گیا ہے۔ اس نے جتنے احسانات کئے تھے' ان سب کا سود سمیت معاوضہ وصول کر کے گیا ہے۔''

باہر سے بنے میاں کی آواز سنائی دی۔ ''یہ دروازہ کھلا کیوں ہے؟''

دروازے پر ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ سلطانی بیگم سمجھ گئی کہ آنے والا پہلے احاطے کی دیوار پھاند کر آیا ہوگا۔ پھر جاتے وقت بڑے آرام سے دروازہ کھول کر چلا گیا ہوگا۔ بنے ٹارچ کی روشنی میں اندر آیا۔ باہر برآمدے میں بہن اور بھانجی بیٹھی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ سر جھکا کر پتھروں پر چلتا ہوا ان کی طرف آنے لگا۔

مہ پارہ فوراً ہی اٹھ گئی۔ منہ چھپا کر کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس نے آواز دی۔ ''پارو! تم نے تیل لانے کو کہا تھا' میں بھول گیا تھا۔ اب اتنی رات کو تیل تو نہ ملتا۔ موم بتی لے آیا ہوں۔ اسے لو اور روشنی کرو۔''

سلطانی بیگم نے کہا۔ ''تم رسوئی میں جاؤ۔ وہاں دیا سلائی رکھی ہے۔ موم بتی جلا کر لے آؤ۔''

اس نے برآمدے میں آ کر بہن پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ پھر ایکدم سے پریشان ہو کر پاس آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ آپ کی پیشانی کو کیا ہوا ہے؟ یہ گومڑ کیسے نکل آیا ہے؟''

اس نے بھائی کو دیکھا۔ اسے کیا بتائے اور کیا نہ بتائے؟ وہ دور آنگن کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی شرابی بدمعاش آیا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہیں؟ میرے جاتے وقت آپ نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔ پھر وہ کیسے آ گیا؟ کون تھا وہ؟''

پھر وہ احاطے کی دیوار کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں وہ دیوار پھاند کر آیا ہوگا۔ آپ تو یہاں کے سب ہی لوگوں کو پہچانتی ہیں۔''

''اندھیرے میں کیسے پہچانتی؟ لالٹین میں تیل ڈال کر جاتے تو اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی پہچان لیتی۔''

''مگر ہمارے گھر میں چرانے کے لئے ہے کیا؟ دو چار روپے ہوں گے۔ پارو کے لئے جو زیورات جوڑے ہیں، وہ ہم پھوپھی کے ہاں رکھواتے ہیں۔ وہ تو یہاں سے خالی ہاتھ گیا ہوگا۔''

وہ سر جھکا کر پیشانی کے گومڑ کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ گہنے ہانڈی برتن اور کپڑے چرانے نہیں آیا تھا۔ ہماری عزت اور غیرت سے کھیلنے آیا تھا۔ ہائے میری بچی...!''

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ بنے میاں کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے سر گھما کر ادھر دیکھا' جدھر پارو کا کمرہ تھا۔ اندھیرے میں نہ کمرہ دکھائی دے رہا تھا' نہ وہ نظر آ رہی تھی۔ مگر بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی۔

وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج تک ہماری بستی میں' آس پاس کے گاؤں میں اور پورے رامپور میں ایسا کسی نے نہیں کیا۔ کبھی ہم نے نہیں سنا کہ کسی نے کسی کے گھر میں گھس کر زیادتی کی ہو۔''

وہ ٹارچ روشن کر کے تیزی سے چلتا ہوا رسوئی میں گیا۔ پھر وہاں سے موم بتی جلا کر لے آیا۔ اسے ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے بتائیں۔ کتنی دیر ہوئی ہے؟ وہ کب یہاں سے گیا ہے؟ میں ابھی جا کر اسے ڈھونڈوں گا۔ میں اسے۔ میں اسے...''

بہن نے ڈانٹ کر کہا۔ ''چپ رہو۔ اتنی زور سے بول رہے ہو۔ کیا دنیا والوں کو سنا رہے ہو کہ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں؟''

بہن نے آستین پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ کیا تم حرام موت مرنے جاؤ گے؟''

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جو ہو چکا تھا' اس پر شرم آ رہی تھی۔ وہ گناہگار کو پکڑ پاتا یا یونہی ہوا کے پیچھے بھاگتا رہتا۔ مگر کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ کم از کم اسے دیکھ کر پہچان لینا چاہتا تھا۔

وہ بے بسی سے بولا۔ ''آپا! میری کھوپڑی گھوم رہی ہے۔ میں سکون سے نہیں رہ پاؤں گا۔ اس سے مقابلہ نہیں کروں گا۔ مگر چھپ چھپا کر انتقام ضرور لوں گا۔ آپ مجھے جانے دیں۔ میں اسے چپ چاپ تلاش کروں گا۔ کچھ تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون تھا؟ یہاں ہر گھر میں لڑکیاں ہیں۔ وہ ہمارے ہی گھر کیوں آیا تھا؟ ہماری اس سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی؟''

سلطانی بیگم نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''دشمنی ہو بھی سکتی ہے۔ شائد ہم نے اسے دشمن بنا لیا ہو۔''

''آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟''

''مجھے یقین نہیں ہے مگر اسی پر شبہ ہو رہا ہے۔ وہ....وہ دارو پی کر آیا تھا۔''

''کیا....؟''

بنے ایکدم سے چیخ پڑا۔ پھر فرش پر ہتھیلی مارتے ہوئے بولا۔ ''پھر تو وہی آیا تھا۔ وہ کتا ہے.... کمینہ ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے' یہاں رشتے داری نہیں ہو سکے گی۔ ہم اپنی پارو کو اس کی جھولی میں نہیں ڈالیں گے۔''

سلطانی بیگم نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ اتنی سی بات پر ایسی

شرمناک حرکت کرے گا۔"

"دارو کا نشہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ پاگل بنا دیتا ہے۔ پینے والے نشے میں کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ آپا! اب تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں' وہی آیا تھا اور قسم کھاتا ہوں' اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"تم کچھ نہیں کرو گے۔ اس سے بات بھی نہیں کرو گے۔ بات یہاں سے باہر نکلے گی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ذرا عقل سے سوچو! کیا ہم ابھی جا کر اس کا گریبان پکڑ سکتے ہیں؟ ساری دنیا پوچھے گی کہ ایک شریف آدمی کا گریبان کیوں پکڑا جا رہا ہے؟ تب ہم کیا جواب دیں گے؟ جو ہو چکا ہے' کیا وہ بات دنیا والوں کے سامنے ہماری زبان پر آسکے گی؟"

وہ دونوں ہاتھ اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے بولا۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

"کچھ نہ کرو۔ جوش میں آؤ گے تو ہمارا ہی نقصان ہوگا۔ میں کل کسی وقت اس کی حویلی میں جاؤں گی۔ اس کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکوں گی۔ لیکن پوچھوں گی کہ اس نے اپنے چہرے کی سیاہی ہم پر کیوں پھیر دی ہے؟"

وہ دونوں بے بسی سے سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ پارو اپنے کمرے میں تھی۔ دوپٹے سے چہرے اور گردن کو ادھر ادھر سے رگڑ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا' جیسے میل خورے کا سارا رنگ اس پر اتر آیا ہے۔

وہ رو رہی تھی اور بدن کے مختلف حصوں کو بھی دوپٹے سے پونچھتی جا رہی تھی۔ سسک سسک کر سوچ رہی تھی' کل صبح ہوگی تو کیا ہوگا؟ کیا میل خوری دکھائی دے گی؟ ساری سکھیاں پوچھیں گی' تیرا اُجلا رنگ کیا ہوا؟ چہرے کی شادابی پر یہ سائے سائے سے کیسے ہیں؟ دل کو یہ بات لگ رہی تھی کہ وہ میل خوری محبوبہ بن گئی ہے۔

اس کے اندر دھواں سا بھرتا جا رہا تھا۔ وہ میل خورہ اندر سے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ گھبرا کر فرش پر سے اٹھ گئی۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر آنگن میں آگئی۔ پھر کیچڑ پانی سے گزرتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔

اب وہ تمام رات صابن رگڑ رگڑ کر میل چھڑانے والی تھی۔ آبرو پر جو دھبہ لگا تھا' وہ کسی کو نظر نہ آتا۔ اس زہرہ جبیں کی جبیں کو پہلے کی طرح روشن رہنا تھا۔ وہ

محبوب علی کے نام کا ایک چھینٹا بھی برداشت کرنے والی نہیں تھی۔

✪

محبوب علی مستی میں چور تھا۔ طویل عرصے سے جس کی تمنا کر رہا تھا۔ وہ سراپا آغوش میں آگئی تھی۔ وہ تو مایوس ہو گیا تھا کہ شائد کبھی اسے چھو بھی نہیں پائے گا۔ اگر ہمت کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا؟ ایک عاشق اگر پہاڑ کاٹنے پر آجائے تو دودھ کی نہر نکال لاتا ہے۔

وہ بڑا حوصلہ کرنے کے بعد کامیاب ہوا تھا۔ جو نہر نکال کر لایا تھا' اس میں ڈوب رہا تھا۔ ابھر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت کسی نے مداخلت کی۔ وہ ناگواری سے کسمسانے لگا۔ وہ اپنی پارو کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں تھا' وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ مگر دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔

آخر آنکھ کھل ہی گئی۔ اس نے کروٹ بدل کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

ملازم کی آواز سنائی دی۔ "مالک! معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو نیند سے جگانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر سلطانی بیگم آئی ہیں۔ کہتی ہیں' آپ سے مل کر ہی جائیں گی۔"

وہ سلطانی بیگم کا نام سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے پہلے تو گھبرا کر اپنے بستر کو دیکھا۔ پھر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اس وقت وہ نشے اور نیند کے ملے جلے خمار میں تھا۔ جگانے کے باوجود ذہنی طور پر پوری طرح بیدار نہیں تھا۔ صرف سلطانی بیگم کے نام نے چابک ماری تھی۔ ایسا لگا تھا کہ چوری اور گناہ کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ملازم نے کہا۔ "وہ بیٹھک میں ہیں۔ میں نے بیٹھنے کو کہا۔ مگر وہ کھڑی ہوئی ہیں۔ کہتی ہیں' آپ کو فوراً بلایا جائے۔"

وہ وہاں سے چلتا ہوا بیٹھک کی طرف آیا۔ پھر دروازے کی آڑ سے بولا۔ "خالہ جان! السلام علیکم..."

وہ دروازے کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے سلام کا جواب نہیں دوں گی۔ سامنے آؤ۔"

"ہمیں تھوڑا سا وقت دیں۔ ہم منہ ہاتھ دھو کر ذرا حلیہ بدل کر آتے ہیں۔"

''میں تمہارا حلیہ دیکھنے نہیں آئی ہوں۔منہ ہاتھ دھونے سے' غسل کرنے سے تمہاری ذہنیت نہیں بدل جائے گی۔پانی سے بدن ڈھلتا ہے۔نیت نہیں ڈھلتی۔کیا میری بیٹی کی عزت پر جو دھبہ لگایا ہے' اسے کبھی دھوسکو گے؟''

اس نے پریشان ہوکر سر گھما کر اپنی خوابگاہ کی طرف دیکھا۔پینے کی ایک حد ہوتی ہے۔اس نے اتنی پی لی تھی کہ پوری رات گزرنے کے بعد بھی دھیما دھیما سا نشہ اس پر حاوی تھا۔

وہ بولا۔''خالہ! ہم ابھی آتے ہیں۔''

وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنی خوابگاہ میں آیا۔دروازہ کھول کر بستر کو اوپر نیچے سے دیکھا۔کمرے کے ایک ایک گوشے پر نظر ڈالی۔پھر وہاں سے آتے ہوئے سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔''وہ اچانک کیوں چلی گئی؟''

پھر اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوچا۔''ہم سمجھ گئے' اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی ماں یہاں آگئی ہے۔''

وہ بیٹھک میں آکر اسے دیکھتے ہی سر جھکا کر بولا۔''السلام علیکم.....''

وہ غصے سے بولی۔''سلامتی بھیجنے کے لئے سلام کیا جاتا ہے۔میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں اور پوچھتی ہوں' بولو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہوں؟ تم نے میری بیٹی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔کیا دنیا والوں سے شکایت کرسکتی ہوں؟ تمہیں عدالت سے سزا دلاسکتی ہوں؟ ایسا کروں گی تو میری ہی بیٹی بدنام ہوگی۔اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔بولو میں کیا کروں؟''

وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔متاثرہ ذہن یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے پارو کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔اب ایک ماں کو کیا جواب دے سکتا ہے؟

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔''ہم آپ کے سامنے شرمندہ ہیں۔ہم سے جو غلطی ہوگئی' اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔آپ جب بولیں گی' ہم پارو کو اپنے گھر کی عزت بنا کر لے آئیں گے۔''

وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولی۔''تم نے اسی لئے یہ کھیل کھیلا ہے کہ ہم مجبور

ہوجائیں اور پارو کو تمہاری جھولی میں ڈال دیں۔لیکن نہ تو میں نے پہلے کبھی تمہیں داماد بنانے کے بارے میں سوچا تھا' نہ ہی اب تمہارے مجبور کرنے سے مجبور ہوجاؤں گی۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ہم نے آپ کو مجبور کرنے کے لئے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔آپ آرام سے بیٹھ کر ہماری بات سن لیں۔''

''میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔کھڑی کھڑی واپس جارہی ہوں۔دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کررہی ہوں' کبھی ہمارے گھر کی طرف نہ آنا۔کبھی پارو کا نام زبان پر نہ لانا۔ہم تمہارے خلاف کچھ نہیں کرسکیں گے۔مگر مجبور ہوکر اپنا گھر اپنا گاؤں چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے۔تمہارے اندر ذرا سی بھی خاندانی شرافت ہے تو ہم غریبوں کو اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور نہ کرنا۔''

وہ پلٹ کر جانے لگی۔پھر دروازے پر رک کر بولی۔''غریبوں کی آہوں اور بددعاؤں سے ڈرو۔اگر پارو کا نام کبھی اپنی زبان پر نہیں لاؤ گے تو میں کبھی تمہیں بددعا نہیں دوں گی۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔وہ روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔محبوب علی گم صم کھڑا کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔پھر آہستہ آہستہ فرش پر بیٹھ گیا۔وہ کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان الجھا ہوا تھا۔وہ خواب وخیال میں اس کی سیج پر آئی تھی اور اس کی ماں سچ مچ الزام دینے چلی آئی تھی۔مدہوشی کے باعث ذہن کچا تھا۔سوچ کمزور تھی۔یہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ پارو کے ساتھ گناہ گار بن چکا ہے۔اس کی ماں رورہی ہے اور بددعائیں دے رہی ہے۔

وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے لیٹ گیا۔پھر لیٹتے ہی اپنے آپ سے غافل ہوگیا۔پچھلی رات بھٹی کا مالک اسے بگھی میں ڈال کر حویلی میں لایا تھا۔اس نے اور ملازم نے اس کے سر پر برف کی تھیلی رکھی تھی۔اسے زیادہ سے زیادہ اچار چٹاتے رہے تھے۔وہ کبھی ہوش میں آکر بولتا تھا' کبھی انٹاغفیل ہوجاتا تھا۔

دھن راج دوپہر کو خیریت معلوم کرنے آیا۔ملازم نے اسے بیٹھک میں لاکر کہا۔''یہ دیکھیں! صبح سلطانی بیگم ملنے آئی تھیں۔پتہ نہیں' ان سے بھی ہوش میں رہ

کر باتیں کی تھیں یا نہیں؟ میں تو حویلی سے باہر چلا گیا تھا۔ واپس آکر دیکھا تو یہاں ننگے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ تب سے اب تک خراٹے لے رہے ہیں۔''

دھن راج نے پاس آکر اسے نیند سے جگایا۔ اس نے تھوڑی دیر تک کسمسانے کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر حویلی کی بیٹھک کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تم....؟ تم یہاں...؟''

پھر وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم یہاں کیسے آگئے؟''

دھن راج نے ملازم سے کہا۔ ''تم جاؤ اور کھانا گرم کرو۔ یہ کل رات سے بھوکے ہیں۔''

ملازم وہاں سے چلا گیا۔ اس نے قریب ہوکر دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیا آپ کسی مشکل میں ہیں؟ ایسا لگتا ہے' بہت زیادہ دکھ اٹھا رہے ہیں۔ دل ٹوٹا ہوا ہے۔ آپ پہلے کبھی اتنی نہیں پیتے تھے۔''

وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تم ہمیں رات کو یہاں لائے تھے؟''

دھن راج نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہمیں یہاں بیٹھک میں ڈال گئے تھے؟''

وہ فوراً ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''نہیں مالک! میں تو آپ کو کمرے میں لے گیا تھا۔ کمرے میں سلایا تھا۔ آپ کے سر پر برف کی تھیلی رکھی تھی۔ اچار کھلایا تھا۔ آپ تھوڑی دیر تک کچھ ہوش میں رہ کر بولتے رہے تھے۔ پھر مدہوش ہو گئے تھے۔''

''پھر ہم یہاں کیسے آگئے؟''

''ملازم کہہ رہا تھا' سلطانی بیگم آئی تھیں۔''

اس نے ایکدم سے چونک کر دھن راج کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میں آپ کے لئے بوتل لایا ہوں۔ لیکن اس بوتل میں دارو نہیں ہے' لیموں کا شربت ہے۔ اسے پئیں گے تو رہا سہا نشہ ہرن ہو جائے گا۔''

وہ سلطانی بیگم کا نام سنتے ہی کچھ ہوش میں آ گیا تھا۔ بوتل لے کر منہ سے لگا کر پینے لگا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ سلطانی خالہ آئی تھیں۔ اسے الزام دے رہی تھیں کہ اس

نے پارو کے ساتھ گناہ کیا ہے۔ اس کنواری پر ایسا داغ لگایا ہے کہ وہ بدنام ہونے کے بعد گھر کی رہے گی' نہ گھاٹ کی...

اس نے آدھی بوتل پینے کے بعد دھن راج سے پوچھا۔ ''کل رات ہمارے پاس کوئی لڑکی آئی تھی؟''

دھن راج نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی شرافت کے تو سب ہی گن گاتے ہیں۔ آپ کسی عورت کو منہ نہیں لگاتے۔ پھر بھلا یہاں کون آئے گی؟ ویسے میں صبح پانچ بجے تک یہاں تھا۔''

وہ محبوب علی کو توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کچھ الجھے ہوئے ہیں۔ کیا کسی عورت کے معاملے میں پریشانی ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ میں آپ کے برابر کا نہیں ہوں۔ آپ کا بھیدی نہیں بن سکتا پھر بھی بنتی کرتا ہوں' کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اس سے بچنے کا کوئی راستہ بتا سکوں گا۔ آپ اس بات کو سمجھیں کہ دارو میں اتنا نشہ اور اتنی تیجی نہیں ہوتی' جتنی کہ عورت میں ہوتی ہے۔ یہ کم بخت کھوپڑی الٹا دیتی ہے۔''

پچھلی رات مدہوش ہونے کے بعد سے اب تک پندرہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ نشہ بڑی حد تک اتر چکا تھا۔ لیموں کا رس پینے کے بعد حواس بحال ہو رہے تھے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ سلطانی بیگم اس پر الزام لگا رہی تھیں اور وہ ہاتھ جوڑ کر اپنا گناہ قبول کر رہا تھا۔ یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ اس نے پارو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ کل رات سے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ ہاں۔ مگر خواب میں بہت کچھ دیکھتا رہا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''لعنت ہے ایسے نشے پر... ہم خوامخواہ گناہ کا الزام اپنے سر پر لیتے رہے۔ سلطانی خالہ ہم سے بری طرح بدظن ہو کر گئی ہیں۔ ہمیں اپنی صفائی پیش کرنی ہوگی۔ نہیں تو پارو ہمارے ساتھ بدنام ہوتی رہے گی۔''

پھر اس کے دماغ میں سوال پیدا ہوا۔ ''جب ہم نے اس کے ساتھ کچھ کیا ہی نہیں تو وہ بدنام کیسے ہو گی؟ اور سلطانی خالہ ہمیں الزام دینے کیوں آئی تھیں؟''

دھن راج نے کہا۔ ''اتنا تو میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ بہت پریشان ہو کر سوچ

رہے ہیں۔“

وہ بولا۔”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔مگر ایک بات بتاؤ‘ اگر ہم سپنے میں دیکھیں کہ کسی کے ساتھ پاپ کر رہے ہیں اور جاگنے کے بعد وہ سچ مچ آ کر ہمیں الزام دے کہ ہم نے اسے برباد کر دیا ہے تو سچ کیا ہوگا اور جھوٹ کیا ہوگا؟“

دھن راج نے کہا۔”سپنا تو سپنا ہی ہوتا ہے۔وہ سچ نہیں ہوتا۔اور اگر وہی سپنے والی عورت آ کر الجام لگاتی ہے تو وہ جھوٹ بولتی ہے۔“

”اگر وہ عورت الزام نہیں لگا رہی ہے۔وہ ہمیشہ سچ بولتی آئی ہے اور اس وقت بھی سچ بول رہی ہے تو سچ کیا ہوگا؟“

”آپ عجیب الجھانے والی باتیں کر رہے ہیں۔ہاں۔اگر وہ سچی ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور نے جیادتی کی ہو اور وہ آپ پر شبہ کر رہی ہو۔“

محبوب علی نے پوچھا۔”یعنی اس عورت کے ساتھ سچ مچ زیادتی کی گئی ہے؟“

”ہاں۔تب ہی تو وہ الجام دینے آپ کے پاس آئی تھی۔“

وہ جلدی سے سنبھل کر بولا۔”ہمارے پاس کوئی نہیں آئی تھی۔ہم تو یونہی ایک بات پوچھ رہے ہیں۔“

”اسی بات کا جواب یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس عورت کے ساتھ جرور کسی نے جیادتی کی ہے اور وہ آپ پر شبہ کر رہی ہے۔“

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔”ہم جا کر غسل کریں گے اور کچھ کھائیں گے۔تم نے کل رات سے ہماری بہت خدمت کی ہے۔کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں بولو۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔”میں تو آپ ہی کا دیا کھاتا ہوں۔آپ کی مہربانی سے پولیس والے میری بھٹی پر چھاپہ مارنے نہیں آتے۔البتہ پھوکٹ کی پی کر چلے جاتے ہیں۔کوئی بات نہیں۔“

محبوب اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔”اچھا اب جاؤ۔ہمیں نہانا دھونا ہے۔اپنا حلیہ بدلنا ہے اور بہت سے کام نمٹانے ہیں۔“

دھن راج اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔وہ خوابگاہ کی طرف

جاتے ہوئے بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔”کیا پارو کے ساتھ زیادتی ہو چکی ہے؟ کسی نے شرمناک واردات کی ہے اور الزام ہم پر آ رہا ہے۔“

وہ خوابگاہ میں آ کر ایک ذرا لڑکھڑایا۔پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔یہ خیال کلیجہ کھینچ رہا تھا کہ کسی نے پارو کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔آہ...! پھول جیسے کھلے ہوئے وجود کو کسی نے داغدار کر دیا۔کس شیطان نے ایسا کیا ہوگا؟

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔نامعلوم شیطان کا گلا دبوچنے لگا۔وہ جو بھی ہوگا‘ شیطان تو ہوگا ہی...مگر اس کا رقیب بھی تھا۔

وہ تصور میں بھی کسی کو اپنی پارو کے قریب آنے نہیں دیتا تھا۔اسی کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح سلطانی خالہ کا دل جیت لے۔ان کی حمایت حاصل ہو جائے۔پھر پارو کو اس کی دلہن بننے سے کوئی روک نہیں پائے گا۔حتیٰ کہ اسے دیکھ کر منہ پھیرنے والی بھی انکار نہیں کر سکے گی۔ماں کا فیصلہ مان لے گی۔

مگر سوچا تھا کیا اور کیا ہو گیا؟ وہ شرافت سے اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔کسی نے ذلالت سے حاصل کر لیا۔اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہے۔اب اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔

”رشتہ کیسے نہیں آئے گا؟ میں جو ہوں...“

وہ تن کر بیٹھ گیا۔

سلطانی بیگم باؤلی ہو کر پھر رہی تھی۔ یہ بات سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی کہ بات نہ چھپی اور پھیل گئی تو کیا ہوگا؟

وہ صبح ہوتے ہی محبوب علی کے پاس گئی تھی۔ اُس پر شبہ تھا کہ دارو پی کر آنے والا وہی ہوسکتا ہے اور اس نے ہاتھ جوڑ کر شرمندہ ہو کر اس کے شبے کی تصدیق کردی تھی۔

گناہ کا اقرار کرنے کے بعد وہ اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی؟ نہ اس کا گریبان پکڑ سکتی تھی' نہ شور مچا سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ آئندہ کبھی پارو کا نام زبان پر نہ لانا۔ اگر وہ بدنام کرنا چاہے گا تو وہ اپنی بیٹی کے ساتھ منہ چھپا کر کہیں چلی جائے گی۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی گھر واپس آگئی تھی۔ وہاں بنے بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ اس نے بہن کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ وہ کمینہ کیا کہتا ہے؟''

وہ کمرے میں آکر بولی۔ ''اور کیا کہے گا؟ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا' غلطی ہوگئی ہے۔ میں اسے اپنا داماد بنالوں۔''

بنے اسے گالیاں دینے لگا۔ مہ پارہ اپنے کمرے میں تھی۔ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ تینوں ہی پچھلی رات سے جاگ رہے تھے۔ بنے کہہ رہا تھا۔ ''وہ پارو کے لئے ہی یہاں آتا تھا۔ ہم سے رشتہ کرنے کے لئے اس نے آپ کو ماں بنایا تھا۔ کل میں نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تو وہ سمجھ گیا کہ یہاں دال نہیں گلے گی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ شیطانی حرکت کی ہے۔''

سلطانی بیگم نے کہا۔ ''میں تو اس کے منہ پر کہہ کر آئی ہوں' اس نے ہمیں مجبور کرنے کے لئے ہماری بیٹی کو داغدار کیا ہے۔ مگر ہم مجبور ہونے والے نہیں ہیں۔ میں یہ گھر' یہ گاؤں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ مگر کبھی اسے اپنا داماد نہیں بناؤں گی۔''

مہ پارہ یہ باتیں سن رہی تھی اور تولیئے سے اپنے چہرے اور بدن کو رگڑ رہی تھی۔ وہ ایسا بھی بدصورت اور گھناؤنا نہیں تھا۔ مگر اسے گھن آرہی تھی۔ پھر یہ تصدیق ہوگئی تھی کہ پچھلی رات وہی آیا تھا، وہ جھنجھلا کو سوچ رہی تھی کہ اپنی کھال ہی نوچ کر پھینک دے۔

سلطانی بیگم نے بنے سے پوچھا۔ ''کیا پارو سو رہی ہے؟''

''نہیں جاگ رہی ہے۔ میں نے دروازہ کھولنے کو کہا تو رونے لگی۔ پھر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ کس منہ سے کہتا؟ کیا کہتا؟ اس ذلیل کمینے نے ہمیں کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ ہماری بچی ہم سے نظریں نہیں ملا رہی ہے۔''

''ہم اس بات کو دبانے کی کوشش کرتے رہیں گے، مگر وہ ضرور اچھالے گا۔ ہمیں مجبور کرے گا۔ میں آج ہی رات کی ٹرین سے بریلی جاؤں گی۔ بلقیس آپا نے کہا تھا' وہ پارو کو اپنی بہو بنائے گی۔ میں آج ہی جاکر بات پکی کروں گی۔ تاریخ مقرر کروں گی۔ جتنی جلدی ہوسکے گا، اسے سہاگن بنا کر اس کی پھوپھی کے گھر بھیج دوں گی۔''

یہ باتیں سن کر پارو کو اطمینان ہو رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنے پھوپھی زاد سرتاج حسین کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت ہی خوبرو جوان تھا۔ ایک حسینہ کے تکبر اور مزاج کے شایانِ شان تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اس نے سوچ کے دھندلکے میں دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''پارو! تم میری آئیڈیل ہو۔ میں تمہیں اپنی دلہن ضرور بناؤں گا۔''

ایک وہی نہیں اور بھی بیشمار اس کے چاہنے والے اور دور ہی دور سے آہیں بھرنے والے تھے۔ ان میں سے کچھ سنجیدہ عاشق تھے' کچھ عیاش تھے۔ ایسے وقت یہی کہا جاتا ہے۔

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

بری نظر ڈالنے والے زیادہ تھے۔ مگر کسی کے ارادے کیا ہیں؟ یہ کسی کو پرکھے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے پچھلے روز منصور کو پرکھ لیا تھا۔ وہ ایک سچے عاشق کی طرح اس کے حسن و جمال کے گن گاتا تھا اور قسمیں کھاتا تھا کہ اسے اپنی دلہن بنا کر لے جائے گا۔ کل پہلی بار پتہ چلا کہ وہ باپ سے کس قدر ڈرتا ہے؟ ساری سہیلیوں کے سامنے اس کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ چالباز تھا' باپ کی دولت اور جائیداد سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ پارو جیسی حسین لڑکیاں تو محبت کے فریب سے ملتی ہیں۔ پیسے پھینکنے سے بھی مل جاتی ہیں۔ نہ ملیں تو جبراً حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اور اس نے یہی کیا تھا' پچھلی رات بھٹی سے دارو کی بوتل لے آیا تھا۔ وہ کبھی پیتا نہیں تھا۔ اگر بوتل کو منہ لگاتا تو باپ جوتے مارتا۔ اس نے اپنی قمیض کو دارو سے تر کرلیا تھا۔ چہرے کو بھی اچھی طرح بھگولیا تھا۔ یہ پورا یقین تھا کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ وہ پارسا رہے گا اور اس کا رقیب محبوب علی ضرور بدنام ہوگا۔

وہ جذبات کی بارش میں دل بھر کر نہاتا رہا تھا۔ واپسی میں بھی اس قدر بھیگتا رہا تھا کہ لباس کی تمام دارو دھل گئی تھی۔ مویشیوں کے باڑے میں آ کر سو گیا تھا اور دن چڑھے تک سوتا رہا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو پارو یاد آئی۔ وہ چارپائی پر ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑا تھا۔ ہوس میں چاروں شانے چت ہونے کے بعد فتح مندی سے سرشار ہو رہا تھا۔ ''ہائے کیا چیز ہاتھ لگی تھی....؟''

اس نے تصور میں اسے دیکھا۔ مگر وہ اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دکھائی دیتی تو شراب دوآتشہ بن جاتی۔ مگر کیا کیا جائے' تاریکی میں کوئی دکھائی نہیں دیتی' صرف سجھائی دیتی ہے۔ چوری کا مال ایسے ہی ملتا ہے۔ کوئی بات نہیں' جیسے بھی ملا تھا' خوب ملا تھا۔

اب دن کی روشنی میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا وہ آج بھی سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولنے آئے گی؟ وہ جوانی کا منہ زور جھولا جھلانے کے بعد اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ دوپہر کو کھانے کے بعد اس مکان کے سامنے سے گزرتا ہوا گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ مکان کے پچھواڑے دور تک گھنے درخت تھے۔ جہاں لڑکیاں ہنستی کھیلتی اور جھولا جھولتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس نے بہت بڑی واردات کی ہے۔ سلطانی بیگم پر جارحانہ حملہ کیا ہے۔ پتہ نہیں اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ گھر کا ماحول ماتمی ہوگا۔ وہ خوامخواہ اسے دیکھنے کے لئے ادھر چلا آیا تھا۔

اس نے گھر کی طرف واپس جاتے وقت بنّے میاں کو دیکھا۔ وہ کرائے کی سائیکل پر آ رہا تھا۔ اس نے قریب آنے پر پوچھا۔ ''ارے بنے بھائی! کل رات فلم دیکھنے گئے تھے اور اب واپس آ رہے ہو؟''

اس کے چہرے سے گہری سنجیدگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں تو کل رات ہی واپس آ گیا تھا۔ ابھی بریلی کا ٹکٹ لینے رامپور گیا تھا۔''

''کیا بریلی جا رہے ہیں؟''

''آپا اور پارو جا رہی ہیں۔''

اس نے ٹٹولنے کی غرض سے پوچھا۔ ''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ پریشانیاں پریشان کرتی ہیں تو آدمی پریشان دکھائی دیتا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے؟ کیا میں کسی کام آ سکتا ہوں؟''

''بعض دکھ بیماریوں میں کوئی کسی کے کام نہیں آ سکتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ بریلی میں ہمارے ایک رشتے دار کی موت ہوگئی ہے۔ آپا پُرسے کے لئے وہاں جا رہی ہیں۔''

وہ بات بنا کر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے اور اس کی آپا نے یہ طے کیا تھا کہ دلی صدمات چھپائے نہیں چھپیں گے۔ چہرے اور آنکھوں سے ظاہر ہوں گے۔ لہٰذا جھوٹ بولا جائے کہ بریلی میں کسی رشتے دار کی موت ہوگئی ہے۔

وہ کرائے کی سائیکل واپس کر کے گھر آیا۔ پھر اپنی آپا سے بولا۔ ''رات آٹھ بجے کی ٹرین ہے۔ آپ وہاں پہنچتے ہی بلقیس آپا سے رشتے کی بات چھیڑ دیں۔ ایک

بار تو وہ کہہ چکی ہیں کہ پارو کو بہو بنائیں گی۔اب آپ کو بات آگے بڑھانے کے لئے جھجکنا نہیں چاہئے۔''

وہ بولی۔''مجھے تو رہ رہ کر ہول اٹھ رہا ہے، میں اس معاملے میں دیر نہیں کروں گی۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ بنے نے کہا۔''پھر کوئی اڑوس پڑوس والی آئی ہے۔ عورتیں ٹوہ میں لگی رہتی ہیں۔کون کہاں جارہا ہے اور کہاں سے آرہا ہے؟ پھر یہ کہ آپ اچانک کیوں یہاں سے جارہی ہیں؟''

سلطانی بیگم نے کہا۔''صبح سے اب تک درجنوں ملنے والیوں کو کہہ چکی ہوں کہ پُرسے کے لئے جارہی ہوں۔اب یہ بیچاریاں میل محبت والی ہیں۔ہمدردی کے لئے آرہی ہیں۔''

بنے نے آنگن میں آکر دروازہ کھولا تو ایکدم سے چونک گیا۔سامنے محبوب علی کھڑا ہوا تھا۔وہ ایکدم سے گرجتے ہوئے بولا۔''تم....؟تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

سلطانی بیگم نے آنگن میں آتے ہوئے پوچھا۔''کون ہے؟ کسے غصہ دکھا رہے ہو؟''

پھر وہ محبوب علی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔اس کے ہاتھ میں کلام پاک تھا۔وہ مقدس کتاب کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔''غصہ نہ کریں۔ہم اپنی صفائی پیش کرنے آئے ہیں۔آپ صبح آئی تھیں۔آپ نے ہمیں بہت بڑا الزام دیا۔ہم اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھے۔آپ کے سامنے سر جھکا کر مان گئے۔''

وہ بولی۔''کیا تم اپنی بات سے پھرنے آئے ہو؟''

وہ بولا۔''ہم سب مسلمان ہیں۔خدا سے ڈرتے ہیں۔اسی لئے ہم قرآن مجید ساتھ لائے ہیں۔اسے سر پر رکھ کر کہتے ہیں کل یہاں سے نکلنے کے بعد پھر پلٹ کر نہیں آئے۔نہ دن کو آئے' نہ رات کو آئے۔ہم زیادہ نہیں بولیں گے۔آپ آج بھی ہماری ماں جیسی ہیں۔آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔بس یہ التجا کرتے ہوئے جا رہے ہیں' خدا کو مانیں' کلام پاک کو مانیں۔پھر یہ مان لیں کہ ہم گناہ گار نہیں ہیں۔خدا آپ سب کو دلی سکون عطا فرمائے، آمین۔''

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔بنے نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''بہروپیا ہے۔صبح آپ کے سامنے جرم قبول کر چکا ہے۔''

سلطانی بیگم سوچ میں پڑ گئی تھی۔اس نے کہا۔''ہاں قبول تو کیا تھا۔مگر نشے میں تھا۔یہ دیکھو کہ اس نے قرآن مجید سر پر رکھ کر اپنی صفائی پیش کی ہے۔''

''رہنے دیں آپا! آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں۔ بڑی بڑی عدالتوں میں کلام پاک اور بھگوت گیتا اٹھا کر جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ایسے جھوٹے لوگ بڑے بڑے الزامات سے بری ہوجاتے ہیں۔''

سلطانی بیگم تذبذب میں تھی۔بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔وہ نہیں تھا' مگر اس کے سر پر کلام پاک دکھائی دے رہا تھا اور اس کے چہرے سے وہی برسوں کا بھولپن جھلک رہا تھا۔

مہ پارہ نے بھی دروازے کی آڑ سے اس کی باتیں سنی تھیں۔وہ کسی شرمناک شیطانی حرکتیں کرنے والے کو سچا اور پارسا نہیں مان سکتی تھی۔لیکن مان لینے سے یہ اطمینان حاصل ہوسکتا تھا کہ وہ میل خورہ اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ایسا سوچتے ہی قدرے آسودگی مل رہی تھی۔وہ اپنے آپ کو قائل کر رہی تھی کہ پچھلی رات وہ نہیں آیا تھا' اگر آیا ہوگا تو اس پر کلام پاک کی مار پڑے گی۔

بنے نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔''سامان باندھو۔ہم ابھی یہاں سے جائیں گے۔''

سلطانی نے پوچھا۔''کیا اتنی جلدی یہاں سے نکلیں گے؟''

''ہاں۔ایک تو محلے کی عورتوں کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔وہ سمجھ رہی ہیں کہ آپ پُرسے کے لئے جارہی ہیں۔وہ یہاں آکر ہمدردی کر رہی ہیں اور ہمیں تکلیف پہنچ رہی ہے۔پھر وہ محبوب علی پلٹ کر آئے گا تو میں غصے سے کچھ کر بیٹھوں گا۔میں جا رہا ہوں۔ابھی تانگا لے کر آتا ہوں۔''

وہ گھر سے نکلا تو راستے میں پھر منصور سے سامنا ہو گیا۔اس نے کہا۔''آپ کہیں جارہے ہیں۔ضرور گردش میں ہیں۔مگر مجھ سے بات چھپا رہے ہیں۔مجھے دوست کہتے ہیں۔میں آپ کو دوست سمجھتا ہوں مگر بھائی کہتا ہوں۔اب بتائیں

کہاں جارہے ہیں؟"

"میں تانگا لینے جارہا ہوں۔ آپا اور پارو ابھی جارہی ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔"اتنی جلدی.....؟"

"ہاں۔ رامپور میں ہمیں کچھ کام بھی ہے۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ رامپور میں مجھے بھی کچھ کام ہے۔ میں بھی کرائے کی سائیکل لے کر جانے والا تھا۔ چلیں اچھا ہے' آپ لوگوں کو وہاں تک پہنچا دوں گا۔ مویشی منڈی میں تھوڑا سا کام ہے۔ پھر ہم ساتھ واپس آجائیں گے۔"

کوئی ضروری کام نہیں تھا۔ وہ پارو کی صورت اور رنگ روپ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنے کی بے چینی تھی کہ وہ گل سے گلستاں ہونے کے بعد کیسی لگتی ہے؟

اس نے کرائے کی سائیکل لی۔ پھر بنے کے ساتھ تانگا لے کر دروازے پر پہنچا تو اسے دیکھنے کی حسرت پوری ہوگئی۔ بہت سی سہیلیاں اور محلے کی عورتیں ماں بیٹی کو رخصت کرنے آئی تھیں۔ وہ سہیلیوں سے گلے مل کر تانگے پر بیٹھ گئی تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ چہرے پر اداسی تھی۔

ایک چہرہ تھا اور دو مفہوم تھے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کی موت پر افسردہ ہے۔ حقیقت تو منصور سمجھ رہا تھا۔ جو ہوا' وہ راضی خوشی ہوتا تو اس وقت پھول کی طرح کھلی ہوئی دکھائی دیتی۔ مگر زور زبردستی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اندر چپ چاپ بیٹھی ماتم کر رہی تھی۔ پھر بھی منصور کو اچھی لگ رہی تھی۔ روتے روتے صبر کرنے اور چپ رہنے والی ایک نئے زاویے سے خوبصورت لگ رہی تھی۔

عورت کا حسن رونے کے بعد اور زیادہ ڈھل جاتا ہے' اور زیادہ نکھر جاتا ہے۔ اس کے سینے سے ایک آہ نکلی۔"آہ...! یہ ایک ہی بار ملی ہے۔ اب ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ مگر میرا دل تو مچل رہا ہے۔ یہ کم بخت اسے بار بار مانگے گا۔ یہ کیسی دیا سلائی ہے؟ صرف ایک بار آگ لگی ہے اور آگ ایسے بھڑک رہی ہے جیسے کبھی بجھے گی نہیں۔"

جب تانگا وہاں سے چلا تو وہ اور بنے سائیکل پر تھے۔ بنے پارو کی طرف تھا اور وہ سلطانی بیگم کی طرف سائیکل کے پیڈل مارتا جارہا تھا۔ اس نے پارو کی طرف

دیکھتے ہوئے پوچھا۔"خالہ! آپ کب واپس آئیں گی؟"

وہ بولی۔"جب خدا لائے گا' تب ہی واپس آؤں گی۔"

اس نے سوچا۔"پارو پہلے کی طرح بولتی اور چہکتی تو شائد اس کا بھی یہی جواب ہوتا۔ تب میں کہتا' خدا کی مرضی پر نہ رہو۔ دل کی آواز پر دوڑی چلی آؤ۔"

وہ تھوڑی دیر تک تانگے کے ساتھ سائیکل دوڑاتا رہا اور سوچتا رہا۔ ایسی کیا بات کرنی چاہئے کہ پارو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوجائے؟

اس نے کہا۔"خالہ! آپ نے پارو کا صدقہ اتارنے کے لئے ایک بکرا لانے کو کہا تھا۔ صدقہ دینے سے بڑی بڑی بلائیں ٹل جاتی ہیں۔"

پارو نے پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی دوسری طرف منہ پھیر کر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگتی تھی۔ سلطانی بیگم نے کہا۔ "درست کہتے ہو۔ میں نے صدقہ دینے کی بات کہی اور بھول گئی۔"

وہ بولا۔"منت مانو اور پوری نہ کرو تو کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔"

سلطانی نے کہا۔"ہاں۔ شاید اسی لئے ہم پر مصیبت...

وہ کہتے کہتے ایکدم سے سنبھل گئی۔ چپ ہوگئی۔ کن انکھیوں سے بیٹی کو دیکھا۔ وہ تنبیہ کے انداز میں ماں کو گھور رہی تھی۔ ایسے وقت منصور سے بھی نظریں ملیں اور ایسی ملیں کہ سائیکل کا ہینڈل بے قابو ہوگیا۔ اس نے سنبھلنے کے لئے رفتار کم کر دی۔ تانگا آگے نکل گیا۔

بات رفتار کی ہے، جو اپنی جوانی اور کامیابی کے نشے میں رفتار تیز کر دیتا ہے' وہ آگے کہیں جا کر ٹھوکر ضرور کھاتا ہے۔ ایک رات کی قربت ایسی تھی کہ اسے ہوا میں اُڑا رہی تھی۔ وہ دن کی روشنی میں اسے دیکھ دیکھ کر پاگل ہو رہا تھا۔

وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ سائیکل دوڑاتا ہوا تانگے کے برابر آگیا۔ یوں ایک بات سمجھ میں آئی کہ وہ کل رات بھی پیچھے رہ جاتا تو پارو بہت آگے نکل جاتی۔ پھر کبھی ہاتھ نہ آتی۔

سلطانی بیگم نے کہا۔"تم نے مجھے بھولی ہوئی بات یاد دلائی ہے۔ میں واپس آتے ہی صدقہ اتاروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔آپ واپس آئیں۔میں نے پارو کے لئے ایک کالا بکرا چھانٹ کر رکھا ہے۔"

اس نے مستی میں آ کر سائیکل کی گھنٹی بجائی۔پارو کی نظریں بے اختیار گھنٹی بجانے والے کی طرف گئیں۔وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"واپس آؤ۔یہ بکرا پھر خطرہ مول لے کر تم پر قربان ہونے کی تدبیر کرے گا۔"

تانگا اپنی مخصوص رفتار سے جارہا تھا۔وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔یہ نہیں جانتی تھی کہ حالات اسے کہاں لئے جارہے ہیں؟وہ تو کیا' کوئی بھی نہیں جانتا کہ آگے توقع کے خلاف کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا ہے؟

❁✪❁

سلطانی بیگم یہ مصمّم ارادہ کر کے نکلی تھی کہ بیٹی کو عزت آبرو سے ٹھکانے لگا کر آئے گی۔اب وہ اپنے مکان کی چار دیواری میں محفوظ نہیں رہی تھی۔ایک تو ماں بیٹی تنہا رہتی تھیں۔بیٹے نائٹ ڈیوٹی پر جاتا تو وہ اور تنہا ہو جاتی تھیں۔پھر یہ کہ وہ مکان گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔اب تو جوان بیٹی کے ساتھ وہاں رہتے ہوئے ہول آنے لگا تھا۔

مہ پارہ کی پھوپھی نے پچھلے ہفتے چٹھی لکھی تھی کہ میرا بیٹا ایم بی بی ایس کر چکا ہے۔مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جانے والا ہے۔تم اس کی ممانی ہو' دعا کرو۔وہ بہت بڑا ڈاکٹر بن کر واپس آئے۔"

سلطانی کی نند نے یہ نہیں لکھا تھا کہ بیٹا کب لندن جانے والا ہے؟ابھی بریلی میں تھا۔بات بن سکتی تھی۔رشتہ پکا ہو سکتا تھا اور نکاح بھی پڑھایا جا سکتا تھا۔جب وہ لندن سے بہت بڑی ڈگری لے کر آتا تو پارو کی رخصتی ہو جاتی۔

اور رخصتی کیا کرنی تھی؟وہ پھوپھی کا گھر تھا۔ان کا بیٹا لندن میں پڑھتا رہتا تو وہ اپنی بیٹی کو پھوپھی کے پاس چھوڑ دیتی۔اب کسی صورت اسے گاؤں لانا نہیں چاہتی تھی۔

ماں بیٹی بریلی پہنچیں تو وہ منظر دیکھا' جس کی توقع بھی نہیں کر سکتی تھیں۔وہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔گھر میں عورتیں بین کر رہی تھیں۔گھر کے باہر دریاں بچھی

ہوئی تھیں اور مرد سر جھکائے بیٹھے تھے۔معلوم ہوا کہ پارو کے پھوپھا کا انتقال ہو گیا ہے' پھوپھی بیوہ ہو گئی ہے۔

بیوہ ہونے والی بلقیس اپنی بھاوج کو دیکھتے ہی لپٹ کر رونے لگی۔مہ پارہ بھی پھوپھی سے لپٹ گئی تھی۔وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔"ہائے سلطانی!تمہارے بہنوئی ابھی شام سات بجے تک خوب ہنس بول رہے تھے۔ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قضا آئے گی اور انہیں چٹ پٹ لے جائے گی۔"

پارو نے روتے ہوئے پوچھا۔"آخر پھوپھا کو ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔اچانک ہی دل کا دورہ پڑا تھا۔میرے ڈاکٹر بیٹے نے عارضی طور پر سنبھلنے کی دوائیں دیں۔پھر انہیں ہسپتال لے جانے لگے۔مگر وہ راستے میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

وہ بول رہی تھی اور دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔باہر ڈاکٹر بیٹا سرتاج حسین غمزدہ تھا۔باپ کی تجہیز و تدفین کے انتظام میں مصروف تھا۔وہ ان سے ملنے آیا تو سلطانی بیگم اسے گلے لگا کر رونے لگیں۔رونا اس بات پر بھی آرہا تھا کہ اسے داماد بنانے آئی تھی۔اب یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔

مہ پارہ کچھ فاصلے پر کھڑی اپنے ہونے والے سرتاج کو بڑے پیار سے اور بڑے دکھ سے دیکھ رہی تھی، اس کا سارا دکھ اب اپنا ہی تھا۔

وہ سلطانی بیگم کے گلے لگا ہوا تھا اور بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔دیکھنے کا یہ انداز ماتمی ماحول میں چپکے چپکے رومانیت پیدا کر رہا تھا۔بعض اوقات لوگ دوغلی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔روتے بھی ہیں اور آنسوؤں کے پیچھے جذبات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بھی بنتے رہتے ہیں۔

تدفین ہو گئی' سوئم بھی گزر گیا۔چھاتی پیٹ کر بین کرنے والے ماتم کا زور ٹوٹ گیا۔رفتہ رفتہ صبر آہی جاتا ہے۔اب جو بھی صدمات تھے' وہ دلوں میں تھے۔باہر سوگوار سا ماحول تھا۔

پارو پھوپھی کی خدمات میں لگی رہتی تھی۔اپنے ہونے والے سرتاج سے دن رات سامنا ہوتا رہتا تھا۔نظریں ملتی رہتی تھیں' جذبے بولتے رہتے تھے۔مگر کھل کر

کچھ بولنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

ایک روز اس نے غسل کرنے کے بعد موسم کے مطابق دھانی رنگ کا لباس پہنا تھا۔ ہونٹ سرخ تھے' چہرہ گلابی تھا۔ قد آدم آئینے کی سطح پر جیسے قوس قزح تن گئی تھی۔ وہ ایک ادائے ناز سے تن کر' زاویے بدل بدل کر اُلجھی ہوئی زلفیں سلجھا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ اس کے پیچھے آئینے کی سطح پر ابھرا۔

وہ ایکدم سے چونک گئی۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں شوخی بھی تھی' اور سنجیدگی بھی..... سنجیدگی اس لئے کہ باپ کی موت پر افسردہ تھا اور شوخی اس لئے تھی کہ سہارا لینے آیا تھا۔ مہ پارہ نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بند کرتا ہوا آیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ....؟''

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ''پچھلے ایک ہفتے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ بزرگوں کی موجودگی میں قریب آتی ہو' پھر دور ہو جاتی ہو۔ دریا کا دوسرا کنارہ بن جاتی ہو۔''

وہ چپ رہی۔ سر گھما کر آئینے میں خود کو اس کے ساتھ دیکھنے لگی۔ کیا خوبرو جوان تھا؟ اس کے ساتھ ایسے جچ رہا تھا' جیسے سونے کی انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔ ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے والی خوبصورت جوڑیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔

اس نے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ذرا لرز سی گئی۔ جیسے دستک دے رہا ہو۔ پوچھ رہا ہو۔ ''میں آجاؤں....؟''

اسے کان کے قریب پیار بھری سرگوشی سنائی دی۔ ''پارو! میرا خیال ہے' ہم تقریباً پانچ برس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ میں دہلی میں پڑھتا تھا۔ تم یہاں آتی تھیں اور میں تمہارے دیدار سے محروم رہتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر حیران ہوں۔ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ممانی کی بیٹی اس قدر حسین و جمیل ہوگی۔''

وہ جھکی جھکی نظروں سے خود کو دیکھ رہی تھی اور اپنے حسن کا قصیدہ سن رہی تھی۔ یوں تو کتنے ہی چاہنے والوں سے اپنی قدر و قیمت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ مگر ان لمحات میں خوشی اس بات کی تھی کہ اماں جس سے رشتہ پکا کرنے آئی تھی' وہ آپ ہی

اس کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ رشتہ پکا ہونے سے پہلے ہی وہ اسے جیت رہی تھی۔

پھر وہ ایکدم سے چونک گئی۔ اس نے اچانک ہی اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ چٹان جیسے سینے سے لگتے ہی سانسیں رکنے لگیں۔ وہ گہری گہری سانسیں کھینچتے ہوئے بولی۔ ''یہ...... یہ ایسا نہ کریں۔ کوئی آجائے گا۔''

اسے سمیٹنے والے کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اس کی جرأت پر اعتراض نہیں کر رہی ہے۔ محض دنیا والوں سے ڈر رہی ہے۔ یعنی کہ راضی ہے۔

وہ بولا۔ ''میں دروازہ اندر سے بند کر چکا ہوں۔''

''پھر تو اور بدنامی ہوگی۔ ادھر کوئی آجائے گا۔ دروازے کو اندر سے بند پائے گا تو میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گی۔''

''ڈرتی کیوں ہو؟ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ تمہیں اپنی شریکِ حیات بناؤں گا۔''

یہ الفاظ شہنائی بن کر اس کے اندر گونجنے لگے۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ ''پہلے شریکِ حیات بنائیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ ہی کی ہو کر رہوں گی۔''

''تو پھر ابھی میری ہو جاؤ۔ تمام فاصلے مٹا دو۔''

وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچلنے لگی۔ وہ اپنانے والا بڑا ہی پرجوش اور جذباتی تھا۔ اس کے چہرے پر جھک گیا۔ لب لعالیں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ادھر سے ادھر سر گھما رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''خدارا! مجھے چھوڑ دیں۔ آپ زبردستی کریں گے تو میں رونے لگوں گی۔''

رونے والی دھمکی کام آئی۔ اس نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ تڑپ کر نکلی۔ پھر دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس آ کر اس کی چٹخنی گرادی۔ وہ پاس آ کر ناراضی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں تمہارے قابل نہیں ہوں؟''

وہ جلدی سے انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''ایسا نہ کہیں۔ آپ تو میری سوچ سے بھی زیادہ خوبرو اور باوقار ہیں۔ بہت بڑے ڈاکٹر بننے والے ہیں۔ میں آپ کی شریکِ حیات بن کر ساری زندگی فخر کرتی رہوں گی۔''

''تم فخر کرتی رہوگی۔ یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو میں اپنی انسلٹ محسوس

کررہا ہوں۔''

''آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں حیا والی ہوں؟ شادی سے پہلے آپ کی امانت کو سنبھال رہی ہوں۔''

''یہ باتیں سننے میں اچھی لگ رہی ہیں۔مگر میں پریکٹیکل لائف گزارنے والا آدمی ہوں۔عقل کہتی ہے' دو پیسے کی ہانڈی بھی خریدنے جاؤ تو پہلے اسے ٹھونک بجا کر دیکھ لو۔''

''میں ہانڈی یا کوئی بے جان چیز نہیں ہوں۔آپ کی ہونے والی عزت ہوں اورعزت کو حیا کے گھونگھٹ میں گھر لایا جاتا ہے۔''

''میں نے سنا تھا' تم نے صرف دس جماعتیں پڑھی ہیں۔مگر باتیں بڑی فلسفیانہ کررہی ہو۔میں بحث نہیں کروں گا۔تمہارا انتظار کروں گا۔جب بھی اشارہ کروگی' چلا آؤں گا۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔جیسے اس کی زندگی میں آتے ہی نکل گیا۔وہ پریشان ہوکر سوچنے لگی۔''کیا میں جیتی ہوئی بازی ہارنے والی ہوں؟''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قد آدم آئینے کے سامنے آئی۔پھر اپنا سراپا دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔''میں تو مکمل ہوں۔مجھ میں کوئی عیب نہیں ہے۔پھر سرتاج ٹھونک بجا کر دیکھنے والی بات کیوں کہہ رہے ہیں؟

کیا دنیا کے سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔پہلے سالن چکھنا چاہتے ہیں' بعد میں کھانے یا نہ کھانے کا فیصلہ کرتے ہیں؟اور کچھ تو ایسے ہوتے ہیں' جو چکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔شب خون مار کر چلے جاتے ہیں۔''

اس نے سینے پر یوں ہاتھ رکھا' جیسے کلیجہ تھام رہی ہو' برسات کی اندھیری رات کا زخم تازہ ہوگیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔پھر ماں کی آواز سنائی دی۔''یہاں اکیلی کیا کررہی ہو؟ کھانا لگ رہا ہے۔پھوپھی تمہیں پوچھ رہی ہیں۔''

وہ بولی۔''اماں!یہاں آئیں۔میرے پاس بیٹھیں۔میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

سلطانی بیگم اس کے پاس آکر پلنگ کے سرے پر بیٹھ گئی۔پھر پوچھا۔''کیا کہنا

چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔''سرتاج یہاں آئے تھے۔''

''اچھا۔کیا کہہ رہا تھا میرا بھتیجا؟''

''وہ مجھے اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتے ہیں۔''

سلطانی بیگم خوشی سے کھل گئی۔بیٹی کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔''کیا سچ کہہ رہی ہو؟ کیا سرتاج نے یہ بات اپنی زبان سے کہی ہے؟اگر کہی ہے تو سمجھو میری مشکل آسان ہوگئی ہے۔میں تو سوچ رہی تھی' یہاں اب چالیسویں تک شادی کی کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔مگر لڑکا خود اپنی زبان سے کہہ رہا ہے تو میں آج ہی بلقیس آپا سے بات کروں گی۔''

''بات کرنے سے پہلے میری پوری باتیں سنیں۔وہ شادی سے پہلے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ملنے میں کیا حرج ہے؟ابھی تو تم سے ملنے آیا تھا۔''

''اماں!اتنی بھولی نہ بنیں۔وہ تنہائی میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کیا....؟''

سلطانی بیگم کو جھٹکا سا لگا۔''یہ لڑکا سمندر پار پڑھنے جارہا ہے اور ابھی سے گوروں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہے۔مشرقی تہذیب کو بھول گیا ہے۔شادی سے پہلے ملنا چاہتا ہے۔میں ابھی کھانے کے بعد بلقیس آپا سے بات کروں گی۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔''کیا آپ انہیں یہ بتائیں گی کہ وہ مجھ سے ملنے آئے تھے؟''

''میں ایسی بھی باؤلی نہیں ہوں۔سگا رشتہ کیوں نہ ہو؟وہ میرا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔یہ بات کبھی زبان پر نہیں لاؤں گی کہ وہ میری بیٹی سے ملنے آیا تھا۔چلو اٹھو! وہاں کھانا لگ چکا ہے۔''

وہ کھانے کے ایک بڑے کمرے میں آگئی۔وہاں دور تک دسترخوان بچھا ہوا تھا۔بلقیس کے سسرالی رشتے دار مختلف شہروں سے آئے ہوئے تھے۔ان میں سے کچھ تو واپس جانے والے تھے اور کچھ چالیسویں تک وہاں رہنے والے

تھے۔سلطانی بیگم ان کی موجودگی میں رشتے کی بات نہیں چھیڑ سکتی تھی۔

کھانے کے بعد بھی بلقیس تنہا نہیں مل رہی تھی۔مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔پھر بھی شام کو تنہائی میں مل بیٹھنے کا موقع مل گیا۔اس نے پوچھا۔''آپ کو یاد ہے' آپ نے ایک بار پارو کو بہو بنانے کی بات کی تھی؟''

بلقیس نے کہا۔''میں بھلا اپنے بھائی کی بیٹی کو بھولوں گی؟تم سے تو ایک بار کہا تھا' اپنی سسرال والوں سے بار بار کہتی ہوں۔کوئی اپنی لڑکیوں کے لئے میرے سرتاج کے متعلق نہ سوچے۔میری بہو میرے گھر میں ہے۔''

سلطانی بیگم خوش ہو کر بولی۔''پھر تو چالیسویں کے بعد منگنی کی رسم ادا کی جا سکتی ہے۔''

''اتنی جلدی نہ کرو۔اول تو دو چار مہینوں تک میں اس گھر میں کوئی خوشی نہیں کروں گی۔پھر میرا بیٹا پانچ برس میں ڈگریاں لے کر آئے گا۔اس سے پہلے شادی کی زنجیریں پہناؤں گی تو وہ پڑھائی چھوڑ کر بھاگ بھاگ کر جورو کے پاس آتا رہے گا۔''

''پانچ برس تو بہت ہوتے ہیں آپا!کیا میں اتنے عرصے تک اپنی جوان بیٹی کو بٹھائے رکھوں گی؟''

''وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔تمہارے گھر میں رہے یا میرے گھر میں وہ میری ہے۔تمہیں بوجھ لگ رہی ہے تو اسے یہاں چھوڑ جاؤ۔''

وہ بلقیس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے یہاں نہیں چھوڑے گی۔کیونکہ ان کا بیٹا پہلے سالن چکھنا چاہتا تھا۔بیٹی ایک بار بے آبروئی کا زخم کھا چکی ہے۔اب وہ اس کی پھوپھی پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بلقیس نے پوچھا۔''کیا سوچ رہی ہو؟''

وہ بولی۔

''پارو آپ کی بیٹی ہے۔آپ کی ہونے والی بہو ہے۔مگر اسے یہاں چھوڑ کر جاؤں گی تو وہاں تنہا رہ جاؤں گی۔دن رات کپڑے سلائی کرتی ہوں اور وہ پورا گھر سنبھالتی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔مگر وہ تمہارے پاس میری امانت ہے۔''

یہ بات تو پکی تھی کہ بلقیس پارو کو دل و جان سے اپنی بہو بنانا چاہتی تھی۔گھر کی بچی تھی۔یہ فکر نہیں تھی کہ اسے پانچ برسوں تک بٹھائے رکھنا ہوگا۔

فکر تو سلطانی بیگم کو تھی۔وہ بلقیس آپا سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ چوروں نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے۔کل ایک چور آیا تھا۔دوسرے تیسرے دن دوسرے تیسرے آ سکتے تھے، وہ بیٹی کو دن رات اپنے آنچل میں چھپا کر نہیں رکھ سکے گی۔

بلقیس لاکھ اپنی سہی لیکن اسے یہ معلوم ہوتا کہ ہونے والی بہو داغدار ہے تو وہ اپنی بات سے پھر جاتی۔بیٹے کے آگے جھوٹی پلیٹ کبھی نہ رکھتی۔

وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔یوں تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے؟مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ بیٹی کو پانچ برس تک اپنے ہی آنچل میں چھپا کر رکھنا ہے۔

اس نے سوچا۔

''ابھی تو پارو کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔جب سرتاج اعلیٰ تعلیم کے لئے سمندر پار چلا جائے گا' تب بیٹی کو یہاں لا کر چھوڑ دوں گی۔پھر مجھے چوروں اور بدمعاشوں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔''

اس نے دوسرے دن بلقیس سے کہا۔''آپا!میں کل جا رہی ہوں۔بنے وہاں اکیلا ہے۔اسے کھانے پینے کی تکلیف ہو رہی ہوگی۔اب میں چالیسویں میں پارو کو لے کر آؤں گی۔''

بلقیس نے کہا۔''ہاں اپنا گھر خالی نہیں چھوڑنا چاہئے۔سنا ہے' بنّے کبھی دن کی اور کبھی رات کی ڈیوٹی کرتا ہے، وہاں اکیلا ہے۔اسے ڈھابے کا کھانا نہیں کھانا چاہئے۔''

سلطانی بیگم وہاں ایک دن بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ہونے والا داماد اس کی بیٹی سے تنہائی میں ملنے کی فرمائش کر چکا تھا۔وہ داماد کو نہ تو برا کہہ سکتی تھی' نہ کسی طرح کی شکایت کر سکتی تھی۔اس کے سمندر پار جانے تک پارو کو وہاں سے دور ہی رکھنا تھا۔

وہ دوسری صبح کی ٹرین سے بیٹی کو لے کر واپس آ گئی۔ بنے نے کہا۔ ''آپ نے چٹھی میں لکھا تھا' بلقیس آپا بیوہ ہو گئی ہیں۔ تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہاں بات نہیں بنے گی۔''

''بات بن چکی ہے۔ مگر سرتاج اعلیٰ تعلیم کے لئے سمندر پار جا رہا ہے۔ وہاں پانچ برسوں تک ڈاکٹر بننے کی ڈگریاں لیتا رہے گا۔ اس کے بعد آپا پارو کو بہو بنا کر یہاں سے لے جائیں گی۔''

''پانچ برس تو بہت ہوتے ہیں۔ پارو کے ساتھ جو ہو چکا ہے' اس کے بعد اسے زیادہ دنوں تک بٹھائے رکھنا مناسب نہیں ہے۔''

''میرا دل بھی نہیں مانتا۔ مگر کیا کروں؟ اسی کے لئے سوچ رہی ہوں۔ وہ پھوپھی کے ہاں بہت خوش رہے گی۔ یہ بتاؤ' محبوب علی پھر ادھر آیا تو نہیں تھا؟''

بنے چپ رہا۔ سر جھکائے سوچتا رہا۔ سلطانی بیگم نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟''

وہ سر اٹھا کر بولا۔ ''آپا! ہم محبوب علی کو غلط سمجھ رہے تھے۔ میں نے بھٹی کے مالک دھن راج سے پوچھا تھا کہ شنیوار کی رات محبوب علی کہاں تھا؟ اس نے بتایا کہ اس رات دھڑاکے سے بارش ہو رہی تھی اور وہ بھٹی کے باہر بیٹھا خوب پی رہا تھا۔ اس نے اتنی پی لی تھی کہ بیہوش ہو گیا تھا۔''

اس نے کمرے کی طرف دیکھا۔ جہاں پارو گئی تھی۔ پھر کہا۔ ''جو بیہوش ہو گیا تھا' وہ بھلا یہاں کیسے آ سکتا تھا؟ دھن راج اسے بگھی میں ڈال کر حویلی لے گیا تھا۔ صبح پانچ بجے تک اس کے پاس ہی رہا تھا۔ بھٹی میں دوسرے پینے والوں نے بھی اس بات کی گواہی دی ہے۔''

سلطانی بیگم نے کہا۔

''جب اس نے کلام پاک سر پر رکھ کر کہا تھا' تب ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور تب سے کبھی کبھی میرا دماغ یہ سوچ کر الجھتا ہے کہ اس رات کون یہاں آیا تھا؟''

''میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اس گاؤں میں ہمارا کوئی ایسا دشمن نہیں ہے

جو ہماری عزت پر حملہ کرے۔ لگتا ہے' شہر سے کوئی بدمعاش آیا ہو گا۔''

''پھر تو وہ بدمعاش یہ اچھی طرح جانتا ہو گا کہ ہماری پارو بہت خوبصورت ہے اور اس گھر میں ہم ماں بیٹی اکیلی ہیں۔ تم فلم دیکھنے شہر گئے ہو؟ یہاں آنے والے نے پہلے تمام معلومات حاصل کی ہوں گی۔''

''مگر آپا! کسی کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں شہر جا رہا ہوں تو فلم دیکھ کر واپس آؤں گا؟''

سلطانی بیگم نے اسے تھوڑی دیر تک سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔

''کیا تم نے کسی کو بتایا تھا کہ فلم دیکھنے جا رہے ہو؟''

پہلے تو اس نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر چونک کر کہا۔ ''ہاں۔ میں نے منصور سے کہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ فلم دیکھنے چلے۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔''

''چندا کی ماں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ منصور ہماری پارو کو چاہتا ہے۔ مگر اس کا باپ کسی امیر کبیر کی بیٹی کو بہو بنا کر لانے والا ہے۔ اب میں دیکھ رہی ہوں' پارو اس کے دل سے نہیں گئی ہے۔''

وہ ذرا چپ ہو کر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''جب ہم بریلی جانے کے لئے یہاں سے رامپور جا رہے تھے تو وہ ہمارے تانگے کے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔ اب اس کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ذرا ٹھہرو مجھے اور سوچنے دو۔''

وہ بہن کا منہ تکنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی اور کبھی کبھی ہاں کے انداز میں سر ہلا رہی تھی۔ پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔ ''اس نے پارو کے نام سے صدقہ دینے والی بات چھیڑی تھی۔ میں نے کہا تھا' ہاں میں نے منت مانی تھی۔ مگر بھول گئی تھی۔ تب اس نے کہا تھا' منت پوری نہ کی جائے تو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''کیا وہ جانتا ہے کہ ہم پر مصیبت نازل ہو چکی ہے؟ اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم پر کیا گزر چکی ہے؟''

''آپا! مجھے بھی بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ اس روز وہ بار بار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں پریشان دکھائی دے رہا ہوں اور اس سے کوئی بات چھپا رہا ہوں۔ وہ پہلے کبھی اس طرح ہماری ٹوہ میں نہیں رہتا تھا۔''

سلطانی بیگم نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے' اس رات جو کچھ ہوا۔ کسی طرح اس کی سن گن اسے مل گئی ہے۔''

وہ بولا۔ ''بدنامی کو جتنا دباؤ' وہ سرنگ بنا کر باہر نکل آتی ہے۔ ہم بات چھپا رہے ہیں اور اپنا بھید خود کھولتے جا رہے ہیں۔ آپ نے محبوب کی حویلی میں جا کر اسے الزام دیا تو یہ بات اسے معلوم ہوگئی کہ ہماری پارو کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ منصور کی حرکتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اندر کی بات جاننے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔''

وہ دونوں سر جھکا کر سوچنے لگے۔ بدنامی کو پر لگتے دکھائی دے رہے تھے۔

یہ بات محبوب علی کو بھی الجھا رہی تھی کہ اس رات دارُو پی کر کون پارو کے گھر میں گھسا تھا؟ وہ سوچ رہا تھا۔ ''سلطانی خالہ کو ہم پر شبہ تھا۔ کیونکہ ہم دارُو پیتے ہیں۔ مگر ہم نے کلام پاک سر پر رکھ کر اپنی صفائی پیش کی ہے۔ پتہ نہیں وہ ہماری بے گناہی کا یقین کرتی بھی ہیں یا نہیں؟''

اس کا دل پارو پر اٹکا ہوا تھا۔ یہ بات صدمہ پہنچا رہی تھی کہ کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچتا تھا اور قسمیں کھاتا تھا کہ کبھی اس شیطان کا پتہ ٹھکانہ معلوم ہوگا تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

وہ برگد کے گھنے سائے میں ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ماں بیٹی بریلی سے واپس آ گئی ہیں۔ اس کا دل اُدھر کھنچا جا رہا تھا۔ دعائیں مانگ رہا تھا کہ سلطانی خالہ کو اس کی بے گناہی کا یقین آ جائے اور وہ اسے اپنے گھر بلائے۔ پہلے کی طرح محبت اور اپنائیت پیدا ہو جائے۔ مگر ایسی دعا قبول ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دھن راج بگھی میں آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر بگھی سے اتر کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت خُش نصیب ہوں۔ آپ نے مجھے بلانے کے لئے یہ بگھی بھیجی ہے۔''

محبوب علی نے کہا۔ ''آؤ۔ یہاں ہمارے پاس بیٹھو۔''

وہ پاس آ کر ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ محبوب علی نے پوچھا۔ ''اگر ہم تمہیں کسی بات کا بھیدی بنانا چاہیں تو وہ بھید تمہارے اندر رہے گا؟ کسی کو بولو گے تو نہیں؟''

"آپ ایک بار مجھ پر بھروسہ کریں مالک! یہ جبان کسی سے کچھ بولے گی تو اسے کاٹ کر پھینک دوں گا۔ آپ کی دیا سے میری بھٹی خوب چل رہی ہے۔ پولیس والے پریشان نہیں کرتے ہیں۔ میں تو آپ کے کسی نہ کسی کام آنے کا بہانہ ڈھونڈتا رہتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "تمہاری بھٹی میں آس پاس کے گاؤں سے بھی پینے والے آتے ہیں۔ تم ان سب کو اچھی طرح جانتے ہو۔ کیا ان میں کوئی ایسا ہے' جو چوری ڈکیتی کی واردات کرتا ہو اور کسی کے گھر میں گھس جاتا ہو؟"

وہ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔ "نہیں۔ ایسا کوئی نہیں ہے۔ سارے ہی گریب کھیت مجدور اور مل مجدور یہاں آتے ہیں۔ دال روٹی سے پیسہ بچا کر پیتے ہیں۔ اپنا دکھ اور اپنی تھکن دور کرتے ہیں۔ ویسے بات کیا ہے مالک! آپ کھل کر بولیں۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔"

"کھل کر بولنا ضروری نہیں ہے۔ مگر ہاں۔ تم پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم اتنا کہتے ہیں کہ جس رات بہت زیادہ پی کر بیہوش ہوگئے تھے۔ اس رات ایک شرابی ہمارے ناگ پارا کے ایک گھر میں گھس آیا تھا۔ اس نے کیا چرایا؟ کیسی لوٹ مار کی؟ یہ نہ پوچھو۔ یہ سوچو' سمجھو اور ہمیں سمجھاؤ کہ ایسی واردات کون کرسکتا ہے؟"

"یہ آپ بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں۔ ہمارے ناگ پارا کے کسی گھر میں کوئی بدمعاش گھس گیا اور ہمیں کھبر تک نہ ہوئی۔ گھر والوں نے بھی چیخ پکار نہیں کی؟"

"وہ مجبور ہیں۔ بدنامی سے بچنے کے لئے اور اپنی عزت رکھنے کے لئے چپ ہیں۔ تم ان گھر والوں کی بات نہ کرو۔ صرف یہ سمجھو کہ وہاں جو بھی گیا تھا' دارو پی کر گیا تھا۔ وہ تمہاری بھٹی سے ہی پی کر نکلا ہوگا۔"

دھن راج سر تھام کر سوچنے لگا۔ محبوب علی نے پوچھا۔ "تمہارے ایسے گاہک بھی ہوں گے جو وہاں بیٹھ کر پیتے نہ ہوں۔ بوتل خرید کر لے جاتے ہوں۔ اس رات ایسے کتنے پینے والے تھے' جو بوتل خرید کر گھر لے گئے تھے؟"

وہ ایکدم سے چونک کر بولا۔ "منصور....."

محبوب علی نے جلدی سے پوچھا۔ "کون منصور؟ کیا مقبول بکرے والے کا

بیٹا....؟"

"ہاں۔ وہی آیا تھا اور ایک بوتل کھرید کر لے گیا تھا۔"

"مگر وہ تو کبھی پیتا نہیں ہے؟"

"یہی بات میں نے اس سے پوچھی تھی' تم تو پیتے نہیں ہو۔ پھر آج بوتل لینے کیسے آگئے؟ اس نے رکھائی سے جواب دیا' کیا تم بھی بوتل کھریدنے والوں سے یہی پوچھتے ہو کہ وہ پیتے ہیں یا نہیں؟ تم مال بیچنے سے مطلب رکھو۔ میں بوتل لے جا کر نالی میں بہادوں گا۔ میری مرجی ہے' کچھ بھی کروں گا۔ کیا تم مجھے روکو گے؟"

محبوب نے کہا۔ "ہوں۔ وہ پیتا نہیں ہے اور بوتل خرید کر لے گیا تھا۔ اب تو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس نے بوتل کیوں خریدی تھی اور اسے کس مصرف میں لایا تھا؟"

وہ چبوترے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چلو دھن راج! ہم تمہیں گھر پہنچا دیں۔"

وہ بولا۔ "آپ کشٹ نہ کریں۔ میں ابھی گھر نہیں جاؤں گا۔ ادھر میرا اسسرال ہے۔ وہاں تھوڑا سمے بتاؤں گا۔"

محبوب نے اپنی بگھی میں آکر ملازم سے کہا۔ "تم چھٹی کرو۔ ابھی تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے گھوڑے کو لگام کا اشارہ دیا۔ وہ چل پڑا۔ دل تو پارو کی سمت جانا چاہتا تھا' یہ معلوم کرنے کی بے چینی تھی کہ اس کی طرف سے معشوق کا دل صاف ہوا ہے یا نہیں؟ لیکن منصور کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئی تھیں' وہ بہت اہم تھیں۔ اُلجھا رہی تھیں۔ یقین کی حد تک شبہ ہو رہا تھا کہ اسی نے اس رات شرمناک واردات کی ہوگی۔

اب وہ منصور کی جڑوں تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے گھر کی طرف بگھی لے جا رہا تھا۔ دھن راج نے ابھی جو کچھ کہا تھا' وہ ساری باتیں اس کے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ اس کے اندر تحریک پیدا کر رہی تھیں اور یہ یقین دلا رہی تھیں کہ وہ پارو کے مجرم تک پہنچ سکے گا۔

وہ گھوڑے کو لگام کے اشارے سے آگے بڑھا رہا تھا۔ جہاں سے گزر رہا تھا' لوگ اسے سلام کر رہے تھے۔ بیشتر ایسے بھی تھے' جو اس کی دولت اور نیک نامی سے

جلتے تھے۔اسے دیکھتے ہی ادھر اُدھر کترا جاتے تھے۔پیٹھ پیچھے اسے لنگور یا اور کالا کوا کہہ کر مذاق اڑاتے تھے۔

اس نے منصور کے دروازے پر پہنچ کر اسے آواز دی۔اس کی ماں بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی۔''بادل پھر گرج رہے ہیں۔پھر بارش ہوگی۔میں نے منع کیا تھا کہ شہر نہ جائے۔''

پھر اس نے محبوب علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔''ارے بیٹا!تم آئے ہو؟''

''ہاں چاچی!بس یونہی منصور سے ملنے آئے ہیں۔کہاں ہے وہ؟''

''اسی کو تو بڑبڑا رہی ہوں۔منع کرتی رہی۔مگر وہ شہر چلا گیا۔بے چارہ کرے بھی تو کیا؟رات کو باڑے میں سوتا ہے۔فلم دیکھنے کا شوق پورا نہیں ہوتا۔وہ..... دوپہر والی فلم کو کیا کہتے ہیں؟''

''میٹنی شو.....''

''ہاں۔وہی دیکھنے گیا ہے۔''

وہ اپنے ہاتھوں کو گیلے کپڑے سے پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''توبہ ہے۔یہ لال مرچیں تو آگ لگا دیتی ہیں۔بڑی جلن ہو رہی ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''کیا آپ لال مرچوں سے لڑائی کر رہی تھیں؟''

''نہیں میاں!اچار کا مسالہ کوٹ رہی تھی۔تم تو اچار بڑے شوق سے کھاتے ہوگے؟''

''نہیں۔کبھی کبھی چکھ لیتے ہیں۔''

''سنا ہے'زیادہ پینے والوں کا نشہ اتارنے کے لئے انہیں اچار چٹایا جاتا ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''ہاں۔ایسا کیا جاتا ہے۔''

''اور سنا ہے'ایک رات تم نے زیادہ پی لی تھی۔بیہوش ہوگئے تھے؟''

اس نے چونک کر پوچھا۔''آپ نے کس سے سنا ہے؟''

''اے میاں!پورا ناگ پارا جانتا ہے۔یہاں کوئی چھوٹی سی بات بھی ہو تو پلک جھپکتے ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔کبھی پینے کے بعد ادھر نہ آنا۔مجھے یہ زہر لگتی ہے۔خدا کا شکر ہے'میرے گھر کے مرد اِسے منہ نہیں لگاتے۔''

''کبھی بیٹے کا منہ سونگھ کر دیکھیں'پھر آپ یہ بڑا بول نہیں بولیں گی۔''

وہ ناگواری سے بولی۔''یہ کیا کہہ رہے ہو؟کس بیٹے کی بات کر رہے ہو؟''

''ہم آپ کے چھوٹے لاڈلے منصور کی بات کر رہے ہیں۔''

وہ وہاں سے جانے کے لئے بگھی کو موڑنے لگا۔ایک ماں یہ سن کر دہل گئی تھی کہ اس کا بیٹا پینے لگا ہے۔وہ گھوڑے کی لگام پکڑ کر اسے روکتے ہوئے بولی۔''تم جھوٹ بول رہے ہو۔میرا بیٹا نہ پان کھاتا ہے'نہ بیڑی پیتا ہے۔وہ داڑو جیسی بدبودار چیز کو منہ نہیں لگائے گا۔نشہ کرنے والے دور ہی سے پکڑے جاتے ہیں۔میں ماں ہوں۔وہ پینے کے بعد مجھ سے کبھی چھپ نہیں سکے گا۔''

''وہ مویشیوں کے باڑے میں رہتا ہے۔کیا آپ نے وہاں جا کر کبھی رات کے وقت بیٹے کو دیکھا ہے؟''

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔وہ رات کے وقت کبھی باڑے میں نہیں جاتی تھی۔گھوڑے کی لگام چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔مکان کے ایک طرف سے منصور کے باپ کی آواز سنائی دی۔''علی میاں!یہاں آ کر کیا بکواس کر رہے ہو؟''

محبوب نے کہا۔''السلام علیکم مقبول چاچا!اگر یہ بکواس ہے تو ہم آپ لوگوں کے دشمن ہیں۔ہماری بات سچ نکلے گی تو آپ مان لیں گے'ہم آپ کی بھلائی چاہتے ہیں۔آپ داڑو بیچنے والے دھن راج سے پوچھیں۔وہاں بیٹھ کر پینے والوں سے معلوم کریں۔آپ کا بیٹا وہاں سے بوتلیں خرید کر لے جاتا ہے۔''

وہ گھوڑے کو لگام کے اشارے سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔''جب سچ معلوم ہو جائے تو بیٹے سے یہ ضرور پوچھیں کہ وہ خود پیتا ہے'دوسروں کو پلاتا ہے یا پھر پینے کا ڈھونگ رچاتا ہے؟''

وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہوا ان کی نظروں سے دور چلا گیا۔مقبول نے اپنی بیوی کی طرف آتے ہوئے کہا۔''مجھے اس کی بات سچ لگتی ہے۔ہمارا وہ چھوٹو جوان ہے'نادان ہے۔میں ابھی جا کر دھن راج سے معلوم کرتا ہوں۔اگر وہ پیتا ہوگا تو ایسی پٹائی کروں گا کہ ساری داڑو ناک کے راستے نکل جائے گی۔''

''جوان بیٹا ہے۔اسے مارنے پیٹنے کی بات نہ کریں۔میں محبت سے سمجھاؤں

گی۔ پہلے آپ معلوم تو کریں' سچ کیا ہے؟''

وہ اسی وقت دھن راج کے پاس گیا۔ پھر اس سے بولا۔'' کیا میرا بیٹا یہاں سے دارُو خرید کر لے جاتا ہے؟''

اس نے کہا۔''ہمیشہ تو نہیں لے جاتا۔ مگر شنیوار کی رات دو روپے والی بڑی بوتل خرید کر لے گیا تھا۔''

منصور کی شامت آگئی تھی۔ وہ رات آٹھ بجے واپس آیا تو باپ اس پر چڑھ دوڑا۔'' ابے او شرابی کبابی! ادھر آ۔ تُو کب سے پینے لگا ہے؟''

اس نے پہلے تو چونک کر ماں کو دیکھا، پھر باپ سے پوچھا۔'' مم میں ..... میں کیا پینے لگا ہوں؟ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟''

'' ادھر آ..... مجھے منہ سونگھنے دے۔''

اس نے منہ آگے بڑھایا تو ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ وہ ایکدم سے بھنا گیا۔ پیچھے ہٹ کر بولا۔'' کیوں مار رہے ہو؟''

'' کیا تُو نے دارُو کی بوتل نہیں خریدی تھی؟''

اس نے بڑی ڈھٹائی سے انکار کیا۔''نہیں خریدی تھی۔ باہر سے جھوٹ سن کر آ رہے ہو اور بیٹے پر ہاتھ اٹھا رہے ہو۔''

ماں نے کہا۔''یہاں محبوب علی آیا تھا' اس نے بتایا ہے کہ تم نے بوتل خریدی تھی۔''

باپ نے کہا۔'' دھن راج کہہ رہا تھا' اگر میں رات کو بھٹی میں آؤں گا تو وہ کئی پینے والوں سے گواہی دلوائے گا کہ تُو بوتل خرید کر لے گیا تھا۔ اب بول! کیا یہ سارے لوگ جھوٹ بول رہے ہیں؟''

وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔''ہاں۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔ نہ میں نے بوتل خریدی تھی' نہ میں پیتا ہوں۔''

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ باپ نے لکڑی اٹھا کر اس کی ٹانگ پر ماری وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔'' ابے! کہاں جاتا ہے؟ ساری دنیا جھوٹ نہیں بولے گی اور تُو سچ نہیں بولے گا تو تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باپ نے دوسری بار مارنا چاہا تو اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ زور لگا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوششیں کرنے لگا۔ جوان بیٹے نے لکڑی چھین لی۔ اسے ہولے سے دھکا دیا تو وہ ذرا پیچھے چلا گیا۔ لکڑی بیٹے کے ہاتھ میں تھی اور باپ نہتا تھا۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا۔'' کیا باپ کو مارے گا؟''

''نہیں۔ میں یہ دکھا رہا ہوں کہ ابا بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اب یہ سوچیں کہ جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھانا چاہئے یا نہیں؟''

اس نے باپ کے آگے جھک کر لکڑی اس کے قدموں کے پاس رکھ دی۔ پھر پیچھے ہٹ کر سر جھکا کر کہا۔'' ابا! مجھے مارو۔ میں اُف نہیں کروں گا۔''

ماں نے کہا۔'' اب تو آپ یقین کر لیں۔ ہمارا بیٹا دارُو خریدنے نہیں گیا تھا۔''

''نہیں اماں! میں نے بوتل خریدی تھی۔ مگر اسے منہ نہیں لگایا تھا۔''

باپ نے پوچھا۔'' تو پھر کس لئے خریدی تھی؟''

اس رات چار بکرے بہت شور مچا رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا بات تھی؟ چپ نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں دارو پلا کر ٹُن کر دیا۔''

مقبول نے کہا۔'' تم گدھے ہو۔ تم نے بکروں کو دارُو پلائی ہے۔ پتہ بھی ہے' وہ بیمار ہوں گے تو کتنے پیسے خرچ ہوں گے؟ پھر تم نے بوتل خریدنے میں دو روپے برباد کئے۔ اتنی رقم میں پورے ایک ہفتے تک گھر کا چولہا جلتا ہے۔ کیا تم میری محنت کی کمائی اسی طرح برباد کر رہے ہو؟''

ماں نے کہا۔'' اب جانے بھی دیں۔ بیٹا سچ بول رہا ہے۔ اسے معاف کر دیں۔''

باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔'' ٹھیک ہے۔ اب میں رات کو باڑے میں آ کر دیکھا کروں گا کہ یہ کرتا کیا ہے؟''

منصور نے کسی طرح بات بنائی' بن گئی۔ مگر یہ فکر لاحق ہو گئی کہ دارُو کی بھٹی سے بوتل خرید کر لے جانے والی بات پھیل رہی ہے۔ اس نے سوچا۔'' یہ بات محبوب علی پھیلا رہا ہے۔ اس نے یہاں آ کر میری اماں اور ابا کو بھڑکایا ہے۔ دھن راج اس کا پینے پلانے والا ساتھی ہے۔ وہ بھی اس بات کو اچھال رہا ہے۔ کیا یہ لوگ پارو کے

معاملے میں مجھ پر شبہ کر رہے ہیں؟"

وہ پریشان ہو رہا تھا۔مگر خود کو سمجھا رہا تھا۔"ان کے شبہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

اس نے گھر سے نکل کر باڑے کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔"ہائے! سنا ہے پارو واپس آگئی ہے۔میں کیا کروں؟ کس طرح اسے دیکھوں؟ سوچا تھا' کسی بھی طرح اسے دوبارہ حاصل کروں گا۔مگر میرے دشمن پیدا ہو رہے ہیں۔اب مجھے بہت سنبھل کر رہنا ہوگا۔"

گناہ بڑی تیز رفتاری سے ہوتا ہے۔لیکن اس کی پکڑ بہت ہی دھیمی رفتار سے ہوا کرتی ہے۔ایسے وقت گناہ گار سمجھ نہیں پاتا کہ کس طرح اس کے اطراف گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے؟

منصور خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا.... ہاں نہیں تھا۔نہ ہونے کے باوجود شامت بہت ہی دھیمی رفتار سے آتی رہتی ہے۔جب پانی سر سے گزر جاتا ہے' تب بات سمجھ میں آتی ہے۔

جس طرح بڑے لوگ اپنی حفاظت کے لئے تگڑے ملازموں کی ایک چھوٹی سی فوج رکھتے ہیں، اسی طرح محبوب علی نے ایک درجن سے زیادہ پہلوان پال رکھے تھے۔حویلی کے پیچھے ایک بہت بڑا اکھاڑہ تھا۔وہاں وہ پہلوان ورزش کرتے تھے اور کشتیاں لڑتے رہتے تھے۔

وہ ایک چارپائی پر بیٹھا دو پہلوانوں کو لڑتے اور داؤ پیچ استعمال کرتے دیکھ رہا تھا۔نظریں ان پر تھیں مگر دھیان پارو کی طرف لگا ہوا تھا۔یہ بات چبھتی رہتی تھی۔یہ سوال پتھر مارتا رہتا تھا کہ کون اس کے کنوارے پن کو نوچ کھسوٹ کر لے گیا ہے؟

سراغ تو مل رہا تھا۔ثبوت نہیں مل رہا تھا۔اگر مل بھی جاتا تو گناہگار کا گریبان پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔ایسا کرنے سے پارو کا پھٹا ہوا آنچل گھر کی چوکھٹ سے باہر آ جاتا۔پھر ناگ پارا کی ساری عورتوں' مردوں' بوڑھوں اور بچوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟

وہ خیالات سے چونک گیا۔ایک پہلوان قریب آ کر ہاتھ جوڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"مالک! آج کل آپ اکھاڑے میں نہیں اتر رہے ہیں؟ کیا لنگوٹ اتار دی ہے؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔"نہیں اتاری ہے۔اور کس کے باندھنے والے ہیں۔مقابلہ سخت ہے مگر کس سے ہے' یہ ابھی معلوم نہیں ہو رہا ہے۔"

"مالک! آپ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"ہم بھی اسے پوری طرح سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔تم ہمارے معاملے میں نہ الجھو۔اکھاڑے میں جاؤ۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر وہاں سے ہٹ گیا۔بنے سائیکل چلاتا آ رہا تھا۔اسے دیکھتے ہی محبوب علی نے چارپائی سے اٹھ کر کہا۔"بنے ماموں! آپ ادھر کیسے چلے آئے؟ ہمیں بہت خوشی ہو رہی ہے۔آئیں، یہاں بیٹھیں۔"

وہ سائیکل کو دیوار سے ٹکا کر چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔پھر بولا۔"میں تم سے عمر میں بڑا ہوں۔پھر بھی تمہارے آگے شرمندہ ہوں۔"

محبوب علی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ایسا کہہ کر ہمیں کیوں شرمندہ کر رہے ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔اس روز تم نے کلام پاک سر پر رکھ کر اپنی صفائی پیش کی تھی۔پھر بھی میرا دل صاف نہیں ہوا تھا۔آپا کہہ رہی تھیں کہ تم بے قصور ہو۔میں نہیں مان رہا تھا' مگر اب مان رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔"بنے ماموں! ہمیں آپ کی بات سن کر کتنی خوشی ہو رہی ہے' یہ بول نہیں سکتے۔اب تو آپ لوگ ہم سے نفرت نہیں کریں گے؟ پہلے کی طرح ہمیں اپنا سمجھتے رہیں گے؟"

"بیشک۔تم ہمارے اپنوں کی طرح ہو مگر ابھی ہمارے گھر نہ آنا۔میں پہلے یہ گتھی سلجھانا چاہتا ہوں کہ ہم سے کس نے دشمنی کی ہے؟ کیوں کی ہے؟"

"جس نے بھی کی ہے' اس کا سراغ مل رہا ہے، مگر ثبوت نہیں مل رہا۔"

"مجھے بھی کسی حد تک سراغ مل رہا ہے۔کیا تمہیں کسی پر شبہ ہے؟"

"ہاں۔ہمیں منصور پر شبہ ہے۔"

بنے نے اس کی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔"یہ ہوئی ناں بات.... مجھے بھی

اسی کم بخت پر شبہ ہے۔ ناگ پارا کے کتنے ہی لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ پیتا نہیں ہے۔ مگر ایک رات بوتل خرید کر لے گیا تھا۔''

''یہی بات ہمیں بھی کھٹک رہی ہے۔ ہم نے مقبول چاچا سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس رات بکرے بہت شور مچا رہے تھے۔ منصور نے انہیں دارو پلا کر چپ کرایا تھا۔''

''وہ بکواس کر رہا ہے۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ بکروں کو شراب پلائی جاتی ہے۔''

وہ دونوں چپ رہے' سوچتے رہے۔ پھر بنّے نے کہا۔ ''اس رات میں نے منصور سے کہا تھا کہ فلم دیکھنے جا رہا ہوں' وہ بھی میرے ساتھ چلے۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح اسے معلوم ہو گیا کہ میں آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آؤں گا۔ ماں بیٹی گھر میں اکیلی ہوں گی اور وہ اپنے شیطانی ارادوں میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''ہاں۔ پہلے اس نے ہر طرف سے اپنی سلامتی کا یقین کیا ہے۔ تب ایسا کیا ہے، ہم اس کی گردن دبوچ کر اقبال جرم نہیں کرا سکیں گے۔''

''ایسا کرنے سے بدنامی ہماری ہی ہو گی۔''

محبوب علی نے کہا۔ ''ہم کچھ ایسا کریں گے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اسے تو ہم چھوڑیں گے نہیں.... قبر تک دوڑائیں گے۔''

بنّے نے کہا۔ ''تم جتنا ٹھنڈا دماغ رکھتے ہو' اُتنے ہی غصے والے بھی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی طرح کا خون خرابہ ہو۔''

''ہم بھی نہیں چاہتے۔ مگر اسے پارو کے قدموں میں لا کر گرانا چاہتے ہیں۔''

''ایسا کرو گے تو کیا یہاں کے لوگ یہ تماشہ نہیں دیکھیں گے؟ ہماری بدنامی نہیں ہو گی؟''

''نہیں ہو گی' ہم کسی بھی طرح کچھ ایسا کریں گے کہ پارو کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔''

سامنے کچھ فاصلے پر کتنے ہی پہلوان مختلف اکھاڑوں میں کشتیاں لڑ رہے تھے

اور ورزش کر رہے تھے۔ محبوب علی انہیں سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

❀✪❀

آسمان جیسے چھلنی ہو گیا تھا۔ بارش شروع ہوتی تھی تو رُکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ایسے وقت بھی کاروبار رُکتا نہیں ہے۔ کمائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ منصور بیس بکرے اور بکریاں لے کر مویشی منڈی گیا تھا۔ باپ نے کہا تھا' جتنے بھی جانور فروخت ہوں، ان کے پیسے صدری میں چھپا کر رکھنا اور وہاں دو دن سے زیادہ نہ رہنا۔

رامپور کی مویشی منڈی وہاں سے چھ کوس پر تھی۔ وہ جانوروں کو ایک لکڑی سے ہانکتا ہوا پیدل وہاں تک گیا۔ بارش کی وجہ سے کاروبار بہت مندا تھا۔ گاہک بہت کم آ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے دو دنوں میں بارہ جانور فروخت کئے۔ باقی آٹھ جانوروں کو ہانکتا ہوا واپس آنے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا' آسمان پر بادل کالے تھے۔ زمین پر رات کالی ہو گئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی لالٹین تھی، دوسرے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ وہ جانوروں کو ہانکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ رامیشور کی سمادھی کے پاس اچانک ہی دو افراد اس کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے دھوتی اور صدری پہنی ہوئی تھیں۔ سر سے شانوں تک پگڑی کو ایسے لپیٹ رکھا تھا کہ صورت سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔

منصور نے بھی قمیص کے اندر صدری پہن رکھی تھی اور اس کی جیب میں اچھی خاصی رقم چھپی ہوئی تھی۔ وہ خوف سے ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ کسی نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی۔ جو سامنے تھے' وہ دبلے پتلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر گردن دبوچنے والا بہت ہی تگڑا تھا۔

وہ خود کو چھڑانے کی کوششیں کر رہا تھا، مگر ناکام ہو رہا تھا۔ پھر ایک اور تگڑے شخص نے آ کر اس کی دونوں کلائیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گردن دبی ہوئی تھی۔ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ وہ منہ کھول کر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ایسے وقت ایک اور شخص نے سامنے آ کر دارو کی بوتل اس کے منہ میں گھسا دی۔

دارو اس کے حلق تک پہنچ رہی تھی۔ وہ نگلنا نہیں چاہتا تھا۔ پلانے والے نے

اس کی ناک ایک چٹکی میں دبائی تو وہ تڑپ کر منہ سے سانسیں لینے لگا۔یوں سانس لینے کے لئے داڑو نگلنے لگا۔

اسے چیخنے چلانے کا بھی موقع نہیں مل رہا تھا۔اس کی ناک چھوڑ دی گئی تھی۔وہ سانسیں لے رہا تھا۔لیکن بوتل منہ سے نکالی نہیں گئی تھی۔وہ پہلے کی طرح پینے سے انکار کر رہا تھا۔لہٰذا پھر اس کی ناک بند کر دی گئی۔

یہ عمل دو چار بار دہرایا گیا۔اچھی خاصی شراب اس کے اندر پہنچ گئی۔پھر وہ اسے اٹھا کر سڑک سے دور سمادھی کے پاس لے آئے۔اس کا سر چکرا رہا تھا۔اس نے پہلے کبھی نشے کو منہ نہیں لگایا تھا۔جتنی دارو اندر پہنچ گئی تھی، وہ کھوپڑی گھما دینے کے لئے کافی تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔وہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔اس نے نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے پوچھا۔"کیوں مجھ پر ایسا ظلم کر رہے ہو؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

وہ سب جیسے گونگے تھے، کچھ نہیں بول رہے تھے۔داڑو کی بوتل پھر اس کے منہ کے پاس لائی گئی۔وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔"مجھے نہ پلاؤ۔کیا مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟ بھائیو! مجھے مار کر کچھ نہیں ملے گا۔میری صدری میں آٹھ سو بیس روپے ہیں۔یہ سب لے لو۔مجھے جانے دو۔"

وہ بوتل پھر اس کے منہ میں گھسا دی گئی۔یہ دیکھ چکا تھا کہ پینے سے انکار کرتا تھا تو ناک بند کر دی جاتی تھی۔ایسے میں دم نکلنے لگتا تھا۔وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک گھونٹ پینے لگا۔

ایسے وقت اسے اپنے پیچھے ایک بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی۔کوئی کہہ رہا تھا۔"بولو...! میں پیتا نہیں پر شرابی ہوں۔"

اس کا سر گھوم رہا تھا۔وہ ہانپتے ہوئے بولا۔"میں پیتا نہیں پر شرابی ہوں۔"

پھر وہی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی۔"میں سادھو سنت نہیں ہوں۔ پاپی ہوں۔ میں پاپی ہوں۔"

اس نے یہی بات دہرائی، اس کے منہ سے پھر بوتل لگا دی گئی۔وہ لوگ انتہا کر

چکے تھے۔کبھی نہ پینے والا اتنی دارو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔وہ مدہوش ہو گیا۔اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی۔وہ لوگ پھر اسے اٹھا کر سڑک کے کنارے لے آئے۔وہاں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔لالٹین بجھ گئی تھی۔اسے دوبارہ روشن کر کے اس کے پاس رکھ دیا گیا۔وہ تعداد میں پانچ تھے۔ان میں سے دو افراد کے لباس سے دارو کی بو آ رہی تھی۔کیونکہ وہی منصور کو پلاتے رہے تھے۔

انہوں نے اپنے دبلے پتلے دو ساتھیوں سے کہا۔"ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔دور اندھیرے میں چھپ کر دیکھتے رہیں گے۔"

ایک نے کہا۔"ٹھیک ہے، تم سب جاؤ۔آگے یہاں جو ہوتا رہے گا، دور سے دیکھتے رہو۔"

وہ تینوں وہاں سے جاتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گئے۔وہ سڑک رات کے وقت سنسان رہتی تھی۔اِکا دُکا تانگا چلانے والے یا سائیکل چلانے والے سنیما کا آخری شو ختم ہونے کے بعد وہاں سے گزرتے تھے۔آدھے گھنٹے بعد ہی ایک تانگا دور سے آتا دکھائی دیا۔انہوں نے چھوٹی سی لالٹین اٹھا کر اسے لہراتے ہوئے آواز دی۔"اے بھائی! رک جاؤ۔یہاں ایک شرابی بیہوش پڑا ہے۔"

تانگے والا چار سواریاں لے جا رہا تھا۔وہاں آ کر رک گیا۔اس نے لالٹین کی روشنی میں منصور کو دیکھتے ہوئے کہا۔"ارے یہ تو مقبول بکرے والے کا بیٹا ہے۔"

ایک نے لالٹین زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔"ہم ادھر سمادھی میں دیا جلانے آئے تھے تو اسے اس حال میں دیکھا۔اس کے نجدیک نہیں گئے۔جندہ تو لگتا ہے۔پر کسی گھڑی مر بھی سکتا ہے۔اے بھائی! نیکی کماؤ اور اسے گھر پہنچا دو۔"

تانگے کے پچھلے حصے سے دو آدمی اتر گئے۔ان کی خالی جگہ منصور کو اٹھا کر ڈالا گیا۔تانگے میں سب ہی کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔اسی لئے گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے باقی لوگ پیدل چلنے لگے۔وہ دونوں حملہ کرنے والے اس لئے ساتھ رہے کہ کوئی منصور کی صدری سے رقم نہ نکالے۔انہوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اسے باپ کے پاس پہنچا دیا۔

ماں بیٹے کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔باپ دارو کی بو سے بھڑک گیا تھا۔غصے

سے گرج رہا تھا۔ بیٹے کو گالیاں دے رہا تھا۔ بڑا بیٹا منظور بھی موجود تھا، اسے وہاں پہنچانے والے بتا رہے تھے کہ وہ رامیشور کی سمادھی کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کی گود میں داڑو کی خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

باپ نے فوراً ہی اس کے لباس کی تلاشی لی تو صدری کی جیب سے آٹھ سو بیس روپے برآمد ہوئے۔ اس کنجوس بیوپاری کو ایک ذرا اطمینان ہوا۔ اچھی خاصی رقم ہاتھ آئی تھی۔ ابھی اس شرابی بیٹے سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ اس نے کتنے جانور بیچے ہیں؟ کل اتنی ہی رقم ہے یا اس سے زیادہ رقم شہر میں لٹا کر آیا ہے؟

دوسرے دن اس کا نشہ اترا اور آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا۔ وہ گھر کی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ نگاہوں کے سامنے باپ تھا۔ اس کے ہاتھ میں چابک تھی۔ دوسری طرف بڑا بھائی ایک لانبی سے بید پکڑے کھڑا تھا۔

باپ نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''ابے کتے! اس روز جھوٹ بول کر ہمیں الّو بنایا تھا کہ بوتل خریدی تھی۔ مگر پی نہیں تھی۔ مگر اب تو تُو کھل کھلا کے سڑک کے کنارے بیٹھ کر پینے لگا ہے۔''

اس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ پچھلی رات جو ہوا تھا۔ وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ بستر پر کہنی ٹیکتے ہوئے بولا۔ ''ابا! میں نے دارو نہیں پی تھی۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی شڑاپ کی آواز کے ساتھ ہی چابک لگی۔ وہ تکلیف سے چیختے ہوئے بولا۔ ''کیوں مارتے ہو مجھے؟ پہلے میری بات تو سن لو۔''

ایک کمرے سے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لئے مجھے یہاں بند نہ کرو۔ بیٹے کے پاس آنے دو۔ وہ کل سے بیہوش پڑا تھا۔ اسے مارو گے تو مر جائے گا۔ میں بھی مر جاؤں گی۔ میں خدا رسول کا واسطہ دیتی ہوں، مجھے بیٹے کے پاس آنے دو۔''

باپ نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہم سے یہ نہ کہو کہ تم نے نہیں پی تھی۔ میں پینے کی بات پر بحث نہیں کروں گا۔ مجھے حساب دو کہ کتنے جانور بیچے؟ کتنی رقم حاصل کی؟ تمہاری صدری سے آٹھ سو بیس روپے نکلے ہیں اور یہ بیس بکروں کی قیمت نہیں ہے، بہت کم ہے۔''

وہ حساب بتانے لگا کہ بارہ جانور بیچے تھے۔ جن کے آٹھ سو چالیس روپے ملے تھے۔ وہاں دو دن رہنے اور کھانے میں بیس روپے خرچ ہو گئے۔

بڑے بھائی منظور نے پوچھا۔ ''باقی آٹھ جانور کہاں ہیں؟''

''آں....؟'' وہ پریشان ہو کر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ جب زبردستی اسے دارو پلائی جا رہی تھی، تب وہ آٹھ جانور ادھر ادھر چلے گئے ہوں گے۔

اس نے کہا۔ ''ابا! مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ میں نے پی نہیں ہے۔ مجھے زبردستی پلائی گئی ہے اور جن دشمنوں نے پلائی ہے، وہی ان جانوروں کو لے گئے ہیں۔''

بھائی اسے بید سے اور باپ چابک سے مارنے لگا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ منظور نے لات مار کر اسے چارپائی سے نیچے گرا دیا۔ وہ مار کھاتے ہوئے تکلیف سے چیخ رہا تھا۔ ادھر کمرے میں ماں دروازہ پیٹ رہی تھی۔ ایسا شور برپا ہو رہا تھا کہ باہر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ آوازیں دے رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''مقبول بھائی! بس کرو غصہ تھوک دو۔ باہر آ جاؤ۔ ہم نے سنا ہے، منصور نے رات بہت پی تھی۔ اس کی غلطی معاف کر دو۔''

دو چار عورتیں دروازہ پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''ہمیں اندر آنے دو۔ کیا بیٹے کو مار ڈالو گے؟''

مقبول نے دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے عورتوں اور مردوں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''وہ دارو پی کر ڈھیٹ بن گیا ہے۔ پینے کے بعد بھی کہتا ہے، نہیں پی ہے۔ جھوٹ بولتا ہے کہ دشمنوں نے اسے پلائی ہے۔ میں جانتا ہوں، اس کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ آپ اندر جائیں اور اس سے پوچھیں اگر وہ آٹھ جانور دشمن لے گئے تھے تو اس کی صدری سے نقد رقم کیوں نہیں لے گئے؟''

اس نے فضا میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے نوٹوں کی چھوٹی سی گڈی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ اتنی بڑی رقم چھوڑ کر صرف آٹھ جانور لے جائیں گے؟''

ایک شخص نے کہا۔ ''نہیں۔ چوری کرنے والے نادان نہیں ہو سکتے۔ وہ نقد رقم اپنی جیب میں چھپا کر لے جا سکتے ہیں۔ جانوروں کو کہیں چھپا نہیں سکتے۔ انہیں ڈر ہوگا کہ وہ کہیں بھی پکڑے جائیں گے۔''

کچھ عورتوں اور مردوں نے مکان کے اندر جا کر اس کی ماں کو کمرے سے نکالا۔ کچھ لوگوں نے اس کے باپ اور بھائی کو سمجھایا کہ اسے مارنے پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر پی رہا تھا' تب ہی جانور اس کے قابو سے باہر ہوگئے ہوں گے۔ ادھر ادھر چلے گئے ہوں گے۔ ہاتھ سے جانے والی چیز مشکل سے واپس ملتی ہے۔ جانور ہاتھ سے نکل گئے ہیں، صبر کرو، اتنی بڑی رقم مل گئی۔ خدا کا شکر ادا کرو اور بیٹے کو معاف کردو۔

اس روز ناگ پارا کے لوگ مقبول بکرے والے کے گھر جاتے آتے رہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں کوئی چھوٹی سی بات بھی ہوجاتی تھی تو اسے پہاڑ بنا دیا جاتا تھا۔ اس بات کو خوب پھیلایا جاتا تھا۔ منصور کی بات بھی عجیب تھی' بہت دلچسپ تھی' وہ پیتا تھا اور بدمست ہونے کے بعد کہتا تھا کہ نہیں پیتا ہے۔

وہ باپ اور بھائی سے اچھی طرح مار کھانے کے بعد چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ ماں گرم کپڑے کی پوٹلی سے اس کا بدن سینک رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے تکلیف سے کراہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں کن لوگوں نے اسے پلائی تھی؟ وہ چور اُچکے نہیں تھے۔ انہوں نے اس کی رقم نہیں چرائی تھی۔ مگر ناگ پارا کے رہنے والوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ شرابی ہے۔ پہلے چھپ چھپ کر پیتا ہوگا۔ اب سڑک پر بیٹھ کر پینے لگا ہے۔

وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر ایکدم سے چونک گیا۔ اسے یاد آیا کوئی اس کے کانوں میں بول رہا تھا۔ ''بولو..... میں پیتا نہیں ہوں پر شرابی ہوں۔ میں سادھو سنت نہیں ہوں۔ پاپی ہوں۔ میں پاپی ہوں۔''

ایکدم سے وہ گناہ آلود رات یاد آئی۔ وہ پیتا نہیں تھا۔ مگر شرابی بن گیا تھا۔ اس کے اندر یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ ''میں سادھو سنت نہیں ہوں۔ پاپی ہوں۔ میں پاپی ہوں۔''

اور پاپ اب بول رہا تھا اور پورے ناگ پارا میں بول رہا تھا۔ اگرچہ وہ پاپی کی حیثیت سے پکڑا نہیں گیا تھا۔ مگر پکڑا جاسکتا تھا۔ آگے چل کر کبھی کسی دن اس کی شامت آنے والی تھی۔

جو چاہو' وہ کر گزرو تو ایسے وقت غلطی سمجھ میں نہیں آتی۔ خوش فہمی سمجھاتی ہے کہ جب کوئی ثبوت نہیں ہے' کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے تو شامت کیسے آئے گی؟ مگر آنے والی آہی جاتی ہے..... گناہ خرگوش کی رفتار سے دوڑتا ہے۔ شامت دھیرے دھیرے کچھوے کی رفتار سے آتی ہے۔

❁✪❁

پارو خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ خوابوں میں آنے والے کتنے ہی شہزادے اس کے لئے آہیں بھرتے تھے۔ کوئی کہتا تھا۔ ''تمہارے حسن میں جو آن بان اور شان ہے' وہ کسی میں نہیں ہے۔''

کوئی کہتا تھا۔ ''تمہاری آنکھیں طلسماتی ہیں۔ یہ دیکھتی ہیں تو گھائل کردیتی ہیں اور مسکراتی ہیں تو مرہم رکھ دیتی ہیں۔''

''جانِ من! تمہاری اداؤں میں لڑکپن ہے اور جوانی کا بانکپن ہے۔ چلتی ہو تو غزل چھیڑتی چلی جاتی ہو۔ بس اپنی چال پر' اپنی رفتار پر دھیان رکھو۔ کسی ایسے ویسے کے ساتھ قدم سے قدم نہ ملانا۔ اپنا یہ شاداب وجود اس کے حوالے کرنا، جو تمہارے حسن کے شایانِ شان ہو۔ تمہارے آگے اپنی رفتار بھول جاتا ہو۔''

ایسا ہی کوئی خوبرو جوان اس کا آئیڈیل تھا۔ جس کے ساتھ تصویر کھینچی جائے تو دیکھنے والے تصویرِ حیرت بن جائیں۔ واہ واہ کریں کہ ایسی خوبصورت جوڑی بس دنیا میں یہی ایک ہے۔

اس نے ایسے خوبرو جوان کو کتنے ہی چاہنے والوں کی صورت میں دیکھا۔ لیکن وہ سب فلمی طرز کے عاشق تھے۔ ان کی باتوں سے' ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بارات لے کر نہیں آئیں گے۔ یوں ہی حسن کی سوغات چاہیں گے۔ اس کا پھوپھی زاد سرتاج حسین بھی پہلے سالن چکھنا چاہتا تھا۔

منصور بھی ایک خوبرو جوان تھا۔ مگر بالکل ہی گیا گزرا تھا۔ پہلے وہ اسے بزدل سمجھتی تھی۔ وہ باپ کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ مگر اب اپنی اماں اور بنے ماموں کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بزدل نہیں ہے' بہت ہی مکار شیطان ہے۔ اس رات وہی دارو پی کر آیا تھا۔

اس کے دل پر گھونسہ لگا تھا۔ جسے شایانِ شان سمجھ کر جیون ساتھی بنانا چاہتی تھی۔ وہ اسے حقیر بنا کر چلا گیا تھا۔ یہ جتلا کر گیا تھا کہ حسن کچھ نہیں ہوتا' صرف لوٹ کا مال ہوتا ہے۔

وہ اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ اس کے آئیڈیل شہزادوں میں ایک شہزادہ ایسی گالی دے کر گیا تھا' جو ساری عمر اس کے وجود سے چپک کر رہنے والی تھی۔ پہلے اس نے محبوب علی کو گناہ گار سمجھ کر اس میل خورے کو اپنے بدن سے رگڑ رگڑ کر دھو دینا چاہا تھا۔ مگر ہوتا کیا ہے؟ پانی سے اوپر کا میل صاف ہو جاتا ہے' اندر کا میل گالی بن کر رہ جاتا ہے۔ آبِ زم زم سے بھی نہیں دُھلتا۔

وہ غسل خانے سے نکل کر آنگن میں آئی تو سلطانی بیگم نے اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہو گئیں...؟''

ماں کا سوال سمجھ میں آ گیا۔ پھر بھی وہ انجان بن کر بولی۔ ''کیا پوچھ رہی ہیں؟''

''میں پوچھ رہی ہوں' کیا مہینے سے ہو گئیں؟''

''نہیں۔ ہو جاؤں گی۔''

وہ آنگن سے گزرتی ہوئی برآمدے میں آئی۔ ماں نے پوچھا۔ ''کب ہو جاؤ گی؟ تاریخ تو گزر چکی ہے۔''

''ہاں۔ مگر دو چار دن اِدھر اُدھر تو ہوتے ہی ہیں۔''

''دو چار دن نہیں' میں ایک ایک دن کا حساب کر رہی ہوں۔ یہ دوسرا ہفتہ گزر رہا ہے۔''

''پہلے تو حساب نہیں کرتی تھیں۔ اب کیوں کر رہی ہیں؟''

''جس رات وہ کتا یہاں آیا تھا' تب سے میرے دل میں ہول اٹھ رہے ہیں۔ ابھی تک یہ بات گھر کی چار دیواری میں ہے۔ تیرے وجود سے جھلکے گی تو پھر چھپائے نہیں چھپے گی۔''

پارو نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تو دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

وہ ماں کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ناگ پارا کے کتنے ہی بچے سلطانی

بیگم کے ہاتھوں پیدا ہو چکے تھے۔ بستی کے لوگ اسے دائی ماں بھی کہا کرتے تھے۔ یہ اس کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ محبت اور بڑے جذبے سے ماں بننے والی عورتوں کے دُکھ درد میں کام آیا کرتی تھی۔

پارو نے کہا۔ ''آپ کا تو تجربہ ہے۔ کیا ایسا کچھ سمجھ رہی ہیں؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''مجھے پہلے مہینے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں کی بوڑھی دائی مائیں معلوم کر لیتی ہوں گی۔ مگر کسی بھی دائی کو یہاں لاؤں گی تو اس کے پیٹ میں بات نہیں رہے گی۔''

''اماں! آپ نے تو مجھے فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔ معلوم تو ہو' میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ ہو رہا ہو یا نہ ہو رہا ہو۔ ہمیں پہلے سے محتاط رہنا چاہئے۔ میں ابھی ترکاری والے کے پاس جاتی ہوں۔ کچا پپیتا لے کر آتی ہوں۔ تمہیں بتاؤں گی کہ اسے کیسے کھانا ہے اور کتنا کھانا ہے؟''

وہ برآمدے سے اٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی باہر جانے لگی۔ ''اللہ نے چاہا تو یہ ناگہانی بلا چپ چاپ ٹل جائے گی۔ یا اللہ! ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ پھر یہ مصیبتیں ہم پر کیوں آ رہی ہیں؟ خدا اسے غارت کرے۔ دارُو اس کے لئے زہر بن جائے۔ وہ کل کا مرتا آج مر جائے۔''

وہ اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔''

دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ سلطانی بیگم کو تو جیسے پنکھے لگ گئے تھے۔ دل گھبرا رہا تھا کہ حمل ٹھہر گیا تو کیا ہو گا؟ نہیں... کچا پپیتا زود اثر علاج ہے۔ پیٹ خالی کر دے گا۔ توبہ ہے' بدنامی چھپ چھپا کر آنے کے لئے کیسے چور دروازے ڈھونڈ لیتی ہے؟

وہ دور تک سوچ رہی تھی۔ ''اگر یہ گھریلو ٹوٹکا کامیاب نہ ہوا تو کیا کروں گی؟ یہاں کی کسی دائی کو تو کبھی رازدار نہیں بناؤں گی۔ رامپور کے ہسپتال جاؤں گی تو کوئی بھی ڈاکٹر بچہ گرانے کے لئے راضی نہیں ہو گا۔

کوئی ڈاکٹر اسے بچے کی ہتھیا کہے گا' کوئی طرح طرح کے سوالات کرے گا۔

بچہ کس کا ہے؟ کب سے یہ پاپ ہورہا ہے؟ میں ایسے سوالوں کے جواب نہیں دے سکوں گی۔

میں کیا کروں؟ کیا مرجاؤں؟ یا منہ چھپانے کے لئے یہاں سے چلی جاؤں؟ جہاں بھی جاؤں گی' وہاں بیٹی کا پیٹ نہیں چھپے گا۔''

وہ چلتے وقت ہانپ رہی تھی۔ سانسیں بھاری ہورہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے عزت اور نیک نامی قائم رکھنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا تو دم نکل جائے گا۔

اس نے پپیتا لاکر بیٹی کو کھلایا اور کہا۔''مرغی کا پتلا شوربہ پیو۔ انڈے کھاؤ۔ زیادہ سے زیادہ گرم چیزیں کھاتی رہوگی تو مہینے سے ہوجاؤ گی۔''

پارو نے کہا۔''ہمیں چالیسویں میں جانا ہے۔ ایسی پریشانی میں کسی کے ہاں جانے کو جی نہیں کررہا ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ وہاں جاکر کیا حاصل ہوگا؟ بلقیس آپا سے کہا تھا کہ سرتاج سے تمہارا نکاح پڑھا دیں۔ جب وہ تعلیم پوری کرکے آئے گا تو رخصتی ہوجائے گی۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔''اصل بات تو رخصتی کی ہے۔ اگر ایک مہینے کے اندر نکاح ہوجائے' تم دلہن بن کر سرتاج کے پاس چلی جاؤ تو پردہ پڑ جائے گا۔ یہ ہونے والا بچہ اس کے نام ہوجائے گا اور اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ تم بچہ ساتھ لائی ہو۔''

''آپ کے ایسا سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ پھوپھی نے تو صاف کہہ دیا ہے' وہ پانچ برس کے بعد ہی مجھے یہاں سے لے جائیں گی۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھ کر رسوئی میں آگئی۔

منصور کے لئے دل سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی' جب بھی سامنا ہوگا تو اس کا منہ نوچ لے گی۔ اس پر تھوک دے گی۔ کیسی مجبوری تھی؟ ابھی تو اس کا تھوکا ہوا اپنے وجود سے نوچ کر باہر نہیں پھینک سکتی تھی؟

رات کو بیٹا گھر آیا تو سلطانی بیگم نے اسے نئی بپتا سنائی۔ وہ سنتے ہی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔''یہ کیا ہورہا ہے آپا....؟ ہم گھر سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ کسی کو منہ

نہیں دکھا سکیں گے۔''

وہ بولی۔''آرام سے بیٹھو۔ پریشان ہونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ آنسو بہانے سے مصیبتیں دور نہیں ہوتیں۔''

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔''آپ پریشان نہیں ہیں؟''

''اتنی پریشان ہوں کہ مرجانا چاہتی ہوں۔ لیکن مرنے کے بعد میری پارو کا کیا ہوگا؟ میری معصوم بچی بے قصور ماری جارہی ہے۔ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی' یہ ہم سوچ سکتے ہیں۔ مگر اس کا دکھ بانٹ نہیں سکتے۔''

''آپ نے تو کتنی ہی زچگیاں کرائی ہیں۔ آپ کو تجربہ ہے۔ کیا اس بچے کو ختم نہیں کیا جاسکتا؟''

''میں نے آج تک اپنے ہاتھوں سے بچے پیدا کرائے ہیں۔ یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ پیدا ہونے سے پہلے انہیں کیسے ختم کیا جاسکتا ہے؟ پھر بھی کوشش کررہی ہوں۔ جلد ہی معلوم ہوسکے گا کہ بچے سے نجات مل سکتی ہے یا نہیں؟''

''اگر نجات نہ مل سکی تو؟''

''یہی سوچ کر تو ٹوٹ جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے' کیا کروں؟ اپنی بچی کو کہاں لے جاکر چھپاؤں؟ ایسے وقت بس خدا ہی یاد آتا ہے۔ اب تو نمازیں پڑھوں گی اور دعائیں مانگتی رہوں گی۔''

اس نے بلقیس آپا کو چٹھی لکھی۔''میں بہت بیمار ہوں۔ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔ پارو میری تیمارداری میں لگی رہتی ہے۔ بہت مجبور ہوگئی ہوں۔ آپ کے پاس نہیں آسکوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں' طبیعت سنبھلتے ہی ضرور آؤں گی۔ سرتاج حسین کے لئے دعا مانگتی ہوں کہ وہ بہت بڑا ڈاکٹر بن جائے۔

فقط آپ کی بھاوج سلطانی بیگم...''

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ دو ماہ گزر گئے تو سلطانی بیگم کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ تمام گھریلو ٹوٹکے بے اثر ہوگئے تھے۔ پارو کو ابکائیاں آنے لگی تھیں۔ وہ کھٹا کھانے لگی تھی۔ ماں سر پکڑ کر رونے لگی۔ بیٹی بھی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی سسک رہی تھی۔

بھتنے برآمدے میں تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''آپا! میرے ہاتھوں پیروں سے جان نکل رہی ہے۔ میں باہر کیسے نکلوں گا؟ لوگوں سے کیسے نظریں ملا سکوں گا؟''

وہ بولی۔ ''نیک نامی کے ساتھ رہنے کا بس اب ایک ہی راستہ ہے۔ میں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا ہے۔ جب کوئی بات بن نہیں پائے گی' تب اس آخری راستے پر چلوں گی۔''

''کس آخری راستے پر آپا....؟''

''میں محبوب علی کے پاس ابھی جا کر بولوں گی کہ اسے داماد بنانا چاہتی ہوں تو وہ جھٹ سے راضی ہو جائے گا۔''

پارو ایک گوشے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دور بیٹھی ہوئی ماں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں کبھی اس بھتنے سے شادی نہیں کروں گی۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ رنگ کالا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اسے بھوت سمجھ لو۔ وہ کالا پیلا جیسا بھی ہے' ہمارے درد کی دوا بن سکتا ہے۔ تمہارے سر پر نیک نامی کی چادر بن کر رہ سکتا ہے۔''

''آپ سمجھتیں کیوں نہیں؟ میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ میں دن ہوں' وہ رات ہے۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے' گلے میں پھندہ ڈال کے مر جاؤں۔''

''مر جاؤ تو اچھا ہے۔ بدنامی تمہارے پیٹ میں رہ کر قبر میں سو جائے گی۔ پھر ہم دنیا والوں کو منہ دکھا سکیں گے۔ کچھ روز عزت سے جی سکیں گے۔''

پارو نے مر جانے کی دھمکی دی تھی، تاکہ ماں کا کلیجہ کانپ جائے اور وہ اسے ڈھول بنا کر محبوب علی کے گلے میں نہ لٹکائے۔ مگر زخم کھائی ہوئی ماں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مر ہی جائے۔

اور وہ موت سے ڈرتی تھی۔ پوری جوانی' پوری زندگانی جینا چاہتی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے ہی خنجر کی نوک پر اپنا کنوارا پن ہار چکی تھی۔

موجودہ حالات میں دو ہی راستے تھے کہ وہ مر جائے اور اس کے ساتھ بدنامی

بھی مٹی میں مل جائے۔ یا پھر محبوب علی کو قبول کر لے۔

وہ گھٹنوں میں منہ دے کر رونے لگی۔ جب وہ جبراً اس کی زندگی میں آ ہی رہا تھا تو اسے کیسے روکتی؟ حالات سے کیسے لڑتی؟

بہتر تھا کہ اپنا محاسبہ کرتی۔ اپنے رویے کا تجزیہ لازمی تھا کہ اس سے نفرت کیوں کرتی ہے؟

وہ چپ تھی۔ خود کو ٹٹول رہی تھی۔ تب معلوم ہوا کہ اس سے نفرت نہیں تھی' بیزاری تھی۔ وہ محبت سے طلبگار بن کر دیکھتا تھا تو وہ جل جاتی تھی۔ ناگواری سے سوچتی کہ اپنے جیسی لڑکی کو کیوں نہیں مانگتا؟ کبوتر' کبوتر کے ساتھ رہتا ہے۔ کوا' کوئے کے ساتھ اُڑتا ہے۔ اتنی سی بات اُس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟

وہ مان رہی تھی کہ محبوب علی سے نفرت نہیں ہے، تفرقہ ہے۔ بڑا فرق ہے۔ ایک چاندنی ہے' دوسرا اماوس کی کالی رات ہے۔ کوئی بھی نازک اندام ہو' وہ ململ پہنتی ہے۔ کھدر کبھی نہیں پہنتی۔

مگر جب حالات کی مار پڑے تو کیا کرے...؟

محبوب علی نے حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی چار دیواری بنوائی تھی۔ سامنے دیوار پر جلی حروف میں لکھوایا تھا۔ ''مسجد مصطفیٰ...''

ناگ پارا کے مسلمان وہاں نماز پڑھنے آتے تھے۔ اس نے نماز پڑھانے کے لئے مفلوک الحال مولانا وہاج الدین اجمیری کو پیش امام کے طور پر رکھا تھا۔ مولانا کو حویلی سے تین وقت کا کھانا ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ماہانہ دس روپے اور سال میں چار جوڑے دیئے جاتے تھے۔

بارش تھم گئی تھی۔ ہلکی سی دھوپ نکل آئی تھی۔ وہ مسجد کے سامنے کھڑا مولانا سے کہہ رہا تھا۔ ''اس چار دیواری کے ساتھ ایک چھوٹا سا مینار بن جائے گا تو یہ دور سے مسجد دکھائی دے گی۔ کوئی اسے کسی کا گھر نہیں سمجھے گا۔''

مولانا اجمیری نے کہا۔ ''میں ناگ پارا کے مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی تلقین کرتا رہتا ہوں۔ انہیں دینی باتیں سمجھاتا ہوں۔ آپ سے بھی گزارش کرتا ہوں' پانچوں وقت مسجد میں آیا کریں۔''

''ہم چاہتے ہیں، مگر زمینداری کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملتی۔ اتنا اطمینان ہے کہ ایک دو وقت کی نمازیں پڑھ لیا کرتے ہیں۔''

مولانا نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ایک بات نامناسب ہے' کیا میں کہہ سکتا ہوں؟''

''آپ بے جھجک کہہ سکتے ہیں۔''

''آپ مسلمان ہیں' آپ کو کانگریس پارٹی میں نہیں رہنا چاہئے۔''

''کیوں نہیں رہنا چاہئے؟ مولانا ابوالکلام آزاد اور بیشمار مسلمان کانگریس میں ہیں۔ کیا ہمارے اس پارٹی میں رہنے سے اسلام خطرے میں پڑ جائے گا؟''

''ہاں۔ آپ جیسے زمیندار اور بڑی ہستیاں ان کا ساتھ دیں گی تو ان کی طاقت بڑھے گی۔ پھر وہ پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ ایک اسلامی ریاست قائم نہیں ہو سکے گی اور نہیں ہو سکے گی تو اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض رہے گا۔ آپ کے دل کی مرادیں پوری نہیں کرے گا۔''

اس نے چونک کر مولانا کو دیکھا۔ پارو دھک سے دل میں آ کر لگی تھی۔ بس یہی ایک مراد تھی' جو پوری نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''مولانا! یہ کیا بات ہوئی؟ کیا ہم کانگریس پارٹی چھوڑ دیں گے اور مسلم لیگ میں آ جائیں گے تو دل کی مراد پوری ہو جائے گی؟''

''اللہ تعالیٰ نیت دیکھتا ہے کہ کون اپنے دین کی سربلندی کے لئے مسلمان رہنماؤں کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ کافر پھر کافر ہوتے ہیں۔ آپ ان کا ساتھ نہیں دیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ سے راضی رہے گا۔''

وہ مولانا سے پوچھ نہیں سکتا تھا' کیا ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کریں گے تو پارو ہمیں مل جائے گی؟

مولانا نے کہا۔ ''اگر کوئی دلی آرزو ہے تو میری بات مانیں۔ سچے دل سے دعا مانگیں۔ یہ عہد کریں کہ کافروں کے ہاتھ مضبوط نہیں کریں گے۔ ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی جی جان سے کوشش کریں گے۔ پھر دیکھیں! بندہ کیا کرتا ہے اور اللہ کیا کرتا ہے؟''

وہ حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ اگر کوئی کہتا کہ اس کے لئے آگ پھول چن کر لاؤ تو وہ آگ میں کود جاتا۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر ایک ایک قدم چلتا ہوا مسجد کی دیوار کے پاس آیا۔ پھر اس نے دیوار پر دونوں ہتھیلیاں رکھ کر سر کو جھکا لیا۔ دل کی گہرائیوں سے کہنے لگا۔ ''یا اللہ! کانگریس میں رہنا دین کے خلاف ہے یا نہیں؟ ہم نہیں جانتے تُو جانتا ہے۔ ہم تو بس پارو کو جانتے ہیں، اسی کو مانگتے ہیں۔ اگر وہ مل جائے گی تو کانگریس پارٹی چھوڑ دیں گے۔''

دلی آرزوئیں‘ دلی مرادیں باؤلا کر دیتی ہیں۔انہیں پورا کرنے کے لئے بچکانہ باتیں بھی سچ لگتی ہیں۔سیاسی پارٹی بدلنے سے معشوق نہیں پگھلتا۔عرش سے دعا قبول ہو کر پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں نہیں آتی۔

مگر یا حیرت! پلک جھپکتے ہی دعا قبول ہوگئی۔اپنے پیچھے ملازم کی آواز سنائی دی۔’’مالک...! سلطانی بیگم آئی ہیں۔‘‘

وہ ایکدم سے اچھل کر ملازم کی طرف پلٹ گیا۔پیٹھ دیوار سے لگ گئی۔دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔’’سلطانی خالہ کے پیچھے وہ بھی دعا کی طرح قبول ہو کر آئی ہوگی۔‘‘

ملازم نے کہا۔’’وہ بیٹھک میں ہیں۔آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔‘‘

وہ دوڑنے کے انداز میں تیزی سے چلتا ہوا حویلی کی بیٹھک میں آگیا۔ہانپتے ہوئے سلطانی بیگم کو سلام کیا۔پھر کہا۔’’آپ کے آنے سے لگ رہا ہے‘ عید آگئی ہے۔ہمیں خبر کرتیں تو بگھی لے کر آجاتے۔‘‘

وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔’’بیٹے! اب تو میں بگھی میں نہیں‘ چار کاندھوں پر جانا چاہتی ہوں۔‘‘

’’خالہ جان! ایسی باتیں نہ کریں۔خدا آپ کو سلامت رکھے۔آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر رہے۔‘‘

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔’’زندگی جتنی لمبی ہوتی ہے‘ دکھ اتنے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔میں جینا نہیں چاہتی۔بیٹی کے لئے سانسیں لے رہی ہوں۔‘‘

’’آپ کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔چہرہ سُت گیا ہے۔معلوم ہوتا ہے‘ خوب روتی رہی ہیں۔بہت صدمہ اٹھا رہی ہیں۔‘‘

’’درست سمجھ رہے ہو۔جو صدمے اٹھا رہی ہوں، وہ میری جان لے کر ہی رہیں گے۔‘‘

’’ہم آپ کی سلامتی چاہتے ہیں۔ہم نے پہلے بھی آپ کا دکھ بانٹا ہے۔آج بھی بانٹنے دیں۔ہمیں بتائیں‘ کیوں اتنی پریشان ہیں؟‘‘

وہ سوچ میں پڑ گئی۔کیا بولے اور کیسے بولے؟ بات ایسی بے حیائی کی تھی۔منہ تک نہیں آنا چاہتی تھی۔اس نے پوچھا۔’’چپ کیوں ہیں؟ ہم آپ کے بیٹے ہیں۔جو بات ہے کھل کر بولیں۔‘‘

وہ بولی۔’’ایک پریشانی تو تم جانتے ہو۔زندگی بھر کا داغ لگ گیا ہے۔بیٹی کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے‘ وہ عمر بھر ماں کا کلیجہ نوچتی رہے گی۔‘‘

’’خالہ جان! جو ہو چکا ہے، اسے بھول جائیں۔آپ جلد ہی دیکھیں گی‘ وہ کمینہ شیطان سکون سے نہیں رہے گا، پاگل ہو جائے گا، یا پھر یہاں سے بھاگ جائے گا۔‘‘

’’بیٹے! جو ہوا‘ اسے تو ہم نے چھپا لیا ہے۔مگر اب جو ہونے والا ہے‘ اسے چھپا نہیں پائیں گے۔‘‘

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔’’کیا ہونے والا ہے؟‘‘

سلطانی بیگم نے آنچل میں منہ چھپا لیا۔سسک سسک کر رونے لگی۔وہ قریب آکر قدموں کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔بڑی بیتابی سے بولا۔’’کیا بات ہے خالہ جان..؟ کیا بات کھلنے والی ہے؟‘‘

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔محبوب علی نے پوچھا۔’’کیا منصور نے بدنام کرنے کی دھمکی دی ہے؟‘‘

اس نے انکار میں سر ہلایا، وہ بولا۔’’پھر گھر کی بات باہر کیسے نکلے گی؟ ہمیں کچھ بتائیں؟ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔‘‘

وہ رو رہی تھی‘ منہ پر رکھے ہوئے آنچل کی آڑ سے اسے دیکھ رہی تھی۔بات اتنی بڑی تھی کہ بول نہیں پا رہی تھی۔مگر بولنا تو تھا ہی....

محبوب علی تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔اس کا منہ تک رہا تھا سلطانی بیگم ہچکچاتے ہوئے بولی۔’’وہ کمینہ اس رات جو زخم دے گیا تھا‘ وہ اندر کا زخم پھوڑا بن کر دکھائی دینے والا ہے۔‘‘

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔’’ہم سمجھے نہیں....؟‘‘

وہ دھیمی سی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔’’پارو کے پاؤں بھاری ہوگئے ہیں۔‘‘

وہ سر ہلا کر بولا۔''اوہ....اچھا پاؤں میں پھوڑا نکل رہا ہے....''

وہ بولتے بولتے چونک گیا۔ سلطانی کے قدموں میں جھکا ہوا تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔''آ۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ پاؤں بھاری ہیں....؟ ایسا تو اس وقت بولتے ہیں جب کوئی ماں بننے والی ہوتی ہے۔''

سلطانی بیگم نے آنچل کے پیچھے سر ہلایا۔ وہ ہکا بکا سا منہ کھولے اسے تک رہا تھا۔ جو سن رہا تھا' اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے خوابوں خیالوں میں رہنے والی پارو کو کوئی چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ چھونے والے کے ہاتھ توڑ دیتا اور وہ منصور کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کر رہا تھا۔ اسے رفتہ رفتہ ایک اپاہج شرابی بنا دینا چاہتا تھا۔

ادھر منصور بھی پارو کے اندر چھپا ہوا جوابا پتھر مار رہا تھا۔ اسے کنواری ماں بنا دینا والا پتھر اتنا بھاری تھا کہ سر چکرا رہا تھا۔ ایسے وقت غصے سے یہی کہا جاتا ہے' کہ دشمن کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

محبوب علی بھی یہی کہہ رہا تھا۔ غصے سے دانت پیس رہا تھا۔ مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

سلطانی بیگم نے کہا۔''بنّے میاں غصے میں تلملا رہا ہے۔ مگر شیطان کو ختم کرنے سے کیا ہماری بدنامی ختم ہو جائے گی؟ وہ آج نہیں تو کل مرے گا۔ ہم تو ابھی پل پل مر رہے ہیں۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔''آپ دائی کا کام بھی جانتی ہیں۔ بچے پیدا ہونے سے پہلے....ہمارا مطلب ہے' یہ بچہ ختم نہیں ہو سکتا؟''

''نہیں۔ میں چپ چاپ کوششیں کر چکی ہوں۔ بات نہیں بن رہی ہے۔ پتہ نہیں' پیٹ میں کیسا پتھر ہے؟ گھلتا ہی نہیں ہے۔''

اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔''پھر کیا ہوگا خالہ جان....؟''

اس نے منہ پر سے آنچل ہٹا کر اسے دیکھا۔''تم پارو کے لئے کیا کر سکتے ہو؟''

''ہم جان دے سکتے ہیں۔ ابھی مانگیں' ابھی دے دیں گے۔''

''کیا اُس کی بدنامی کو اپنے دامن میں چھپا سکو گے؟''

اس نے بات سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر پوچھا۔''ہم سمجھے نہیں؟ اپنے دامن میں

اس کی بدنامی کو کیسے چھپا سکتے ہیں؟''

''اُسے اپنی گھر والی بنا کر۔ اپنے گھر کی عزت بنا کر...''

وہ پالتھی مارے بیٹھا تھا۔ خوشی سے اچھل کر دوزانو ہو گیا۔''یا خدا! ہم ٹھیک سے سن رہے ہیں نا؟ آپ یہی کہہ رہی ہیں نا کہ پارو کو شریک حیات بنا لیں؟''

''ہاں۔ بیٹے! میں یہی کہہ رہی ہوں۔''

وہ ابھی دوزانو ہوا تھا۔ اچھل کر گھٹنوں کے بل نیم ایستادہ ہو گیا۔ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''یعنی کہ آپ ہمیں داماد بنانا چاہتی ہیں؟ یہی کہہ رہی ہیں نا؟''

سلطانی بیگم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''آرام سے بیٹھو۔ میں وہی کہہ رہی ہوں' جو تم سن رہے ہو۔ میں اس یقین کے ساتھ آئی تھی کہ مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میری بچی جیسی بھی ہے' اسے قبول کرو گے اور تمہاری خوشی دیکھ کر مجھے اطمینان ہو رہا ہے۔''

وہ پھر پالتھی مار کر بیٹھ گیا۔''ہم ہزار بار پارو کو قبول کریں گے۔ یہ سمجھ میں آ رہا ہے' وہ ہماری گھر والی بن کر یہاں آئے گی تو دنیا یہی سمجھے گی کہ ہم اُس ہونے والے بچے کے باپ ہیں۔ کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ بدنامی آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی۔''

سلطانی بیگم کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار اس کی بیٹی کو قبول کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔''یہ تو آپ نے بہت ہی اچھی تدبیر سوچی ہے۔ وہ بچہ پارو کا ہوگا۔ ہم اسے دل سے لگا کے رکھیں گے۔ سینہ تان کے بولیں گے' بچہ ہمارا ہے' ہم اس کے باپ ہیں۔''

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔''جُگ جُگ جیو بیٹا! تم نے سر سے پہاڑ اتار دیا ہے۔ مجھے تو جیسے انجانی بلاؤں نے جکڑ لیا تھا۔ اب ہلکی پھلکی سی محسوس کر رہی ہوں۔''

وہ بڑی بے چینی سے بولا۔''خالہ جان! یہ کام تو جلدی ہو جائے گا ناں؟ ہمارا مطلب ہے' ہم بارات کب لائیں؟''

"آج، کل، پرسوں جتنی جلدی ہو سکے۔ پارو اِس گھر میں آجائے۔ میرے حساب سے دو مہینے بارہ دن گزر چکے ہیں۔ یہاں آ کر وہ سات مہینوں میں ماں بنے گی تو بچہ ست ماہی کہلائے گا۔ کسی کو کسی طرح کا شبہ نہیں ہوگا۔"

وہ خوش ہو کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہم اچانک پارو کو دلہن بنانے آئیں گے تو ناگ پارا کی ساری عورتیں، سارے لوگ تعجب کریں گے۔ اپنے اپنے دماغ سے باتیں بنائیں گے۔"

"کوئی باتیں نہیں بنائے گا۔ سب ہی جانتے ہیں، تم ہر دوسرے تیسرے دن میرے گھر آتے رہتے ہو۔ کتنی ہی عورتیں جانتی ہیں، میں نے تمہیں بیٹا بنایا ہے۔ اب خبر یہ پھیلاؤں گی کہ منہ بولے بیٹے کو داماد بنا رہی ہوں۔ پہلے بیٹی کو اُس کے پھوپھی زاد سے بیاہنے والی تھی۔ مگر پارو تم سے راضی ہے۔ اس لئے یہ رشتہ ہو رہا ہے۔"

پارو اُس سے راضی ہے..... یہ ایسی خوشخبری سنانے والی بات تھی کہ محبوب کا منہ خوشی سے کھل گیا۔ اُس نے بے اختیار ایسی لمبی سانس کھینچی، جیسے پارو کو گھر لانے سے پہلے اپنے اندر لا رہا ہے۔

اس نخرے والی کے روّیے سے صاف پتہ چلتا تھا، وہ کبھی راضی نہیں ہوگی۔ مگر ماں اپنے سر پر آنچل رکھ کر بیٹی کے آنچل کی ہوا دے رہی تھی اور وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

وہ بولی۔ "میں ابھی جا کر محلے کی عورتوں میں یہ بات پھیلاؤں گی کہ تم آج شام پارو کا رشتہ مانگنے آ رہے ہو۔ اور یاد رکھو! تم مٹھائی اور پھول وغیرہ لے کر آؤ گے۔ اپنی طرف سے رشتے کی بات کرنے کے لئے چار بزرگ عورتوں اور مردوں کو ساتھ لاؤ گے۔"

"آپ جیسا بول رہی ہیں، ہم ویسا ہی کریں گے۔ نکاح کب پڑھایا جائے گا؟"

"تین دن کے بعد... شام کو بات پکی ہو جائے گی تو آج ہی اسے مایوں بٹھاؤں گی۔ دنیا کو دکھانے کے لئے یہ ضروری ہے۔ ابٹن مہندی کی رسمیں دو دن

ہوں گی۔ چوتھے دن جمعہ کو بارات لے کر جاؤ گے۔ پھر نکاح پڑھا کر اسے لے آؤ گے۔"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ کے منہ میں گھی شکر... گھر میں مٹھائی نہیں ہے۔ گڑ ہے۔ ہم اسی سے آپ کا منہ میٹھا کریں گے۔ ٹھہریں... ابھی لاتے ہیں۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ سلطانی بیگم نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا کر کہا۔ "یا خدا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تُو نے جتنے عذاب دیئے، اُتنا ہی ثواب دے رہا ہے۔ میری بچی کی قسمت پھوٹ گئی تھی۔ مگر تیری قدرت کا کیا کہنا؟ اسے دیوانوں کی طرح چاہنے والا جیون ساتھی مل رہا ہے۔ وہ بڑی نیک نامی سے اور بڑی شان سے اس حویلی میں راج کرے گی۔ بیشک تُو بڑا جلال والا ہے، بڑی شان والا ہے۔"

وہ بدنامی کے بہت بڑے عذاب سے نکل رہی تھی۔ بیٹی بڑی نیک نامی سے سہاگن بننے والی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔ "آج سے نمازیں پڑھوں گی۔ دن رات تسبیح ہاتھ میں رہے گی۔ اپنے ربّ کے نام کی مالا جپتی رہوں گی۔"

محبوب علی ایک بڑے سے تھال میں گڑ سے بھری ہوئی پلیٹ، پانی سے بھرا ہوا جگ گلاس اور ایک رنگین کپڑے کی چھوٹی سی پوٹلی لے آیا۔ اس نے ایک تپائی پر تھال کو رکھنے کے بعد گڑ کی پلیٹ بڑھائی۔ "لیں خالہ جان! بسم اللہ بول کے منہ میٹھا کریں۔"

سلطانی بیگم نے تھوڑا سا گڑ اس کے منہ میں دیتے ہوئے کہا۔ "تم حقدار ہو۔ پہلے تم منہ میٹھا کرو۔ اور اس پوٹلی میں کیا رکھا ہے؟"

اس نے سلطانی بیگم کو گڑ کھلاتے ہوئے کہا۔ "یہ رشتہ ہم دونوں کو مبارک ہو۔ اس پوٹلی میں چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ اسے آپ قبول کریں گی۔ انکار نہیں کریں گی۔"

"کیا نذرانہ ایسا ہے کہ میں انکار کر سکتی ہوں؟"

"ہاں۔ مگر نہیں کرنا چاہئے۔ ہم نے آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کیا ہے۔ آپ بھی نہیں کریں گی۔"

وہ پوٹلی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "آخر کیا ہے اس میں...؟"

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پیش کرتے ہوئے بولا۔" پانچ ہزار روپے
ہیں۔انہیں قبول کریں۔"
وہ حیرانی سے لمبی سانس کھینچ کر بولی۔" پانچ ہزار...؟"
"ہاں۔آپ خوب دھوم دھام کریں۔پورے ناگ پارا کو کھانے کی دعوت
دیں۔ہم اپنے اپنے گھر میں اس طرح چراغاں کریں گے کہ سب ہی دیکھنے کے
لئے آتے رہیں گے۔"
"بیٹے!میں دھوم دھام ضرور کروں گی۔میں نے پارو کے لئے ڈھیر سارے
زیورات بنائے ہیں۔دو ہزار روپے نقد ہیں۔یہ سب بریلی میں اس کی پھوپھی کے
پاس ہیں۔آج ہی بنّے وہاں جائے گا' کل تک نقدی اور زیورات لے آئے گا۔یہ
پانچ ہزار کا بوجھ مجھ پر نہ ڈالو۔"
اس نے کہا۔" آپ کے دو ہزار سے کچھ نہیں بنے گا۔یہ ہماری خوشی ہے آپ
اسے قبول کریں۔"
"میں اپنے داماد سے ایک پائی بھی لوں گی تو یہ شرم کی بات ہوگی۔"
"جب نکاح ہوگا' تب داماد بنیں گے۔ابھی بیٹے ہیں۔آپ پہلے بھی اس بیٹے
سے ہر مہینے رقم لیتی رہی ہیں۔اب انکار کریں گی تو ہم ناراض ہو جائیں گے۔"
وہ منہ پھلا کر دوسری طرف پھر گیا۔وہ سوچ میں پڑ گئی۔بڑی جان لیوا فکر و
پریشانیوں سے گزرنے کے بعد ایک بڑی مشکل آسان ہوئی تھی۔وہ اسے ناراض
نہیں کرسکتی تھی۔پہلے بھی اس کے احسانات اٹھاتی رہی تھی۔اس نے پوٹلی اٹھا کر
کہا۔" منہ نہ پھلاؤ۔میں اپنے بیٹے سے یہ رقم لے رہی ہوں۔"
اس نے خوش ہوکر ہونے والی ساس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ایسے ہی وقت
دروازے پر دستک سنائی دی۔انہوں نے سر گھما کر ادھر دیکھا۔ملازم نے باہر سے
دستک دی تھی۔پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔" مالک!یہ آئی ہیں...."
اس نے پوچھا۔" کون آئی ہیں؟"
وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔سلطانی بیگم بھی ادھر دیکھ رہی تھی۔وہ کھلے ہوئے دروازے
سے اندر آئی۔اس نے دوپٹے کو سر پر ایسے رکھا تھا کہ وہ گھونگھٹ بن گیا تھا۔اس کی

صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔سلطانی بیگم نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے
حیرت سے پوچھا۔" پارو...؟ تم...؟"
"مناؤ جشن کہ دلدار آیا ہے...." محبوب علی کے دل کی دھڑکنیں ایسے تیز ہو
گئیں' ایسے دھماکے کرنے لگیں' جیسے اب تب میں سینے کی دیوار توڑ کر معشوق کے
پاس جا کر لپٹ جائیں گی۔
ملازم چلا گیا تھا۔دروازہ بند ہوگیا تھا۔سلطانی بیگم تیزی سے چلتی ہوئی بیٹی کے
پاس آکر بولی۔" یہاں کیوں آئی ہو؟ کوئی دیکھے گا تو کیا بولے گا؟"
محبوب نے قریب آتے ہوئے کہا۔" یہ ہمارا گھر ہے۔کوئی کچھ کہے گا تو ہم اس
سے نمٹ لیں گے۔یہ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہے۔آپ ناراض نہ ہوں...آؤ پارو!
آرام سے بیٹھو۔ضرور کوئی بات ہے' کوئی مجبوری تمہیں لائی ہے۔"
وہ بول رہا تھا' ادھر دیکھ رہا تھا۔مگر حسنِ منور گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔وہ سراپا
سامنے تھی مگر دیدار نہیں ہو رہا تھا۔
ماں نے بالکل قریب آکر گھونگھٹ کے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔" ایسی کیا
مجبوری تھی کہ تم یہاں چلی آئیں؟"
وہ دھیمی سی گنگناتی ہوئی آواز میں بولی۔" میں۔میں کچھ کہنے آئی ہوں۔"
وہ چپ ہوگئی۔شائد کہنے والی بات زبان پر نہیں آرہی تھی۔وہ دونوں اسے
سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔پھر اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں
کہا۔" میں....میں نکاح قبول نہیں کروں گی۔"
ماں نے حیرت سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوچھا۔" کیا....؟"
محبوب علی کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ایسا ہی لگا' جیسے پارو نے پتھر مارا ہو۔وہ پہلی
بار روبرو آکر کہہ رہی تھی کہ وہ قابل قبول نہیں ہے۔
ماں نے پاس آکر اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔" کیا تیرا
دماغ چل گیا ہے؟ یہ فرشتہ تیرے تمام داغ دھو کر تجھے پہلے کی طرح بے داغ بنا
رہا ہے اور تو اسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے؟"
"اماں!آپ مجھے ٹھکانے لگانے کی دھن میں بھول رہی ہیں کہ حاملہ عورت

سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔"

سلطانی بیگم نے چونک کر محبوب کو دیکھا پھر کہا۔" بکواس نہ کرو۔ میں نادان نہیں ہوں۔ اچھا برا جانتی ہوں۔ دینی معاملات کو بھی سمجھتی ہوں۔ مگر مجبوری میں سب جائز ہو جاتا ہے۔"

وہ محبوب کے پاس آکر بولی۔"تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ ہمارے حالات کو اور ایک ماں کی مجبوریوں کو سمجھو۔ کوئی زبردستی ہمارے منہ پر کالک پوت کر گیا ہے۔ میرے پاس کالک پونچھنے کا ایک ہی رومال ہے۔ یہ سمجھو کہ پونچھنے کے بعد منہ صاف ہو جاتا ہے۔ رومال پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ تم نکاح پڑھاؤ گے تو اس کی بدنامی ڈھل جائے گی۔ صرف نکاح نامہ داغدار یا ناجائز رہے گا اور وہ داغ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔"

پارو نے کہا۔"خدا کو سب نظر آتا ہے۔'

ماں نے کہا۔"خدا ہماری مجبوریوں کو بھی سمجھ رہا ہے۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہی ہو؟"

"میں کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہاں آئی ہوں۔"

وہ محبوب علی کی طرف گھوم کر بولی۔"میں ان سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ بولا۔"ہاں بولو۔ دل توڑنے والی باتیں تو کر ہی رہی ہو اور جو کہو گی، اسے بھی سہہ لوں گا۔"

پارو نے کہا۔"اماں! آپ ذرا دیر کے لئے اندر چلی جائیں۔"

اس نے تعجب سے بیٹی کو دیکھا۔ محبوب نے کہا۔"خالہ جان! اسے تنہائی میں باتیں کرنے کی اجازت دیں۔ چلیں ہم آپ کو اندر چھوڑ آتے ہیں۔"

وہ پلٹ کر جاتے ہوئے بولی۔"میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ تم سنو، یہ کیا کہتی ہے؟ مگر جاتے جاتے کہے دیتی ہوں۔ اگر یہ شادی نہ ہوئی اور تم نے بھی انکار کیا تو میں یہیں اپنی جان دے دوں گی۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ پارو سر جھکائے کھڑی تھی۔ بہت دنوں کے بعد سامنے آئی تھی۔ مگر آمنے سامنے ہو کر بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ پھر جو بولنا ہے بولو۔"

وہ اپنی جگہ اٹل کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے ہلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔"میں بدنامی سے بچنا چاہتی ہوں اور آپ ہی ہمیں نیک نامی دے سکتے ہیں۔ میں نکاح قبول کروں گی....."

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔"مگر آپ ایمان سے بولیں' کیا ہمارا رشتہ جائز ہوگا؟"

وہ سر ہلا کر بولا۔"نکاح غلط ہوگا تو ہم دین کے مطابق میاں بیوی نہیں رہیں گے۔"

وہ بولی۔"نکاح کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کے لئے پرائے رہیں گے۔"

"اصل بات بچے کو جائز بنانا ہے۔ اس کے لئے دنیا والوں کو میاں بیوی بن کے دکھانا ہوگا۔"

"یہ آپ کی بہت بڑی نیکی ہے کہ بچے کے باپ بن کر رہیں گے۔ صرف بچے کے باپ.... مجھ سے کوئی رشتہ نہیں ہوگا۔"

اس نے بڑے جذبے سے پوچھا۔"کیا محبت سے بھی کوئی رشتہ نہیں ہوگا؟ کیا یہ جذبہ نہیں ہوگا کہ ہم تمہارے کام آرہے ہیں تو بدلے میں تم تھوڑی سی محبت' تھوڑی سی اپنائیت دو؟"

وہ ذرا چپ رہی۔ پھر بولی۔"آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتی رہوں گی۔ آپ کی شرافت اور انسانیت کے گن گاتی رہوں گی۔ مگر..... ہمارے بیچ فاصلہ رہا کرے گا۔"

اس نے پوچھا۔"کب تک....؟"

وہ پھر چپ رہی۔ اس نے کہا۔"ماں بن جاؤ گی' دس مہینے بارہ مہینے گزر جائیں گے' تب ہم چپ چاپ جائز نکاح پڑھوا سکیں گے۔"

گھونگھٹ انکار میں ہل گیا۔"نہیں.... میں اپنے من مزاج کے خلاف کچھ نہیں کروں گی اور آپ کی مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ کبھی طلاق نہیں لوں گی۔ لوں گی تو میری ہی سبکی اور توہین ہوگی۔"

وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمیں الجھا رہی ہو۔ کیا ساری عمر ایک ناجائز گھر والی بن کر اس گھر میں رہو گی اور.... اور ہم سے دُور دُور رہا کرو گی؟''

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہاں۔''

وہ ایک سرد آہ بھرنے کے انداز میں پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''ایسے تو ہم ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکیں گے۔ تمہیں دیکھ دیکھ کے جیتے مرتے رہیں گے۔ ہماری بھوک مر جائے گی' نیندیں اڑ جائیں گی۔ سکون غارت ہو جائے گا۔ کیا ہماری محبت کا' خلوص کا اور انسانی ہمدردی کا یہی صلہ دیتی رہو گی؟''

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''میں آپ کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ ماں بن جاؤں تو آپ مجھے طلاق دے کر یہاں سے نکال دیں۔''

''ہم ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ تمہیں پالینے کے بعد کھونا نہیں چاہیں گے۔''

''میں تو اسی طرح آپ کے احسانوں کا بدلہ چکا سکتی ہوں کہ اپنی مرضی سے یہ گھر چھوڑ کر نہ جاؤں۔ فیصلہ تو آپ کریں گے۔ مجھے چھوڑنا چاہیں گے یا اپنی چھت کے نیچے رکھیں گے۔''

اس نے گھونگھٹ کو بڑی لگن سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تمہارے دل میں ایک جیون ساتھی کی آرزو پیدا نہیں ہو گی؟''

''ہو گی تو کچل دوں گی۔ آپ میری مشکل میں کام آرہے ہیں۔ میں ساری عمر آپ کے کام آتی رہوں گی۔ آپ کی عزت کرتی رہوں گی۔ آپ سے محبت بھی کروں گی۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''مگر وہ محبت محبوبانہ نہیں ہو گی۔''

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ''پھر وہ کیسی محبت ہو گی؟ صاف بولو کہ ہمیں اپنے قابل نہیں سمجھتی ہو۔ ہمارے ساتھ رہو گی مگر اپنی نفرت کو جھوٹی محبت میں چھپاتی رہو گی۔''

وہ چپ رہی۔ اس نے کہا۔ ''ہم دل سے مجبور ہیں۔ تمہیں اس دل سے نوچ کر نہیں پھینک سکتے۔ بڑی دعائیں مانگنے اور منتیں ماننے کے بعد ہمیں مل رہی ہو۔ یہ صاف صاف سن لو! ہماری زندگی میں' ہمارے گھر میں آنے کے بعد ہم... ہم

تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ جائز رشتے کے بغیر ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ مگر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں گے۔''

وہ اس سے ذرا دور جاتے ہوئے بولا۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک صورت دی۔ ہمیں ایک صورت دی۔ تم اپنی صورت کے باعث اپنا پہلا اور آخری سرمایہ ہار گئیں۔ ہماری صورت کو دیکھو! ہم آئندہ تمہارے داغ دھبے مٹا کر تمہیں خوبصورت بنا کر رکھیں گے۔''

وہ ذرا دور جا کر رک گیا۔ اس کی طرف گھوم کر بولا۔ ''یہاں آنے کے بعد تمہیں ہماری دی ہوئی خوبصورتی اور نیک نامی ملتی رہے گی۔ کبھی تمہارا ضمیر سمجھائے تو سمجھ لینا۔ ہمارے ساتھ جائز نکاح پڑھوالینا اور اگر دل نہ مانے تو ناجائز گھر والی بن کر رہنا۔ ہر حال میں یہیں رہنا ہے۔ ہم تمہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔ بولو! منظور ہے...؟''

وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی' آگے کیا ہونے والا ہے؟ آپ جو کہہ رہے ہیں' مجھے منظور ہے۔''

سلطانی بیگم اندر کسی کمرے میں نہیں گئی تھی۔ وہیں دروازے کی آڑ میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ بیٹی کہہ رہی تھی...

نکاح قبول کرے گی۔ مگر منکوحہ نہیں رہے گی۔

محبوب کے ساتھ رہے گی۔ مگر شجرِ ممنوعہ بن کر رہے گی۔

خواہ ساری عمر اس کے ساتھ رہنا ہو، وہ ندی کا دوسرا کنارہ بن کر رہے گی۔

محبوب علی کو بس اتنی سی خوشی ملے گی کہ اُسے اپنے گھر لے آئے گا۔ مگر گھر میں سہاگ کی سیج خالی رہے گی۔ وہ صبح و شام دسترخوان کی طرح بچھی رہے گی اور وہ فاقے کرتا رہے گا۔

وہ ایسا عاشق' ایسا دیوانہ تھا کہ ساری عمر جذبات اور خواہشات کے کوڑے کھانے والا تھا۔ مگر اس ہاتھ آنے والی کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔

✪

وہاں کسی طرح کی خبر پھیلانا ضروری نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود ہی پھیل جاتی تھی۔

گھاٹ پر نہانے اور کپڑے دھونے والی عورتیں ایک دوسرے سے ہنستی بولتی رہتی تھیں اور نئی پرانی خبریں سناتی رہتی تھیں۔ایک عورت نے کہا۔''چمپا دیدی! کچھ سنا تم نے.... پارو کی سگائی علی بھیا سے ہوگئی ہے۔شکروار کو شبھ ویواہ ہے۔''

چمپا نے کہا۔''تم سے پہلے پتہ ہے۔سلطانی میرے گھر آئی تھی نیوتا دینے۔''

ایک عورت پانی میں ڈبکی لگا کر ابھرتے ہوئے بولی۔''محبوب علی کے تو بھاگ کھل گئے۔اسے اندر سبھا کی اپسرا مل رہی ہے۔''

دوسری نے کہا۔''یہ کہو' پارو کے بھاگ کھل گئے ہیں۔اسے پیسے والا مرد مل رہا ہے۔کچے گھر سے نکل کے حویلی میں راج کرے گی۔''

تالاب کے دوسری طرف مردوں کا گھاٹ تھا۔وہاں مرد بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔پورے ناگ پارا میں پانی پینے اور کھانا پکانے کے لئے چار بڑے کنوئیں تھے۔عورتیں وہاں پانی بھرنے کے لئے آتی رہتی تھیں۔

منصور کہیں سے پیاسا آ رہا تھا۔ایک پنہارن نے کنوئیں میں ڈول ڈالتے ہوئے کہا۔''وہ کالا بھجنگ وہاں روج ڈول ڈالنے جایا کرتا تھا۔آخر پارو کو نکال کر لے جا رہا ہے۔''

منصور نے پوچھا۔''کیا محبوب علی کی بات کر رہی ہو؟ وہ پارو کو کہاں لے جا رہا ہے؟''

پنہارن نے اس کے چلّو میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔''اور کہاں لے جا سکتا ہے؟ اپنے گھر لے جا رہا ہے۔دلہنیا بنا کے....''

یکبارگی زور کا ٹھسکا لگا۔وہ کھانستے کھانستے پنہارن کے قدموں میں جھک گیا۔وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔''ہائے دیا! ہمرے پاؤں کیوں پڑت ہو؟''

رقیب پارو کو دلہن بنا کر لے جا رہا تھا۔اس کے مال پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔اس بات کا ایسا دماغی جھٹکا لگا تھا اور ایسا ٹھسکا لگا تھا کہ منہ کا پانی ناک سے نکل رہا تھا۔

ایک عورت نے پوچھا۔''کیا ہوا منصور! کیا وہ تیری بکری چرا کے لے جا رہا ہے؟''

ساری عورتیں ہنسنے لگیں۔وہ اپنا سینہ سہلا رہا تھا۔سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ایک عورت نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔''تیری ماں کہہ رہی تھی' جب سے دارو پینے لگا ہے' بہت کمزور ہوگیا ہے۔کیوں اتنی پیتا ہے؟''

اسے غصہ آ رہا تھا۔وہ کھانستے کھانستے جھنجلا رہا تھا۔اس نے کبھی دارو کو اپنی مرضی سے منہ نہیں لگایا تھا۔مگر جبراً پلانے والوں نے اسے پورے ناگ پارا میں شرابی کے طور پر بدنام کر دیا تھا۔

اور وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس رات محبوب علی کے پہلوانوں نے اسے زبردستی پلائی تھی۔ان کی گرفت بتا رہی تھی کہ وہ اکھاڑے میں لڑنے والے پہلوان تھے۔ناگ پارا میں اور بھی تگڑے لوگ ہیں۔مگر پہلوانوں کی پکڑ الگ ہی معلوم ہو جاتی ہے۔

پھر اسے یہ باتیں یاد آئیں...''میں پیتا نہیں ہوں' پر شرابی ہوں....میں سادھو سنت نہیں ہوں' پاپی ہوں' میں پاپی ہوں....''

یہ باتیں اس کے کانوں کے قریب بولی گئی تھیں۔اس وقت اس کا سر چکرا رہا تھا۔لیکن ہوش میں آنے کے بعد وہ پورے یقین سے سمجھ رہا تھا کہ محبوب علی نے اس رات یہ باتیں اس کے کانوں میں پھونکی تھیں۔

اس کے ساتھ ہونے والی واردات نے سمجھا دیا تھا کہ محبوب علی نے اسے ایک گناہگار کی حیثیت سے تاڑ لیا ہے۔اس نے روبرو آ کر اسے الزام نہیں دیا تھا۔بڑی رازداری سے اور مکاری سے اسے آٹھ بکروں کا نقصان پہنچایا تھا اور سڑک پر بیٹھ کر پینے والا شرابی ثابت کر چکا تھا۔

کھانسی بند ہوگئی تھی۔ایک پنہارن نے اسے پانی پلانے کے بعد پوچھا۔''کیا دارو پیتے وقت بھی ٹھسکا لگتا ہے؟''

وہ غصے سے بولا۔''بکواس مت کرو۔میں پیتا نہیں ہوں۔''

پھر وہ ایک طرف خلا میں تکتے ہوئے بڑبڑایا۔''کسی نے زبردستی پلائی تھی۔میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

اس نے ایک عورت سے پوچھا۔''موسی! محبوب علی کو کہیں دیکھا ہے؟''

"اب اسے کہاں دیکھنا ہے؟ وہ تو پارو کے آس پاس منڈلا رہا ہوگا۔"

دوسری نے کہا۔ "لنگور کے ہاتھ میں گلاب آ رہا ہے۔ خوشبو نچوڑنے کی فکر میں لگا ہوگا۔"

تمام عورتیں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ پنگھٹ کی فضا رس بھرے قہقہوں سے گونجنے لگی۔ ایک عورت نے کہا۔ "پیپل کی چھیاں میں پنچوں کا پھیسلہ ہے۔ میں نے محبوب کو ادھر جاتے دیکھا ہے۔"

منصور نے سر گھما کر ایک سمت دیکھا۔ پھر ادھر جانے لگا۔ محبوب اس کے مقابلے میں قد آور تگڑا جوان تھا۔ وہ اس سے ہاتھا پائی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اپنی باتوں سے اور حرکتوں سے یہ جتلا سکتا تھا کہ وہ ایک بڑا زمیندار ہو کر اس کا جھوٹا کھانے والا ہے۔

برگد کا گھنا درخت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اطراف ایک بہت بڑا گول چبوترا بنا ہوا تھا۔ جہاں لوگ لوڈو، شطرنج، چوسر اور باون پتے کھیلتے رہتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں محبت کرنے والے وہاں چھپ چھپ کر آیا کرتے تھے۔ اس کی گھنی چھاؤں میں آپس کے جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے کھلی کچہری بھی قائم کی جاتی تھی۔ وہاں دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں کو پیپل کی چھیاں کہا جاتا تھا۔

پیپل کی چھیاں میں اس روز بھی ایک اہم مقدمے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ناگ پارا میں جو پہلے کبھی نہیں ہوا وہ اب ہونے والا تھا۔ ایک مسلمان عورت اور ایک ہندو مرد آپس میں شادی کرنا چاہتے تھے۔ عورت کا نام امانت بیگم عرف منتو بی بی تھا۔ وہ پچپن برس کی تھی۔ مرد کا نام دھرم ویر عرف دھرمو تھا۔

پنچ کے ایک بوڑھے نے کہا۔ "دھرمو! تو ساٹھ برس کا ہوتے ہی سٹھیا گیا ہے۔ سیدھی کمر سے چل نہیں پاتا۔ لاٹھی ٹیک کے چلتا ہے اور گھر میں جورو لانا چاہتا ہے۔"

پنچ میں فیصلہ کرنے والے تین ہندو اور دو مسلمان بزرگ تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں صدیوں سے ہندو مسلم میل محبت سے رہتے ہیں۔ کبھی جھگڑا کرتے ہیں تو گلے بھی مل لیتے ہیں۔ مگر تم دونوں شادی کرو گے تو یہاں گلے کٹیں گے۔"

معاملہ سنگین ہو سکتا تھا۔ شہر سے مسلم لیگ اور کانگریس کے کچھ کارکن آئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے دور لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک

نے کہا۔ ''ہم مسلمان ہیں۔ یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ ہماری عورت ہندو کے گھر جائے۔''

ایک ہندو نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے دھرم کی کوئی عورت مسلمان سے شادی کرنا چاہے گی تو ہمیں بھی تکلیف پہنچے گی۔ یہاں آپس میں لڑنے مرنے والی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے۔''

ناگ پارا کے معزز لوگ بوڑھے پنچوں کے آس پاس چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ محبوب علی بھی پنچ کے ایک بزرگ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ منصور دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ رقیب ہر لحاظ سے برتر تھا۔ اسے ناگ پارا سے باہر رامپور میں اور دوسرے علاقوں میں بھی عزت ملتی تھی۔ سماجی اور سیاسی لیڈر اور سرکاری افسر اسے اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ اس کے برعکس منصور ایک عام آدمی کی طرح دور کھڑا ہوا تھا۔

منتو بی عورتوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ دھرمو پنچوں کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ محبوب علی انہیں دیکھ کر سوچ رہا تھا' کیا بڑھاپے میں بھی عشق ہوتا ہے؟ جوانی میں عشق کرو تو معشوق آسمان کا تارا بن جاتی ہے۔ وہاں تک ہاتھ پہنچ نہیں پاتا۔ بڑھاپے میں بھی دھرمو شائد اپنی منتو تک پہنچ نہیں پائے گا۔

دھرمو نے کہا۔ ''کتنے ہی مسلمان میرے کو بوڑھا پھونس کہتے ہیں۔ میں کب کہتا ہوں کہ جوان ہوں۔ کتنے ہی ہندو میرے کو بھڑکاتے ہیں کہتے ہیں کہ شادی جرور کروں۔ مسلمان عورت کو اپنے گھر جرور لاؤں۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چاروں طرف لوگوں کو دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''بھگوان کے لئے میرے معاملے میں دین دھرم کو نہ لاؤ۔ میرے کو بوڑھا پھونس بولتے ہو تو سمجھو منتو بھی بوڑھی ہے۔ ہم جوانی کی رنگ رلیاں منانے کے لئے شادی نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری مجبوریاں سمجھو۔''

مجبوری یہ تھی کہ وہ بڑھاپے میں بالکل تنہا ہوگئے تھے۔ دھرمو کی ایک بیٹی تھی، جو بیاہ کر دہلی چلی گئی تھی۔ آگے پیچھے کوئی رشتے دار نہیں رہا تھا۔ دور کے رشتے دار ناگ پارا سے بہت دور رہتے تھے۔

وہ بڑھئی تھا۔ جب بدن میں جان تھی تو سستی میز کرسیاں اور چارپائیاں بنا کر رامپور کے بازار میں فروخت کرتا تھا۔ اب محنت مشقت نہیں ہوتی تھی۔ کاغذ کے کھلونے بنا کر فروخت کیا کرتا تھا۔ تین وقت کی نہ سہی کبھی ایک وقت کبھی دو وقت کی روٹیاں کھا لیا کرتا تھا۔

منتو بی کے دو بیٹے تھے۔ ایک نے رامپور میں شادی کی تھی۔ وہیں گھر جوائی بن کر رہ گیا تھا۔ دوسرا بیٹا فلمی اداکار بننے کے لئے کلکتہ چلا گیا تھا۔ وہ بڑھاپے میں بڑے حوصلے سے جی رہی تھی۔ مرغیاں پالتی تھی' ان کی تعداد بڑھاتی تھی' انڈے جمع کیا کرتی تھی۔ دھرمو اس کی مرغیاں اور انڈے لے جا کر شہر میں فروخت کرتا تھا۔

جب سے وہ دونوں تنہا ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے درد آشنا ہوئے تھے۔ تب سے ایک دوسرے کے کام آتے آتے ان میں اپنائیت پیدا ہوگئی تھی۔ اپنائیت کے دو واضح پہلو ہیں۔ اپنا پن عشق و محبت کی طرف بھی لے جاتا ہے اور ضروریات زندگی کی تکمیل کی طرف بھی.....

وہ دونوں عمر کے اس آخری دور سے گزر رہے تھے، جہاں محبت تو ہوتی ہے۔ جوانوں والی ہوس نہیں ہوتی۔ ناموافق حالات انہیں ایک دوسرے سے قریب ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

محبوب علی کبھی دھرمو کو اور کبھی منتو کو دیکھ رہا تھا۔ بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔ ''ناموافق حالات نے پارو کو بھی میرے قریب آنے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن نہ وہ بوڑھی ہے نہ میں بوڑھا ہوں۔ میرے اندر جوانی کے تقاضے ہیں۔ کیا وہ ٹھنڈے چولہے پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح رہے گی؟ کیا میں چولہا گرم نہیں کر پاؤں گا؟''

ان بوڑھوں کے حالات یہ تھے کہ وہ دونوں بیمار رہتے تھے۔ بڑھاپا بیماریوں کا گھر ہوتا ہے۔ نزلہ بخار اور کھانسی ہوتی تھی' کبھی دمے کا مرض حاوی ہوتا رہتا تھا۔ سانسیں رک رک کر کہتی تھیں کہ وہ اب گئے کہ تب گئے۔ چل چلاؤ کا وقت آگیا تھا۔ دن کے وقت محلے پڑوس والے آکر سنبھال لیا کرتے تھے' مگر دن رات آکر حلق میں پانی نہیں ڈال سکتے تھے۔ پھر یہ کہ ناگ پارا کے وید کی دوائیں بے اثر ہو گئی تھیں۔ انہیں رامپور کے ہسپتال جانا پڑتا تھا۔ صبح جاتے تو شام کو واپسی ہوتی۔

کوئی ان کے لئے اتنا وقت نہیں نکال سکتا تھا۔

ایک پنچ نے کہا۔ ''مانا کہ تم جوانی کی رنگ رلیاں منانے کے لئے شادی نہیں کر رہے ہو... پھر کیوں کررہے ہو؟ تمہارے لئے ایک عورت اور منتو کے لئے ایک مرد کیوں ضروری ہے؟''

منتو نے عورتوں کے درمیان سے اٹھ کر کہا۔ ''بڑھاپے میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے بہت ضروری ہو جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میں پچھلے چھ برس سے اکیلی ہوں۔''

اس نے دور بیٹھے ہوئے دھرمو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر دھرمو کا بھی کوئی نہیں ہے۔ ہم کبھی بخار میں تپتے جلتے مرتے رہتے ہیں تو باہر کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ دن کے وقت کوئی خبر لینے آجاتا ہے۔ مگر ساری رات دکھ بیماری میں کیسے گزرتی ہے، یہ خدا ہی جانتا ہے۔''

چند مسلمانوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ایک مسلم لیگی کارکن نے کہا۔ ''یہ بڑھیا اپنا دکھڑا سنا کر خدا کا واسطہ دے کر ہندو کے پاس جانا چاہتی ہے۔ لعنت ہے...''

ادھر دھرمو پنچوں سے کہہ رہا تھا۔ ''ایک رات دمے نے جیسے میری سانس کی نالی پکڑ لی تھی۔ میرا دم نکل رہا تھا۔ ایسے میں منتو نے آکر پانی گرم کیا۔ دوا ڈال کر میرے کو بھاپ دی تو جان میں جان آئی۔''

چند ہندوؤں کے درمیان بیٹھے کانگریس پارٹی کے کارکن نے دھیمی آواز میں بھڑکایا۔ ''بھائیو! دھرمو کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔ منتو کو ہماری جات برداری میں آنا ہی ہوگا۔''

ان ہندوؤں نے گھور کر اس کارکن کو دیکھا۔ وہ ٹپٹا کر بولا۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

ایک ہندو نے کہا۔ ''چپ رہو اور ان کی باتیں سنو۔''

منتو کا بیان جاری تھا۔ ''ایک رات میں بخار میں تپ رہی تھی۔ جیسے پاگل ہو کر بڑبڑا رہی تھی۔ دھرمو نے آکر پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھی۔ جب تک بخار کم نہ ہوا اور میں ہوش میں نہیں آئی تب تک یہ میرے پاس بیٹھا رہا۔''

دھرمو نے پنچوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بڑھاپے میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے جروری نہیں ہوتے؟ آدھی رات کے بعد جب ساری دنیا سو جاتی ہے اور منتو میرے پاس آتی ہے تو آپ سب لوگ اسے بدچلن کہیں گے یا دیوی کا اوتار؟''

منتو نے پوچھا۔ ''دھرمو میری بیماریوں سے لڑنے آتا ہے۔ تب کیا اس کے دل میں پاپ ہوتا ہے؟ میں اسے فرشتہ کہتی ہوں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

پیپل کی چھیاں میں دور تک بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ محبوب علی سوچ رہا تھا۔ ''میرے دل میں پاپ ہوتا تو میں بھی منصور کی طرح شب خون مارتا۔ میں تو سیدھے راستے سے پارو کو حاصل کر رہا ہوں۔ دھرمو بھی سیدھا راستہ اختیار کر رہا ہے۔ پھر رکاوٹیں کیوں پیدا ہو جاتی ہیں؟''

اسے پارو کی بات یاد آئی۔ ''میں دنیا والوں کے سامنے آپ کی گھر والی رہوں گی۔ مگر سچ کیا ہے؟ ہمارا رشتہ جائز تو نہیں ہوگا....؟''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جائز رشتہ مانگنے والی منتو کہہ رہی تھی۔ ''میں عورت ہوں۔ بڑھاپے میں بھی بدنامی سے ڈرتی ہوں۔ میں نے دھرمو سے کہا ہے کہ ہمیں جائز رشتے میں بندھ جانا چاہئے۔''

دھرمو نے کہا۔ ''ہماری مانگ اچھی ہے، سچی ہے۔ اس کو پورا کرو۔ دین دھرم کو بیچ میں نہ لاؤ۔ اگر لاتے ہو تو بولو رات کو منتو میرے پاس نہیں آئے گی پھر تم میں کون میرے پاس آئے گا؟ اور یہاں کی کتنی عورتیں راتوں کو اٹھ کر منتو کا خیال رکھیں گی؟''

وہ بولی۔ ''مجھے اس عمر میں لال جوڑا پہننے کا شوق نہیں ہے۔ مجھے شوہر نہیں چاہئے، مسیحا چاہئے۔ بولو یہاں کتنے مسلمان میرے مسیحا بن سکتے ہیں؟''

دھرمو نے پوچھا۔ ''بولو کتنی ہندو عورتیں اور مرد راتوں کو میری دوا دارو کے لئے آسکتے ہیں؟''

یہ ایسے سوالات تھے کہ سب کو چپ لگ گئی۔ وہ سب دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ جیسے بہت ساری مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کوئی اٹھ کر یہ نہیں

کہہ رہا تھا کہ وہ ایک بوڑھی یا بوڑھے کے لئے راتوں کو جاگے گا۔

کون کسی کے لئے اپنی نیندیں حرام کرتا ہے؟ صرف اور صرف محبت اور ہمدردی کا جذبہ جگاتا ہے اور انسانیت کو بیدار رکھتا ہے۔

پنچ کے ایک بوڑھے نے کہا۔ ''اگر ہم مجبور ہیں' منتو بی بی اور دھرمو کے کام نہیں آسکتے تو انہیں ایک دوسرے کے کام آنے سے نہیں روکنا چاہئے' مگر ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ رات کے سمے یہ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہا کریں گے۔''

پنچ کے دوسرے بوڑھے نے کہا۔ ''یوں اکیلے رہنے کا جائز رشتہ ہونا چاہئے۔ ان کی شادی ہونی چاہئے مگر ہوگی تو فساد پھیلے گا۔''

''ناگ پارا کے ہندو مسلم آج تک ایک حد قائم رکھتے ہوئے بڑے پیار سے رہتے آئے ہیں۔ اس حد کو قائم رہنا چاہئے۔''

محبوب علی نے کہا۔ ''اور انہیں ایک دوسرے کی بیماری میں کام آنے کی اجازت بھی دینی چاہئے۔ نہیں دیں گے تو یہ بے یار و مددگار رہ کر کل کے مرتے آج ہی مر جائیں گے۔ عقل سمجھاتی ہے کہ ان کی شادی ہونی چاہئے۔''

ایک مسلمان نے کہا۔ ''علی بھائی! آپ تو کانگریسی ہیں۔ آدھے مسلمان آدھے ہندو ہیں۔ آپ تو چاہیں گے کہ منتو دھرمو کی دھرم پتنی بن جائے۔''

اس نے ناگواری سے اس شخص کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''فضول باتیں نہ کرو۔ میں کانگریس پارٹی میں ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدھا ہندو بن گیا ہوں۔ پھر کبھی یہ بات کروگے' میرے مسلمان ہونے پر شک کروگے تو تمہارے منہ میں دانت نہیں رہیں گے۔ اپنی بتیسی سنبھال کر رکھو۔''

دوسرے لوگ بھی اس شخص کو لعن طعن کرنے لگے۔ محبوب علی سوچ رہا تھا۔ ''میں نے عہد کیا تھا کہ پارو مل جائے گی تو کانگریس پارٹی چھوڑ دوں گا۔ مگر میری دعا پوری طرح قبول نہیں ہوئی۔ پارو آدھی ملے گی' آدھی نہیں ملے گی۔ جب پوری ملے گی، تب مسلم لیگ میں آؤں گا۔''

ایک مسلمان نے کہا۔ ''یہاں تعصب پھیلانے اور نفرتیں پیدا کرنے والی باتیں

نہ کی جائیں۔ علی بھائی کانگریس میں ہیں تو ہم مسلم لیگی ہیں۔ جب بٹوارہ ہوگا' جب پاکستان بنے گا، تب دیکھا جائے گا۔''

ایک اور مسلمان نے کہا۔ ''تب بھی ہم اپنی یہ دھرتی، یہ ناگ پارا چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ ہمارے پُرکھوں کی ہڈیاں یہاں گڑی ہوئی ہیں۔ یہاں ہماری جڑیں ہیں، ہم اپنی جڑیں نہیں کاٹیں گے۔''

ایک پنچ نے کہا۔ ''یہاں دھرمو اور منتو کی بات کرو۔ ہندو مسلم اور ہندوستان کے بٹوارے کی بات نہ اٹھاؤ۔ کیا پہلے کبھی مسلمان عورت نے ایک ہندو سے اور ہندو عورت نے مسلمان سے شادی نہیں کی ہے؟''

ایک نے کہا۔ ''بٹوارہ ہوتا ہے، ہونے دو' ہم اپنے ناگ پارا کو ہندو اور مسلمانوں میں نہیں بانٹیں گے۔ ہم ایک ہیں، ایک ہی رہیں گے۔''

ایک اور پنچ نے کہا۔ ''پھجول کی باتوں میں سمے برباد ہو رہا ہے۔ میں کھل کر کہتا ہوں منتو اور دھرمو کو بیماریوں نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان کے بیچ کوئی جسمانی رشتہ نہیں ہو سکے گا۔''

محبوب علی نے کہا۔ ''یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ دھرمو ایک مسلمان عورت کے آنچل تک پہنچے گا۔ خدا کے لئے سمجھو کہ یہ بڑھاپے میں معصوم ہو گئے ہیں۔ جب یہ منتو کو ہاتھ نہیں لگائے گا تو پھر ان کی شادی پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''کیا وہ دوا پلاتے وقت اس کی تیمارداری کرتے وقت اسے ہاتھ نہیں لگائے گا؟''

محبوب نے کہا۔ ''اس وقت وہ ایک ڈاکٹر' ایک نرس' ایک وارڈ بوائے ہوگا۔ عیاش پتی دیو نہیں ہوگا۔ دو میں سے کوئی ایک بات قبول کرو۔ انہیں شادی کرنے دو یا تم سب دن رات ان کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری اٹھاؤ۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''اور تم ذمہ داری لو کہ یہ شادی کے بعد بھی ایک مسلم عورت سے جسمانی رشتہ نہیں رکھے گا؟ اگر ایسا ہم نے دیکھ لیا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

محبوب نے کہا۔ ''تم سے برا تو کوئی ہے بھی نہیں... اسی لئے بُرائی کی آنکھ سے دو مجبور بوڑھوں کو دیکھ رہے ہو۔''

دھرمو نے کہا۔ ''میں سب کے سامنے جبان دیتا ہوں کہ منتو کی دیکھ بھال کرنے والا پتی بن کر رہوں گا۔ پرنتو کبھی ایک بچھونے پر نہیں رہوں گا۔''

منتو کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کہا۔ ''منتو بول رہی ہے' دھرمو جو زبان دے رہا ہے، اس کی لاج رکھے گی۔''

دوسری عورت نے کہا۔ ''اب تو کھوکھلی غیرت نہ دکھاؤ۔ انہیں شادی کر لینے دو۔ انہیں ایک چھت کے نیچے رہنے دو۔''

پنچوں نے فیصلہ سنا دیا۔ انہیں شادی کرنے اور ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ کچھ ہندو اور کچھ کانگریسی مسلمان خوش ہو کر تالیاں بجانے اور ناچنے لگے۔ جو مخالفین تھے، وہ منہ بنا کر وہاں سے جانے لگے۔ انسانی محبت ہمدردی اور مسیحائی کے حوالے سے فیصلہ درست تھا۔ ایک ہندو اور ایک مسلم عورت کے درمیان پاپ ہونے والا نہیں تھا۔ مگر اس فیصلے نے پہلی بار ناگ پارا میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بڑی خاموشی سے کشیدگی پیدا کر دی تھی۔

کچھ لوگ ڈھول تاشے لا کر بجا رہے تھے' ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ دھرمو دور کھڑی ہوئی منتو کو دیکھ رہا تھا۔ اسے شادی کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ خوش تھا۔ مسکرا رہا تھا' مگر آنکھوں میں اداسی تھی۔ یہ خیال ستا رہا ہوگا کہ شادی کے بعد بھی وہ اپنی مرضی چاہے گا تو اسے گلے نہیں لگا سکے گا۔

اور یہی بات پارو کے ساتھ بھی تھی۔ وہ دلہن بننے کے بعد بھی پرائی بن کر رہنے والی تھی۔ یہ تقدیر کچھ دیتی بھی ہے تو کیسے دیتی ہے؟ دیتے دیتے آم نہیں دیتی' گٹھلی پکڑا دیتی ہے۔

وہ اور دھرمو ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اس کنارے تک پہنچ نہیں سکتے تھے جہاں پارو اور منتو دکھائی دیتی رہتیں۔ ایسی محرومی اور نامرادی کے باوجود وہ ناچنے گانے والوں کی بھیڑ میں مسکرا رہے تھے۔

اس نے دھرمو کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ''میری بگھی کے پاس آؤ۔ میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں گا۔''

وہ خوش ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ 'حجور! میرے کو بگھی میں لے جائیں

گے۔ سب لوگ دیکھیں گے میرا مان بڑھ جائے گا۔ مگر آپ کشٹ اٹھائیں گے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ آج لوگوں کو دیکھنے دو۔ یہ سمجھنے دو کہ دو امیر اور غریب دولہے ایک بگھی میں بیٹھ سکتے ہیں۔''

وہ مسکراتا ہوا لوگوں کی بھیڑ سے نکلنے لگا۔ آگے کانگریسی کارکنوں نے نمستے کہتے ہوئے راستہ روکا۔ ایک نے کہا۔ ''علی بھائی! آپ نے دھرمو کی حمایت میں بول کر ثابت کر دیا ہے کہ سچے کانگریسی ہیں۔''

یہ بات ایسی تھی کہ پارو نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''ہم کانگریسی نہیں ہیں۔''

ایک نے پوچھا۔ 'کیا آپ مسلم لیگ میں چلے گئے ہیں؟''

اسے پھر پارو دکھائی دی۔ وہ ملنے والی تھی' مگر دعا کی قبولیت ادھوری تھی۔ وہ مل کر بھی گلے ملنے والی نہیں تھی۔ اس نے جواب دیا۔ ''نہیں.... ہم کسی پارٹی میں نہیں ہیں۔''

وہ ان دونوں کو سامنے سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھتا ہوا اپنے آپ سے کہنے لگا۔' 'شادی کے بعد دعا قبول ہوگی تو ہم مسلم لیگ میں جائیں گے۔ پتہ نہیں یہ دونوں پارٹیاں کیوں ہمیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہی ہیں؟ ہم کوئی لیڈر نہیں ہیں۔ ہمارے باپ نے بھی کبھی لیڈری نہیں کی۔''

اسے سیاست سے دلچسپی نہیں تھی۔ کانگریس کی پالیسیوں کے مطابق بڑے بڑے زمینداروں کو اپنے زیر اثر لایا جا رہا تھا۔ وہ محبوب علی کو بھی اپنی پارٹی کا رکن بنا کر اسے ناگ پارا اور آس پاس کے علاقوں کا لیڈر بنانا چاہتے تھے لیکن اس نے گھبرا کر انکار کر دیا تھا۔ وہ سیدھی سادی سی زندگی گزارتا تھا۔ سیاسی جلسے جلوسوں اور نعرے بازیوں کے شور میں اپنا سکون غارت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے رامپور کے کانگریسی لیڈر شمبھو دادا سے کہہ دیا تھا کہ وہ پارٹی میں رہے گا مگر جلسوں میں نعرے لگانے اور تقریر کرنے نہیں آئے گا۔ ابھی وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے؟

ہندو ہندوستان آزاد کرانا چاہتے تھے۔ مسلمان پاکستان بنانا چاہتے تھے اور وہ

اپنے دل کا نگر آباد کرنا چاہتا تھا۔صرف پارو ہی گھر آ کر اسے مسلم لیگی اور پاکستان کا حمایتی بنا سکتی تھی‘ ورنہ وہ جہاں تھا، جس حال میں تھا، مطمئن تھا۔

اس نے حویلی میں دو ہی ملازم رکھے تھے۔باقی نوکر کھیتوں میں اور اس کی دھان مِل میں کام کرتے تھے۔اس نے نوکری کرنے والی عورتوں اور مردوں کو کہا تھا کہ وہ چار دنوں تک حویلی کو خوب سجائیں اور جشن مناتے رہیں۔انہیں دگنی تنخواہیں ملیں گی اور وہ سب وہاں تینوں وقت کھاتے پیتے رہیں گے۔

ایک ملازم نے آ کر کہا۔’’حویلی کے لئے چار ہجار دیئے اور آپ کی سسرال کے لئے ایک ہجار دیئے آ گئے ہیں۔پٹاخے‘ انار‘ پھلجھڑیاں اور ہوائی بان اتنی ساری ہیں کہ دور دور کے گاؤں تک آسمانوں میں اڑتی ہوئی اور پھولوں کی طرح کھلتی ہوئی دکھائی دیں گی۔‘‘

اس نے خوش ہو کر ملازم کو دس روپے دیئے۔وہ نہال ہو گیا۔اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔وہ زیر لب بڑبڑایا۔’’اری او نک چڑھی...! تیرے لئے دعائیں کما رہا ہوں۔پانچ دنوں کے لئے لنگر کھول دیا ہے۔جو آئے کھائے پیئے اور ڈکار لے کر دعائیں دیتا جائے۔‘‘

’’پارو! تجھے دکھا رہا ہوں‘ جتا رہا ہوں کہ تیری خاطر ناگ پارا میں چار دنوں تک عید ہو گی‘ اور راتوں کو دیوالی منائے جائے گی۔سب ہی تجھ پر رشک کریں گے۔کیا پھر بھی مجھ پر ناز نہیں کرے گی؟‘‘

ایک ننھا سا کیڑا پتھر میں گھر کر لیتا ہے اگر میں تیرے دل میں گھر نہ کر سکا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔‘‘

وہ اپنی بگھی کے قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا۔وہاں منصور کھڑا ہوا تھا۔اسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔’’مبارک باد دینے آیا ہوں۔وہ کیا کہتے ہیں شادی خانہ....؟‘‘

محبوب نے کہا۔’’آبادی....‘‘

’’ہاں۔آباد ہو جائے تو آبادی کہتے ہیں۔‘‘

محبوب نے اسے چونک کر دیکھا۔وہ بولا۔’’میری دعا ہے کہ شادی خانہ آبادی ہو۔میں مٹھائی لے کر آنا چاہتا تھا۔پھر سوچا مٹھائی کا مزہ پہلے مکھیاں لے لیتی ہیں۔

تمہارے پاس جھوٹی مٹھائی نہیں لاؤں گا۔‘‘

وہ بات مار کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔محبوب کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان اُلجھ گیا تھا۔منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔’’حلوائی کو تازہ مٹھائی کا آرڈر دیا ہے۔تمہیں تازہ مٹھائی کھانی چاہئے۔‘‘

بات سمجھ میں آ گئی۔محبوب دانت پیسنے لگا۔مٹھیاں بھینچ کر بولا۔’’ہم ایک ہاتھ سر پر ماریں گے تو زمین میں دھنس جاؤ گے۔‘‘

’’مانتا ہوں پہلوان ہو۔مگر بڑے عزت دار اور شریف آدمی سمجھے جاتے ہو۔لوگ دیکھیں گے تو بتانا ہو گا کہ مجھ پر ہاتھ کیوں اٹھا رہے ہو؟‘‘

’’اور ہم بتا نہیں پائیں گے۔اسی لئے تم ابھی تک ٹوٹ پھوٹ سے بچے ہوئے ہو۔‘‘

وہ ہنستے ہوئے بولا۔’’تمہاری مجبوریاں سمجھ کر ہی چیونٹی سے ہاتھی بن کر آیا ہوں۔ابھی میں طاقت میں تمہارے برابر ہوں، جو چاہے بول سکتا ہوں۔‘‘

’’کیا تم بول سکتے ہو کہ گناہگار ہو؟ کتے اور کمینے ہو؟‘‘

وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔’’دنیا والوں کے سامنے تو نہیں۔ابھی یہاں دھیرے سے بول سکتا ہوں۔‘‘

’’سب کے سامنے بولو گے تو جوتے پڑیں گے۔کوتوال باندھ کر لے جائے گا۔‘‘

’’ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔پارو کے گھر ابھی تک بدنامی نہیں آئی ہے۔تم اسے نیک نام رکھنے کے لئے کبھی میرا گریبان نہیں پکڑ سکو گے۔مگر چھپ کر بدلہ لو گے اور تم ایسا بدلہ لے چکے ہو۔‘‘

وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور کر دیکھنے لگے۔منصور نے کہا۔’’میں جانتا ہوں اس رات تمہارے پہلوانوں نے زبردستی مجھے دارو پلائی تھی۔تم بھی وہاں تھے۔تم نے مجھ سے یہ کہلوایا تھا کہ میں پیتا نہیں ہوں مگر شرابی ہوں۔‘‘

’’ہاں۔ٹھیک سمجھ رہے ہو۔یہ بھی سمجھ لو کہ تمہیں چھوٹی سی سزا ملی ہے۔آگے بہت کچھ ہونے والا ہے۔ایسی گپت مار پڑے گی کہ پاگل ہو جاؤ گے یا ناگ پارا

چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔‘‘

وہ مرعوب ہوگیا۔اس کی شیخی اور شوخی ہوا ہوگئی۔اس نے پوچھا۔’’تم ....تم کیا کرنا چاہتے ہو؟‘‘

’’ابھی ہم نہیں جانتے‘ مگر جو بھی کریں گے، اسے پورا ناگ پارا دیکھے گا۔کوئی سمجھ نہیں پائے گا کہ تمہارے ساتھ ویسا کیوں ہوا ہے؟اس وقت بھی تم کسی سے کچھ بول نہیں پاؤ گے۔اپنا پاپ چھپاتے پھرو گے۔‘‘

وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔’’میں ابھی چیخ چیخ کر کہوں گا کہ میں نے پارو کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔تب اس کی اور تمہاری کیا عزت رہ جائے گی؟‘‘

وہ ناگواری سے بولا۔’’گدھے ہو۔ذرا سی بھی عقل ہے تو سوچو ہم اسے اپنے گھر کی عزت بنا کر لے جا رہے ہیں۔ہماری حویلی کی طرف کون بدنامی کی انگلی اٹھائے گا؟کس میں اتنی ہمت ہے....؟تم سوچو تمہارا کیا بنے گا؟‘‘

وہ پریشان ہوکر اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔محبوب نے کہا۔’’چلو چیخ چیخ کر بولو تم نے کیا پاپ کیا ہے۔ہماری مشکل آسان ہوجائے گی۔ہم کھل کر بدلہ لے سکیں گے۔‘‘

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔’’وہ...وہ میں تو یونہی دھمکی دے رہا تھا۔جو ہو چکا ہے اس پر مٹی ڈالو۔مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔اسے معاف کردو۔‘‘

’’وہ کوئی چھوٹی سی چوری نہیں تھی کہ چھوٹی سے سزا دے کر معاف کر دیا جائے۔تم نے میری پارو سے کھلواڑ کیا ہے۔جی چاہتا ہے خنجر اٹھا کر تمہاری بوٹی بوٹی کر دوں۔مگر صبر کر رہا ہوں۔آگے خدا جانتا ہے کہ کیا کر بیٹھوں گا؟‘‘

وہ سہما ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔سوچ رہا تھا۔’’یہ بہت پیسے والا‘ طاقت والا ہے۔کوتوال سے اور سرکاری افسروں سے اس کی دوستی ہے۔مجھے حرام موت مارے گا تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑے گا۔‘‘

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔سر جھکا کر بولا۔’’محبوب علی! میں سچ مچ گدھا ہوں۔تم سے ٹکر لینے آیا تھا۔میری سمجھ مین آ گیا ہے کہ تم مارو گے تو میں بے بسی سے مر جاؤں گا۔فریاد بھی نہیں کرسکوں گا۔ماں باپ کے سامنے رو بھی نہیں سکوں گا۔

میں تمہارے سامنے سر جھکا رہا ہوں۔مجھے سزا دو مگر ایسی دو کہ کچھ میری عزت رہ جائے۔‘‘

محبوب علی سوچنے لگا کہ دشمن بن کر انتقام لینا مناسب نہیں ہے۔اگر یہ توبہ کرتا رہے، پھر کسی کنواری کو برباد نہ کرے تو اچھی بات ہوگی۔

اس نے پوچھا۔’’کیا توبہ کروگے کہ پھر کبھی پاپ نہیں کروگے؟‘‘

اس نے اپنے دونوں کان پکڑے‘ دونوں گالوں کو تھپتھپا کر کہا۔’’کان پکڑتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، آج سے ساری لڑکیوں کو اپنی بہن سمجھوں گا۔‘‘

’’میں کیسے یقین کروں؟‘‘

تم جیسے کہو گے میں یقین دلاؤں گا۔‘‘

محبوب کا دل نہیں مان رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا۔’’صرف توبہ کرنے پر معاف نہ کیا جائے۔اس کے ساتھ کچھ ایسا کیا جائے کہ وہ سیدھے راستے پر چلتا رہے۔اسے دیکھ کر اطمینان ہوتا رہے کہ ہم نے کسی کو ایک اچھا انسان بنا دیا ہے۔‘‘

دھرمو نے آ کر کہا۔’’چھما چاہتا ہوں۔ادھر منتو کی بوڑھی سکھیوں نے میرے کو روک لیا تھا۔آپ کو انتجار کرنا پڑا۔میرے کو ماپھ کر دیں۔‘‘

وہ اس کے شانے کو تھپتھپا کر بولا۔’’کوئی بات نہیں۔بگھی میں بیٹھو‘ ہم ابھی چلتے ہیں۔‘‘

وہ بگھی پر بیٹھنے لگا۔محبوب نے منصور سے کہا۔’’میرے ساتھ آؤ‘ ذرا ادھر چل کر بات کریں گے۔‘‘

وہ دونوں بگھی سے ذرا دور آ گئے۔محبوب نے کہا۔’’ہم نے تمہیں مسجد میں کبھی آتے نہیں دیکھا۔تمہارے ابا اور منظور بھائی جمعے کی نماز پڑھنے آ جاتے ہیں۔‘‘

وہ بولا۔’’ہاں۔میرا دل نہیں کرتا۔میں نماز نہیں پڑھتا۔‘‘

’’اب پڑھو گے۔‘‘

اس کے لہجے میں حکم تھا۔فیصلہ کن سختی تھی۔منصور نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔’’میں عید بقرعید کی نماز پڑھتا ہوں۔‘‘

’’تم آج سے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنے مسجد میں آیا کرو گے، تب ہی

تمہیں نجات ملے گی۔''

''کیا یہ سزا دے رہے ہو؟''

''نماز سزا نہیں دیتی جزا دیتی ہے۔ہم بندے ہیں، سزا دینے کا حق نہیں رکھتے۔ اس لئے تمہیں خدا کے حوالے کر رہے ہیں۔وہاں جا کر سر جھکاؤ اور معافیاں مانگو۔''

اس نے پوچھا۔''مجھے کتنے دنوں تک مسجد جانا ہوگا؟''

جب تک سانسیں چلتی رہیں گی، جاتے رہو گے۔ ذرا سوچو پانچوں وقت عبادت کرو گے تو پاک صاف رہو گے۔گندی باتیں نہیں سوچو گے۔پاپ نہیں کرو گے۔''

''یہ تو بڑی لمبی اور کٹھن سزا ہے۔''

''نماز کو سزا کہو گے تو ہم تمہیں کافر کہیں گے پھر کافر کو خدا کے حوالے نہیں کریں گے۔اس کے بعد کیا کریں گے یہ تمہیں بعد میں معلوم ہوتا رہے گا۔''

وہ بری طرح سہم گیا تھا۔اندر کھلبلی سی ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں وہ کیا کرنے والا ہے؟ پریشان ہو کر بولا۔''کیوں ڈرا رہے ہو؟''

''ڈرتے رہو اور مرتے رہو۔جاؤ یہاں سے...''

''نہیں جاؤں گا تم کو راضی کروں گا۔''

''کیسے راضی کرو گے؟''

''کوئی دوسری سزا دو۔''

''ہم کہہ چکے ہیں' یہ سزا نہیں ہے۔مسلمان ہو تو خدا کے گھر جاتے رہو۔ہمارا فیصلہ نہیں بدلے گا۔''

وہ سوچنے لگا۔''ابھی بحث نہیں کرنا چاہئے۔ابھی مان لینا چاہئے۔دو چار روز نمازیں پڑھوں گا، پھر بچاؤ کا راستہ نکال لوں گا۔''

اس نے کہا۔''ٹھیک ہے۔میں نماز پڑھوں گا۔مگر مسجد جانا ضروری نہیں ہے۔''

''بہت ضروری ہے۔ایک وقت کی بھی نماز چھوڑو گے تو ہمیں پیش امام سے معلوم ہو جائے گا۔''

وہ اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتا تھا۔بے بسی سے بولا۔''اچھی بات ہے۔مسجد جایا کروں گا۔''

جاؤ غسل کرو' پاک صاف ہو کر آج ظہر کی نماز سے بسم اللہ کرو۔''

وہ اس کا جواب سنے بغیر بگھی پر آ کر بیٹھ گیا۔گھوڑے کو لگام کا اشارہ کیا، وہ ایک طرف چل دیا۔منصور اسے جاتے دیکھ رہا تھا' بے بسی سے تلملا رہا تھا' قسم کھا رہا تھا۔''کچھ بھی ہو جائے اپنی مرضی کے خلاف نماز نہیں پڑھوں گا۔اوپری دل سے مسجد جاتا رہوں گا' پھر ایسا جھانسا دوں گا کہ نماز چھوڑ دینے پر محبوب اعتراض نہیں کر سکے گا۔''

محبوب نے دھرمو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔''تمہاری طبیعت کیسی رہتی ہے؟''

''بھگوان کی کرپا ہے۔پہلے دمہ بڑے جور کا تھا، اب نہیں ہے۔منتو گرم پانی سے دوا کی بھاپ دیتی رہتی ہے۔''

''کیا روز تمہارے پاس آتی ہے؟''

''ہاں۔جب سانس لینے کے لئے جور لگاتا رہتا ہوں' منہ سے جور جور کی آواج نکلتی رہتی ہے تو وہ دوڑی چلی آتی ہے۔'

''تمہیں بہت چاہتی ہے۔کیا اسے محبت نہیں کہیں گے؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے محبوب کو دیکھا۔پھر کہا۔''ابھی بگھی میں نہ بٹھاتے تو میں کسی سے حویلی میں آنے والا تھا۔وہ کہتی ہے' آپ بہت اچھے ہیں۔انسان کے روپ میں دیوتا ہیں۔ہمیں اپنا بھید آپ کو بتانا چاہئے۔''

محبوب نے سر گھما کر دلچسپی سے دیکھا۔پھر بگھی کی رفتار سست کرتے ہوئے بولا۔''کیسا بھید....؟''

وہ چپ رہا۔کچھ بولنے سے پہلے گھبرا رہا تھا۔اس نے کہا۔''جب منتو نے کہا ہے تو ہم پر بھروسہ کرو۔تمہارا بھید ہمارے سینے میں چھپا رہے گا' کبھی باہر نہیں آئے گا۔''

وہ بولا۔''میں بھی مانتا ہوں آپ دیوتا سمان ہیں۔وہ۔بات یہ ہے کہ بچپن میں ہم گرو جی کے پاس پڑھنے جاتے تھے۔تب سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔سمے بیتنے کے ساتھ ساتھ ہمارا پیار پوجا بن گیا ہے۔''

محبوب کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔وہ بھی گرو جی کے پاس پڑھنے جاتا

تھا۔ تب گیارہ برس کا تھا۔ پارو چھ برس کی تھی۔ ننھی سی گڑیا جیسی لگتی تھی۔ دل میں گھس آتی تھی۔ دھرمو نے کہا۔ ”ہم بڑھاپے تک بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ بچپن کی پیار بھری باتیں بھول نہیں پاتے۔ میں نے جوان ہو کر آپ کا بھی بچپن دیکھا ہے آپ پارو اور اس کی سکھیوں کے ساتھ پیپل کی چھیاں میں کھیلا کرتے تھے۔“

محبوب نے کہا۔ ”تمہاری یاد داشت بہت اچھی ہے۔ تمہیں ہمارا بچپن بھی یاد ہے۔“

اس نے کہا۔ ”جب پارو سے آپ کی شادی کی خبر سنی تو یاد آ گیا۔ ایک روز میں چارپائی کے پائے بنا رہا تھا‘ دور آپ سب کو کھیلتے دیکھ رہا تھا۔ اس سے میرے کو صاف معلوم ہو گیا کہ آپ ایک کھیل میں جان بوجھ کے ہار گئے تھے۔ آپ کو گھوڑا بننا پڑا تھا۔ پارو خوش ہو کر آپ پر سوار ہو گئی تھی۔“

محبوب نے ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ وہ ان لمحات میں اسے اپنی پیٹھ پر محسوس کر رہا تھا اور وہ ایک ڈوری سے اسے مارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”چل میرے گھوڑے ٹمبک ٹو....“

”میں ہوں رانی گھوڑا ہے تو....“

’میں گرنے لگوں تو سن لے....“

”مجھ کو سنبھالے گا تو......“

”چل میرے گھوڑے ٹمبک ٹو...“

اور وہ اب تک چل رہا تھا۔ وہ گر گئی تھی، اسے سنبھال رہا تھا۔

گھوڑا تو وفادار ہوتا ہے۔ اسے جہاں لے جاؤ۔ بحر و بر میں‘ دل و جگر میں‘ یا نفرت کے گھر میں...وہ چل پڑتا ہے۔

وہ پیار کی لگام سے بندھا ہوا تھا۔ نفرت کے انگاروں کو گلزار بناتا جا رہا تھا۔ پیار کی رفتار سے چلو تو ٹھوکر نہیں لگتی۔ وہ محبت سے گر رہا تھا۔ اسے کوئی نفرت سے نہیں گرا سکتا تھا۔

اچانک گھوڑا رک گیا۔ بگھی ٹھہر گئی۔ اس نے خیالوں سے چونک کر دیکھا۔ آگے

دو بیل گاڑیوں نے راستہ روک لیا تھا۔ وہ ایک طرف ہو کر اسے راستہ دے رہی تھیں۔

اس نے دھرمو کو دیکھ کر کہا۔ ”تم نے بچپن یاد دلایا۔ ہم کھو گئے‘ اب دھیان سے سنیں گے۔ اپنی اور منتو کی بات بولو۔“

وہ بولا۔ ”یہ ہمارا آج کا نہیں بچپن کا پیار ہے۔ جب ہم جوان ہوئے اور ہمارے ماں باپ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ہمیں باتیں سنائیں۔ ناگ پارا میں ہندو مسلم صدیوں سے مل جل کر رہتے آئے ہیں۔ کبھی کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے تو یہ بھی نہیں کہا جاتا کہ ایک ہندو مسلمان سے لڑ رہا ہے۔ کیسا ہی جھگڑا یا نفرت ہو، یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ دو انسانوں کی لڑائی ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”بے شک۔ لڑائی جھگڑے اور شکوے انسانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان کو مذہبی رنگ نہیں دینا چاہئے۔“

”ہمارے ماں باپ نے کہا کہ میری اور منتو کی شادی ہو گی تو دین دھرم آڑے آئیں گے۔ ناگ پارا میں جو کبھی نہیں ہوا وہ اب بھی نہیں ہوگا۔ انہوں نے جلد ہی منتو کی شادی انڈے مرغی بیچنے والے صمد سے کر دی۔ ایک برس کے بعد میری بھی شادی ہو گئی۔ ہم اپنے اپنے گھر کے ہو گئے۔“

وہ ذرا چپ ہوا، پھر بولا۔ ”منتو ہاتھ سے گئی دل سے نہیں گئی۔ ہم اسی بستی میں رہتے ہیں۔ ہمارے گھر بھی آمنے سامنے ہیں۔ وہ شادی کے بعد بھی میرے قدموں کی آہٹ کو پہچانتی تھی۔ میں گھر سے باہر جاتا یا باہر سے گھر آتا تو وہ دوڑتی ہوئی دروازے پر آ جاتی تھی۔“

وہ پھر چپ ہوا۔ محبوب نے کہا۔ ”ہم بگھی کو ایک لمبا چکر دے رہے ہیں۔ جب تک تمہاری پریم کہانی ختم نہیں ہو گی، بگھی چلتی رہے گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں دل سے اپنی پتنی کا اور وہ دل سے اپنے پتی کی نہیں تھی۔ مگر ہم نے ان کے بھروسے کو نہیں توڑا۔ کبھی چھپ کر کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ بڑی شرم والی ہے۔ اس نے کبھی میرے کو بہکنے نہیں دیا۔‘

محبوب نے سر ہلا کر کہا۔ ”سچا عشق گناہ کی طرف نہیں لے جاتا...مگر وہ بھید کیا

ہے؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔جوانی کے بتیس برس گزر گئے۔ہم دور دور رہے۔پھر میری پتنی سورگ باس ہوئی'ادھر وہ بیوہ ہوگئی۔بچے بھی اپنے اپنے گھر کے ہوگئے اور ہم دونوں اپنے اپنے گھر میں اکیلے رہ گئے۔''

وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔''ایسا لگتا تھا ہم اکیلے رہنے کے لئے دنیا میں آئے ہیں۔دین دھرم کی تلوار اب تک ہمارے سروں پر لٹک رہی تھی۔آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم آمنے سامنے رہ کر کس طرح ایک دوسرے کو چھونے کے لئے ترستے رہتے تھے۔''

محبوب نے ایک لمبی سانس لی۔وہ دیکھ رہا تھا کہ پارو اس کی حویلی میں ہے۔اس کے ہاتھوں کی پہنچ میں ہے اور وہ اسے چھونے کے لئے ترس رہا ہے۔

دھرمو نے کہا۔''ایک رات دمے کا جور تھا۔سانس آتے آتے رک رہی تھی۔میرے منہ سے آواج نکل رہی تھی۔تب منتو پہلی بار اکیلی میرے گھر آئی۔اس کے بعد میں بھی دکھ بیماری میں اس کے پاس جانے لگا۔ایک رات وہ بیمار نہیں تھی۔میں اس کے پاس چلا گیا۔بڑی لگن سے بولا۔''منتو!میں تیرے بنا نہیں رہ سکوں گا۔جب تک جاگتا رہتا ہوں تیرے گھر کو دیکھتا رہتا ہوں۔''

وہ بولی۔''دن ہو یا رات میرا بھی دھیان تیری طرف ہی لگا رہتا ہے۔یہ کیسی دوری ہے؟کیسی مجبوری ہے؟''

''ہم مجبوری دور نہیں کر سکتے تھے۔رات کے اندھیرے میں چھپ کر گلے تو مل سکتے تھے۔میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی اور کھینچا تو وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

''یہ.....یہ پاپ ہے۔پہلے سب کے سامنے رشتہ جوڑو۔''

''نہیں جڑے گا۔تم مسلمان ہو، میں ہندو ہوں۔''

اس نے پوچھا۔''تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟کیا جان مانگوں تو دو گے؟''

''ابھی دوں گا۔''

''کیا دھرم کی دیوار گراؤ گے؟''

''میں سمجھا نہیں...؟''

وہ تڑپ کر بولی۔''مسلمان ہو جاؤ۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔پھر کہا۔''تم ہندو ہو جاؤ۔''

''میں نہیں ہو سکتی۔عورت کے اندر برداشت کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔میں ایسے ہی جی لوں گی۔تمہیں دور سے دیکھ دیکھ کر دنیا سے چلی جاؤں گی۔تم برداشت کر سکتے ہو تو کرو، ورنہ جو کہتی ہوں وہ کرو۔''

''میں اس رات سر جھکا کر چلا آیا۔سچ بولتا ہوں اس کے بناء دنیا اچھی نہیں لگتی۔اس کو یاد کرتا ہوں تو پرماتما کو بھول جاتا ہوں۔نام کا ہندو رہ جاتا ہوں۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔''وہ تو مجھے دوراہے پر لے آئی تھی۔اس نے کہہ دیا تھا کہ جب تک اس کی بات نہیں مانوں گا، وہ اپنی دکھ بیماری میں پاس نہیں آنے دے گی۔

''اس بات نے میرے کو تڑپا دیا۔رات کو چھپ کر جانا اچھا لگتا تھا۔اس نے کواڑ بند کر دیئے تھے۔ایک دن بیت گیا'دوسرا دن بھی بیت گیا۔وہ دھواں بن کر میرے اندر بھرتی جا رہی تھی۔اندر سے نکلتی ہی نہیں تھی۔''

''بچپن اور جوانی میں وہ بہت اچھا گاتی تھی۔آپ نے اسے بولتے سنا ہے۔بڑی سریلی آواج ہے۔''

محبوب نے کہا۔''ہاں۔جب میں بچہ تھا، تب شادی بیاہ میں اس کے گیت سنتے تھے۔کوئل کی طرح کوکتی تھی۔''

''میں نے پہلی بار بڑھاپے میں اسے گنگناتے ہوئے سنا۔اس کے گھر سے گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔میں گھر سے نکل کر گیت کی اور کھنچا چلا گیا۔وہ بوڑھی تھکی ہوئی آواج میں گا رہی تھی۔

کوکو کوئلیا بولے۔کوکو...
کھبر سنائے پیا آون کی...
مورے من بھاون کی...
من تڑپت ہے اور کہت ہے...
مر جاؤں گی تیرے آون تک...

کوکوکونکیا بولے۔کوکو

میں تڑپ گیا۔کواڑ اندر سے بند نہیں تھا۔میں اسے کھول کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ٹھیک بولتی تھی۔عورت میں صبر کرنے کی شکتی ہوتی ہے۔مردوں میں نہیں ہوتی۔''

''میں اس کے پاس بیٹھ کر بولا۔''تم جس کو اللہ بولتی ہو، اس کا ہم بھگوان بولتے ہیں۔میں آج سے بھگوان کو اللہ بولوں گا۔اس کا نام بدلنے سے تم مل رہی ہو تو تم کو پاؤں گا۔بولو.....میرے کومسلمان بننے کے لئے کیا کرنا ہے؟''

وہ بولی۔''مسجد کے پیش امام کے پاس جاؤ۔تو وہ تمہیں مسلمان بنائیں گے۔''

''پھرتو بات پھیلے گی۔ہندو میرے کو جندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''کیا چھپ کرمسلمان رہوگے؟''

''اور کوئی چارہ نہیں ہے۔میرے کو جندہ دیکھنا چاہتی ہوکہ نہیں؟''

''وہ جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔''میں تمہاری آنکھ بند ہونے سے پہلے مروں گی۔تمہیں اس دنیا سے جاتے نہیں دیکھ سکوں گی۔تم جاؤ' اشنان کر کے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر آؤ۔میں کلمہ پڑھاؤں گی۔وعدہ کرو، سچے دل سے پڑھو گے۔''

''تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔تم کو دھوکہ نہیں دوں گا۔تمہارا بننے کے لئے اپنی آتما کوتمہارا بناؤں گا۔''

''پھر میں وہاں سے اپنے گھر آیا۔نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔''

وہ بولی۔''میں نہیں جانتی صرف کلمہ پڑھانے سے تم مسلمان بن جاؤ گے یا نہیں؟میں اپنے اطمینان کے لئے ایسا کر رہی ہوں۔''

''تم نہیں جانتیں میں جانتا ہوں۔میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔تم کو دھوکہ نہیں دے رہا ہوں۔آتما کی سچائی سے مسلمان بن رہا ہوں۔''

''تب وہ میرے ساتھ آنگن میں آئی۔وہاں میرے کو وجو(وضو) کرنا سکھایا پھر ہم کمرے میں آ کر کھاٹ پر بیٹھ گئے۔اس نے میرے کو پہلا کلمہ اور دوسرا کلمہ پڑھایا۔اس سے جیادہ اس کو نہیں آتا تھا۔''

''میں دل کی گہرائیوں سے اور آتما کی سچائی سے کہتا ہوں کہ اب مسلمان ہوں۔یہی بھید آپ کو بتا رہا ہوں۔''

بگھی ناگ پارا سے نکل کر ایک ویران راستے پر آ گئی تھی۔محبوب نے اسے روک کر دھرمو کو کھینچ کر بازوؤں میں بھرلیا۔اسے سینے سے لگا کر بولا۔''الحمدللہ! تم سے خدا راضی رہے گا۔تم نے خطرہ مول لے کر ہمارا دین قبول کیا ہے۔''

''منتو بھی یہی کہتی ہے۔ڈرتی ہے بھید کھلے گا تو کیا ہوگا؟وہ گھبرا کر رونے لگتی ہے۔''

محبوب سوچ رہا تھا۔''بیشک دھرمو ایمان والا ہے۔ اس نے منتو کے عشق میں کانٹوں کے درمیان رہ کر اسلام قبول کیا ہے۔ہندوستان کے بہت سے شہروں میں ہندو مسلم فسادات ہونے لگے ہیں۔دھرمو کی بات کھلے گی تو ناگ پارا میں تعصب کی آگ بھڑکے گی۔یہ بہت برا ہوگا۔آج تک یہاں کسی نے کسی کا خون نہیں بہایا ہے۔کیا اس کے مسلمان ہونے والی بات چھپی رہ سکے گی؟''

وہ دھرمو کو حویلی میں لے آیا۔بے شمار نوکر نوکرانیاں حویلی کو اندر اور باہر سے سجا رہی تھیں۔محبوب کو دیکھ کر سہاگ کے گیت گانے اور ناچنے لگیں۔بگھی کی سیٹ کے نیچے چمڑے کی ایک تھیلی رکھی تھی۔اس تھیلی میں پیسے دو پیسے، آنے دو آنے بھرے ہوئے تھے۔وہ مٹھی بھر بھر کر پیسے نکال کر لٹانے لگا۔مرد عورتیں اور بچے سب ہی ادھر ادھر دوڑتے ہوئے زمین پر گرتے پڑتے ہوئے پیسے اٹھانے لگے۔خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگے۔

وہ بہت خوش تھا اور تھوڑا بجھا بجھا سا تھا۔اس کے اندر ساون بھی تھا اور ہولی بھی تھی۔آنسو بھی تھے اور انہیں بجھانے والی آگ بھی تھی۔

کوئی نجانے اندر کی آگ دھواں باہر نہ آئے۔

دل جلا کے سب کچھ لٹا کے یار کو گھر لائیں گے۔

اس نے دھرمو کو بیٹھک میں لا کر چاول دال آٹے اور گڑ کی تھیلیاں دیں اور دو ہزار روپے دے کر کہا۔''ان میں آدھا اناج اور آدھی رقم منتو کو دینا اور کسی چیز کی کمی ہو تو میرے پاس آجانا۔''

وہ ہاتھ اٹھا کر اسے دل سے دعائیں دینے لگا۔محبوب نے ایک ملازم سے کہا۔
"دھرمو کو بگھی میں گھر چھوڑ آؤ اور مٹھائیوں کا ایک ٹوکرا بھی لے جاؤ۔"

وہ ملازم کے ساتھ جانے لگا۔محبوب دروازے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔منتو کے پیار نے اس کی دنیا اس کا دین بدل دیا تھا۔اس کا مسلمان ہونا خوشی کی بات تھی مگر بات تشویش ناک بھی تھی۔

اس غریب کے گھر میں ایمان کی ایک ننھی سی چنگاری سلگ رہی تھی۔ابھی راکھ تلے دبی ہوئی تھی۔کل کلاں کو یہ بھڑک سکتی تھی۔شعلہ بن کر پورے ناگ پارا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔دنیا کا ہر مذہب امن اور تہذیب سکھاتا ہے۔ایمان کسی کو جلاتا نہیں ہے۔کیا کیا جائے؟انسان پھر انسان ہے۔جلنا نہ چاہے تو چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے اور جلنے پر آئے تو ماں کے دودھ سے بھی جل جاتا ہے۔

ننھے میاں نے بلقیس آپا کے پاس آکر کہا۔"ایک خوشخبری ہے۔آپ سن کر خوش ہوں گی' حیران بھی ہوں گی اور شائد ناراض بھی ہو جائیں گی۔"

بلقیس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔"کیا دماغ چل گیا ہے؟بے تکی باتیں کر رہے ہو یا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟آخر کیسی خوشخبری سنانے آئے ہو؟"

"آپ ناگ پارا کے ایک زمیندار محبوب علی کو جانتی ہیں؟"

"ہاں۔اس کے باپ کی وفات پر حویلی میں گئی تھی۔"

"پارو کا رشتہ اس سے طے ہو گیا ہے۔"

وہ چونک کر بولی۔"کیا....؟سلطانی میرے بیٹے سے رشتہ توڑ رہی ہے؟یہ اچانک محبوب علی سے رشتے داری کیسے ہو رہی ہے؟"

وہ بولا۔"آپا!آپ ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔پارو کو بھتیجی نہیں، بیٹی سمجھ کر سوچیں اسے پانچ برس تک بٹھائے رکھنا مناسب نہ ہوتا۔ہم بزرگ اس اندیشے میں رہتے ہیں کہ جوان اولاد سے کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے۔"

وہ قائل ہو کر بولی۔"ہاں میاں!بیٹی چاہے کتنی ہی پیاری کیوں نہ ہو، پہاڑ کی طرح سر پر رکھی رہتی ہے۔وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔میں بھی اس کا بھلا چاہوں گی۔سلطانی سے کہنا شادی کی تاریخ ذرا لمبی رکھے۔جلدی نہ کرے۔اس کے پھوپھا کا چالیسواں کل ہی ہوا ہے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔"شادی آج سے تیسرے دن جمعہ کو ہے۔"

وہ حیرت سے چیخ پڑی۔"اتنی جلدی؟کیا میں پرائی ہوں؟مجھ سے کوئی مشورہ

نہیں کیا۔ تین پیسے کا پوسٹ کارڈ لکھ کر اطلاع دے سکتی تھیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ میں سگی پھوپھی ہوں مجھے رسماً ہی سہی، بات چیت میں شامل کر سکتی تھیں۔ یہ تم لوگ اتنے طوطا چشم کیوں ہو گئے ہو؟"

وہ عاجزی سے بولا۔ "آپا! ناراض نہ ہوں۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں چٹ منگنی، پٹ بیاہ پر راضی ہونا پڑا۔"

"کیا لڑکا بھاگا جا رہا تھا؟ کیا مار پڑی تھی اتنی جلدی کی...؟"

"یہی بات تھی آپا! ہم تین دن میں شادی کے لئے راضی نہ ہوتے تو لڑکا ہاتھ سے نکل جاتا۔"

وہ ذرا چپ ہو کر اس کی بات سننے لگی۔ وہ بولا۔ "آپ تو جانتی ہیں کہ وہ کتنے پیسے والا ہے۔ بڑے بڑے گھرانے والے، بڑے بڑے سرکاری لوگ اسے اپنی بیٹیاں دینے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ جانے کیوں وہ اسی جمعے کو شادی کی ضد کر رہا تھا؟ ہم راضی نہ ہوتے تو وہ ہاتھ سے نکل جاتا۔"

بلقیس ٹھنڈی پڑ گئی۔ بنّے میاں نے کہا۔ "ہمارے خاندان میں آپ بزرگ ہیں۔ سب سے زیادہ آپ کی اہمیت ہے۔ اسی لئے جمعے کا دن مقرر ہوتے ہی میں آپ کو لینے آ گیا ہوں۔"

بنّے میاں نے اچھی طرح باتیں بنا کر اسے موم کر دیا۔ وہ بولی۔ "لڑکا صورت شکل کا تو بس یوں ہی ہے۔ پارو کا جوڑ نہیں ہے۔ لیکن مرد کی صورت نہیں اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔ پارو وہاں راج کرے گی۔ میں اسی کی خاطر چپ ہوں۔ رشتہ اچھی جگہ ہو رہا ہے۔"

وہ اسی دن بنّے میاں کے ساتھ بریلی سے روانہ ہوئی۔ آدھی رات کو ناگ پارا پہنچی تو حیران رہ گئی۔ وہاں کی تمام عورتیں بچے بوڑھے مرد جاگ رہے تھے۔ حویلی میں اوپر سے نیچے تک ہزاروں دیئے روشن تھے۔ ان کی روشنی میلوں دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ پٹاخے پھوٹ رہے تھے، انار چھوٹ رہے تھے۔ ہوائی بان روشنی کی لکیریں بناتے ہوئے آسمان کی طرف جا رہے تھے۔ انتہائی بلندی پر چٹاخ پٹاخ کی آوازوں کے ساتھ رنگا رنگ روشنیوں کے پھول کھلا رہے تھے۔

وہ بنّے کے ساتھ تانگے پر چلی آ رہی تھی۔ سینے پر ہاتھ رکھے گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ "میری پارو کے تو دن پھر گئے۔ میں کہتی ہوں اس شادی کا چرچا دلی تک ہوگا۔ اخبار والوں کو خبر ہوگی تو وہ دوڑے دوڑے آئیں گے۔"

تانگہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ ہر سُو دیکھ رہی تھی۔ لوگ برتنوں اور کیلے کے پتوں میں دال چاول اور روٹی سالن لے کر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان سب ہی ہنستے بولتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اس نے دور سے اپنی بھاوج سلطانی کا گھر دیکھا تو مزید حیرانی سے دیدے پھیل گئے۔ وہاں بھی مکان کے اندر اور باہر بیشمار دیئے روشن تھے۔ رنگ برنگے ملبوسات میں عورتوں کا میلا لگا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت دور تک لہرا رہے تھے۔

سلطانی بیگم نے دروازے پر آ کر اپنی نند کا استقبال کیا۔ وہ بھاوج کو گلے لگا کر بولی۔ "پہلے میں ناراض تھی اب خوش ہوں بہت خوش ہوں۔ تم نے میری پارو کو تخت سلمانی پر بٹھا دیا ہے۔ وہ بلندیوں پر اڑتی رہے گی۔"

بلقیس اندر آئی تو پارو دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ پھوپھی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ آنگن میں اس کی سہیلیاں اور کئی عورتیں تھیں۔ بلقیس اسے کمرے میں لے آئی۔ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں تیرے آنسوؤں کو سمجھ رہی ہوں۔ تجھے دکھ ہے کہ تو میرے گھر نہ آ سکی۔ مگر بیٹی! خدا جو کرتا ہے، ہماری بہتری کے لئے کرتا ہے۔ میں اس رشتے سے اس شادی سے بہت مطمئن ہوں۔ تو ساری عمر چاندی کے برتن میں سونے کے نوالے توڑتی رہے گی۔"

وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ دکھ اور ہوتے ہیں، دلاسہ اور ہوتا ہے، پیاس اور ہوتی ہے، پیالہ اور ہوتا ہے۔

اسے دکھ یہ تھا کہ شادی مرضی سے ہو تو رہی تھی، مگر اپنی پسند کے خلاف ہو رہی تھی۔ پھوپھی سمجھ رہی تھی کہ اس کی بہو نہ بننے پر رو رہی ہے۔ سب ہی اپنی اپنی سوچ کے مطابق ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ وہ سکھیوں کے ساتھ بڑا بول بولتی تھی۔

"جب تک کوئی میرے برابر کا چھیل چھبیلا گبرو جوان نہیں آئے گا۔ شادی نہیں

کروں گی۔"

اب سکھیاں چپکے چپکے ٹوہ لیتی تھیں، سرگوشیوں میں پوچھتی تھیں کہ وہ محبوب علی سے کیسے راضی ہوگئی ہے؟

وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکتی تھی۔ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔"انسان کی سوچ اور اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔میں بھی بدل گئی ہوں۔اونچی حویلی میں رہ کر زمین جائیداد والی کہلوانا چاہتی ہوں۔"

ایک سہیلی نے پوچھا۔"شادی اچانک ہی اتنی جلدی کیوں ہورہی ہے؟"

اس نے کہا۔"پیسے والے گیلے صابن کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتے ہیں۔انہیں پھسلنے سے پہلے صابن دانی میں بند کردینا چاہئے۔"

یہ جواب سن کر ساری سہیلیاں ہنسنے لگیں۔وہ جانتی تھی کہ ساری سہیلیاں تجسس میں مبتلا ہوں گی۔ایسے ہی سوالات کریں گی۔اس نے پہلے سے جوابات سوچ رکھے تھے۔وہ بے تکے جوابات سے ہنسی مذاق میں ٹال رہی تھی۔

بلقیس سلطانی کے ساتھ اپنی ہم عمر عورتوں میں آگئی تھی۔پارو کے اطراف سہیلیوں نے گھیرا ڈال دیا تھا۔وہ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گارہی تھیں اور ناچ رہی تھیں۔

ایک لڑکی نے کہا۔"بہت ناچنا گانا ہوگیا۔اب سہیلی بوجھ پہیلی کھیلیں گے۔میں پہیلی بولتی ہوں۔اسے بوجھو۔"

پھر اس نے کہا۔

"وہ آوے تب شادی ہوئے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول
بولو بولو کون؟"

ایک لڑکی نے کہا۔"اے سکھی! ساجن؟"

دوسری نے کہا۔"نہ سکھی! ڈھول۔"

اور ڈھول صحیح جواب تھا۔ایک سہیلی نرملا نے کہا۔"میں دو سوال کرتی ہوں۔اس

کا جواب ایک شبدھ (لفظ) میں دو۔"

پھر اس نے پوچھا۔"گوشت کیوں نہ کھایا؟ ڈوم کیوں نہ گایا؟"

سب سوچنے لگیں۔ایک لفظ میں جواب دینا تھا اور یہ آسان نہ تھا۔دور بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی نے کہا۔"گوشت کیوں نہ کھایا؟ گلا نہ تھا اور ڈوم کیوں نہ گایا؟ گلا نہ تھا۔"

جواب درست تھا۔لڑکیاں اعتراض کرنے لگیں۔"دادی! تم نے کیوں بتایا؟ ہم بتانے والی تھیں۔"

رات خاصی گزر گئی تھی۔پارو کا دل گھبرا رہا تھا۔دل میں کوئی جذبہ، کوئی خوشی نہیں تھی اس لئے سہیلیوں کی شوخیاں اور ان کا ناچ گانا بوجھ لگ رہا تھا۔وہ وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی۔چندا نے اسے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔"بیٹھو اور ایک گونگی پہیلی بوجھو۔"

اس نے کہا۔"مجھے جانے دو۔تھک گئی ہوں۔ذرا کمر سیدھی کروں گی۔"

کامنی نے کہا۔"اے ہے۔ذرا صبر کرو۔کمر دابنے والا آرہا ہے۔بالکل سیدھی ہوکر رہ جاؤ گی۔"

ساری سہیلیاں قہقہے لگانے لگیں۔چندا نے کہا۔"میں ہاتھ کے اشارے سے پہیلی بول رہی ہوں۔اسے سمجھو۔"

پھر اس نے خلاء میں دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کسی کو بلایا۔پھر سب کو چار انگلیاں دکھائیں۔یعنی پہلے اس نے بلایا....آ....انگلیاں چار دکھائیں... چار...... یوں جواب ہوا۔اچار.....

پہیلی بوجھتے ہی پارو کی سمجھ میں آیا کہ اتنی دیر سے اچار کھانے کو جی کر رہا ہے۔مگر گھر کے ہر حصے میں حتیٰ کہ رسوئی میں عورتیں آجارہی تھیں۔اور وہ کسی کے سامنے اچار کو منہ نہیں لگا سکتی تھی۔

ناگ پارا کے گھڑیالی نے رات کے دو بجے کا گجر بجایا تو بڑی بوڑھیوں نے کہا۔"اے لڑکیو! چلو نکلو یہاں سے۔کل بھی جاگنا ہے۔"

دوسری خاتون نے کہا۔"یہ مل بیٹھنا اور ہنسنا بولنا بھی کیا ہوتا ہے؟ وقت گزرنے

کا پتہ ہی نہیں چلتا۔“

وہ سب ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ پارو اپنے کمرے میں آئی تو وہاں دوسری کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔ اس پر پھوپھی لیٹی ہوئی تھیں۔ شائد سوگئی تھیں۔ وہ لالٹین بجھا کر اپنے بستر پر آ گئی۔

باہر بے شمار دیئے جل رہے تھے۔ لالٹین کے بجھانے کے بعد بھی کمرے میں دھیمی سی روشنی تھی۔ اس نے اپنے بچھونے سے پھوپھی کو دیکھا۔ وہ تھکی ہوئی تھیں۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے گہری نیند میں ڈوب چکی تھیں۔ وہ بھی کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی دیر سے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ سینے پر بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ عجیب سی گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت ابکائی سی محسوس ہوئی۔

اس نے سینے کو سہلاتے ہوئے کروٹ بدلی۔ اونک اونک..... وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ آواز ہو اور پھوپھی کی آنکھ کھل جائے۔ عجیب مشکل تھی۔ ایسے وقت اپنا منہ آپ ہی دبانا پڑتا ہے۔ خبردار! بھید نہ کھلنے پائے۔

اونک۔ اونک.... بدنامی بڑی سخت جان ہوتی ہے۔ گلا گھونٹنے کے باوجود بولتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبا کر کھاٹ سے اتر گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی دروازہ کھول برآمدے میں آ گئی۔

باہر آتے ہی کھل کر آواز نکلی۔ مگر اندر کیا بلا تھی کہ نہیں نکل رہی تھی؟ الجھن ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ اس نے دو چار بار اونک اونک کے جھٹکے کھائے۔ تو ذرا سا کھٹا کھٹا سا پانی نکلا۔ یوں ذرا جان میں جان آئی۔

وہ تھوڑی دیر تک گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ پھر اس نے مٹکے سے پانی نکال کر کلی کی۔ آنگن میں اور احاطے کی دیواروں پر دیئے روشن تھے۔ ان کی روشنی اب ماند پڑ رہی تھی۔ وہ سر تھام کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رسوئی میں آ گئی۔ وہاں ایک طرف اچار کا مرتبان رکھا ہوا تھا۔ وہ اس میں ایک ٹکڑا نکال کر اسے چاٹنے لگی۔

کوئی ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا.... آ.... چار انگلیاں دکھا رہا تھا... چار....“

”اے لڑکی! تجھے چار جھٹکے لگتے رہیں گے۔ ایک جھٹکا آبرو کی لوٹ مار کا... یہ توہین تیرا سر جھکائے رکھے گی۔

دوسرا جھٹکا کنواری ماں بننے کا.. وہ بچہ ایک سائن بورڈ کی طرح تیرے وجود سے چپک کر رہے گا۔

تیسرا جھٹکا وفاتِ غرورِ حسن کا..... تیرے باغ میں کوئی پھول چننے نہیں آئے گا۔

اور آخری جھٹکا محبوب علی کا..... ساری عمر تیرے چاند جیسے حسن پر گرہن لگا رہے گا۔

اچار لذت ہے۔ چٹخارہ ہے۔ کنواریوں کے منہ لگے تو بدنامی کا پٹارا ہے۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ سے اچار چھوٹ گیا۔ پھوپھی رسوئی کے دروازے پر کھڑی دیدے پھیلائے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نظریں سوالیہ ہونے کے باوجود جوابی تھیں۔ جہاندیدہ عورتیں اس ترتیب کو سمجھتی ہیں کہ پہلے مرد پھر ابکائی پھر اچار پھر بچہ.....

پھوپھی نے قریب آ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”وہ۔ وہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”بیمار ہو۔ دوا کھا رہی ہو؟ اتنا تو سمجھتی ہوں کہ عورتیں کس بیماری میں ایسی دوا کھاتی ہیں۔‘

پہلے وہ منہ چھپا رہی تھی۔ پھر ایکدم سے پلٹ کر پھوپھی سے لپٹ گئی۔ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ رونے سسکنے لگی۔ بلقیس نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو سلطانی اسی لئے تمہیں جھٹ پٹ سہاگن بنا رہی ہے۔ مگر پارو! تم ایسی تو نہ تھیں پھر کیسے بہک گئیں؟“

وہ قسمیں کھاتے ہوئے بولی۔ ”پھوپھی جان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بے حیاء نہیں ہوں۔ میں اپنا آنچل بھی کسی کو چھونے نہیں دیتی تھی۔ مگر میرے ساتھ زبردستی ہوئی ہے۔“

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے روداد سنانے لگی کہ کس طرح خنجر کی نوک پر آبرو لوٹی گئی ہے۔ ہائے! یہ کیسا ظلم ہوتا ہے نازک اندام لڑکیوں پر...؟

پارو میں ایک ہی خرابی تھی کہ وہ مغرور تھی اور یہ کوئی بات نہیں تھی۔ حسن تو مغرور

ہوتا ہی ہے۔گلاب میں تو کانٹے ہوتے ہی ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے مسل دیا جائے......نوچ کھسوٹ لیا جائے۔

وہ کسی قصور کے بغیر بہت بڑی سزا پا رہی تھی۔مظلوم تھی ہمدردی کے قابل تھی۔ اگر کوئی کتا آکر کاٹتا تو اتنا دکھ نہ ہوتا۔کوئی بڑا عذاب نازل نہ ہوتا۔مرد کاٹ کر جاتا ہے تو زندہ لاش بنا دیتا ہے۔تمام عمر اس کی زندہ میت پر چادر چڑھانی پڑتی ہے۔ اسے نیک نامی کی چادر سے ڈھانپنا پڑتا ہے۔

وہ دونوں دھیرے دھیرے بول رہی تھیں۔پھوپھی اپنی بھتیجی کا دکھ بانٹ رہی تھی۔پھر وہاں کی خاموشی میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اُبھرنے لگی۔رات رو رہی تھی۔شادی کے گھر میں بین کر رہی تھی۔

انہوں نے چونک کر سر گھما کر دیکھا۔رسوئی کی دہلیز پر سلطانی بیگم دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے بیٹھی تھی۔وہ رو رہی تھی اور جیسے دونوں ہاتھوں سے اپنی آواز کا گلا بھی گھونٹ رہی تھی۔

دکھ مصیبتیں تو آتی ہی رہتی ہیں۔لیکن شادی کے گھر میں آنے والا دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ جان لے لیتا ہے۔وہ دونوں اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

باہر دیئے بجھ رہے تھے۔اندر ماتمی سکوت تھا۔ان لمحات میں کوئی ان کے دل سے پوچھتا' وہ شادی کا گھر نہیں تھا۔جبکہ دو روز بعد ہی برات آنے والی تھی۔یوں لگ رہا تھا ایک ماں اپنی بیٹی کی ڈولی نہیں جنازہ اٹھانے والی ہے۔

❀✪❀

محبوب علی نے رامپور کے سرکاری افسروں کے علاوہ کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈروں کو بھی شادی کی دعوت دی تھی۔شہر سے اور بھی جانے پہچانے لوگ آرہے تھے۔دن رات آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ناگ پارا میں جیسے ہردوار کا میلا لگ رہا تھا۔

مسلم لیگ کے لیڈر حیدر شیخ نے خوش ہو کر اپنے پارٹی کے لوگوں سے کہا۔ ''محبوب علی نے ہمیں بھی دعوت دی ہے۔جب کہ وہ کانگریسی ہے۔''

ایک نے کہا۔''وہاں شادی میں ہم بھی جائیں گے۔کانگریسی بھی آئیں گے۔

کوئی بدمزگی تو نہیں ہوگی؟''

حیدر نے کہا۔''محبوب علی ہونے نہیں دے گا۔بہت سمجھدار ہے۔شیر اور بکری کو ایک ہی گھاٹ پانی پلا کر کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔''

ایک کارکن نے کہا۔''شیخ صاحب!ہوسکتا ہے کانگریس والوں سے دل بھر گیا ہو۔وہ ہماری پارٹی میں آنا چاہتا ہو۔''

''ایسا ہوگا تو میں سمجھوں گا' کافر مسجد میں آرہا ہے۔ہم مٹھائیاں بانٹیں گے۔'

دوسری طرف شمبھو دادا پریشان ہوگیا تھا۔ایک پارٹی میٹنگ میں کہہ رہا تھا۔ ''محبوب علی نے ان لیگیوں کو کیوں دعوت دی ہے؟پہلے تو ان سے کوئی ناطہ نہیں رکھتا تھا۔کہیں ادھر تو نہیں جھک رہا ہے؟''

ایک نے کہا۔''وہ مسلمان ہے اور میں یہ بولتا رہتا ہوں کہ مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرو۔بس اوپر ہی اوپر سے سر سہلاتے رہو اور اپنا کام نکالتے رہو۔''

ایک لیڈر نے کہا۔''ناگ پارا کا بنیا بنواری لال بھی زمیندار ہے۔محبوب علی کی ٹکر کا دھنوان ہے۔اسے ناگ پارا اور آس پاس کے دیہاتوں کا سرپنچ بناؤ۔وہ آپ ہی آپ لیڈر بن کر ابھرتا رہے گا۔''

ناگ پارا میں سیاست نہیں تھی۔اب لائی جا رہی تھی۔کانگریسی لیڈر اپنے کارندوں کے ساتھ وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہوگا تو غریبی دور ہوجائے گی۔شہر سے بجلی آئے گی۔راستے اور گلیاں پکی ہوجائیں گی۔پانی پینے کے لئے نلکے لگائے جائیں گے۔

وہاں کے لوگوں کو ہندوستان کی غلامی یا آزادی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔وہ سنتے تھے کہ انگریزوں کی حکمرانی ہے۔لیکن کبھی انگریزوں کا دیکھا نہیں تھا۔گوروں کی فوج یا ان کا کوئی افسر ادھر نہیں آتا تھا۔ان حکمرانوں کو گاؤں کھیڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پوری انسانی تاریخ کہتی ہے کہ غریب ہر دور میں دولت مندوں کا غلام رہتا آیا ہے۔ناگ پارا کے لوگ کہتے تھے' ہندوستان آزاد ہوگا' تب بھی وہ صبح سے شام تک محنت کرنے والے کسان اور مل مزدور ہی رہیں گے۔اس لئے وہ آباؤ اجداد کے

زمانے سے جیسے ہیں، ویسے ہی رہنا چاہتے ہیں۔

کتنے ہی لوگوں نے شہر جا کر نلکے کا پانی پیا تھا۔ بالٹیوں اور لوٹوں میں لا کر اوروں کو بھی پلایا تھا۔ کنویں کے پانی کی طرح اس میں ٹھنڈک اور قدرتی مٹھاس نہیں تھی۔ ایک نے کہا۔ ”نلکے کا پانی صرف نہانے اور کپڑے دھونے کے کام آسکتا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”نہانے دھونے کے لئے یہاں تالاب گھاٹ ہے۔ چار بڑے اور دو چھوٹے کنویں ہیں۔“

ایک نے کہا۔ ”اور بجلی آئے گی تو اس کا اجالا پھوکٹ میں نہیں ملے گا۔ اس کے پیسے دینے پڑیں گے یا ہم پر ٹیکس لگایا جائے گا۔“

سیاسی لیڈر انہیں سمجھا نہیں پاتے تھے۔ ہندو ہو یا مسلم، سب ہی کہتے تھے کہ جب بجلی آئے گی‘ تب دیکھا جائے گا ورنہ لالٹین اور دیے کی روشنی انہیں گھٹی میں ملی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو بھی یہی گھٹی دیں گے۔

وہ پسماندہ رہ کر خوشحال تھے۔ اپنی سیدھی سادی زندگی میں کسی طرح کی ہلچل نہیں چاہتے تھے۔ مسلم لیگی لیڈر بھی اپنے مشن میں ناکام ہو رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کا ایک الگ ملک بنے گا۔ وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی اسلامی قوانین کے مطابق ہوگی۔

ناگ پارا کے مسلمان خدا اور رسول کو مانتے تھے۔ نمازیں پڑھتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ جاننا نہیں چاہتے تھے۔ ایک اسلامی ریاست میں اسلامی قوانین نافذ ہونے والے تھے تو ان سے کیا؟ وہ اپنی زمین‘ اپنا گھر‘ اپنی پرکھوں کی قبریں چھوڑ کر کہیں جانے والے نہیں تھے۔

دونوں پارٹیوں کے لیڈر بیزار ہو کر کہتے تھے کہ یہ لوگ موٹے دماغ کے جاہل گنوار ہیں۔ انہیں محبوب علی اور بنیا بنواری لال ہی سمجھا سکتے ہیں۔

مشکل یہ تھی کہ وہ دونوں سیاست سے دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ بنواری لال زمیندار تھا اور پرچون کے سامان کا تھوک بیوپاری تھا۔ بہت ہی ذہین اور چالاک سمجھا جاتا تھا۔

شمبھو دادا نے ناگ پارا آ کر اس سے ملاقات کی پھر شکائیت کی۔ ”آپ رامپور آتے ہیں مگر ہم سے ملنے نہیں آتے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہماری پارٹی کا دروا جا آپ کے لئے کھلا ہے۔“

بنواری لال نے کہا۔ ”ہمارا محبوب علی آپ کی پارٹی میں ہے۔ سمجھیں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”محبوب کو راج نیتی سے دلچسپی نہیں ہے۔ کل وہ دلہن لانے والا ہے۔ پھر تو ہمارے معاملے سے اور دور ہو جائے گا۔“

بنواری نے کہا۔ ”سچ پوچھیں تو ناگ پارا کے باہر کسی معاملے میں الجھنا اچھا نہیں لگتا۔ ہم اپنے حال میں مست ہیں۔ ہندوستان آجاد ہونے والا ہے۔ اچھا ہے پاکستان بننے والا ہے اچھا ہے۔ مگر اس سے پہلے اچھا نہیں ہو رہا ہے۔“

”کیا اچھا نہیں ہو رہا ہے؟“

”ہمارے دیس میں جگہ جگہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہیں‘ کٹ رہے ہیں‘ مر رہے ہیں۔“

”یہ ہم نہیں مسلمان لڑتے ہیں۔ ہم تو اہنسا کے پجاری ہیں۔ جانوروں کو بھی نہیں مارتے۔ وہ پاکستان بنانے کے لئے لڑتے ہیں اور جور جور سے بولتے ہیں۔“ لڑ کے لیں گے پاکستان.... لڑ کے لیں گے پاکستان...“

”یہاں ناگ پارا میں کوئی مسلمان ایسے نہیں بولتا اور نہ ہی لاٹھی کٹار اٹھاتا ہے۔ یہاں لاٹھیاں تو ہیں مگر کسی مسلمان اور ہندو کے گھر کٹار اور بھالا نہیں ہے۔“

شمبھو دادا نے کہا۔ ”ہونا چاہئے‘ برے سے آتے دیر نہیں لگتی۔ مسلمانوں کا بھیجہ کسی گھڑی بھی پھر جاتا ہے۔ مگر ہمارے ہندو بھائی بہت ہی بھولے ہیں۔ ہم نے چپ چاپ انہیں ہتھیار دینا چاہا مگر انہوں نے گھر میں چھپا کر رکھنے سے انکار کر دیا۔“

بنواری لال نے کہا۔ ”اس لئے کہ ہم آہنسا کے پجاری ہیں۔ مار کاٹ نہیں چاہتے‘ ابھی آپ یہی کہہ رہے تھے۔ پھر ہتھیار بھی پہنچا رہے تھے؟“

”بھئی! سمجھتے کیوں نہیں؟ اپنی رکھشا (حفاظت) کے لئے یہ جروری ہے۔“

"آپ یہاں کسی بھی ہندو سے کسی بھی مسلمان سے پوچھیں گے وہ یہی کہے گا کہ ترکاری کاٹنے کے لئے چاقو جروری ہے۔اس سے جیادہ کچھ نہیں۔"

"آپ بدلتی ہوئی ہوا کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔محبوب علی لیگیوں سے دوستی کررہا ہے۔ابھی جا کر دیکھیں حیدر شیخ اس کی حویلی میں گیا ہے۔اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی ہے۔"

بنواری نے مسکرا کر کہا۔"محبوب علی کے گھر میں جو بھی پکتا ہے وہ برتن میں میرے پاس آجاتا ہے۔آپ نہیں جانتے میں نے اس کو گود میں کھلایا ہے۔وہ مجھ کو بابو جی کہتا ہے۔میرے بیٹے کشوری لال کو بھائی میاں بولتا ہے۔"

پھر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔"شمبھو دادا! ہم دیکھ رہے ہیں پورے ہندوستان میں آگ لگی ہے۔اس آگ کو ہم ادھر نہیں آنے دیں گے۔آپ سے بنتی ہے ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔"

شمبھو دادا اٹھ کر جانے لگا۔بنواری اس کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے بولا۔

"آپ نے یہاں آتے سے بھی دیکھا ہے جاتے ہوئے بھی دیکھیں گے کہ لوگ کتنے خوش ہیں۔ہنس بول رہے ہیں۔ناچ گا رہے ہیں۔آپ کو پتہ نہیں چلے گا کہ ان میں کون ہندو ہے، کون مسلمان ہے۔سب انسان ہیں۔سب پرماتما کے بندے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولا' غصے میں بھرا ہوا تھا۔اپنے کارکنوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر چلا گیا۔

محبوب علی دوسرے دن دولہا بننے والا تھا۔شہر سے آنے والے معزز مہمانوں کے لئے پنڈال سجانے والوں کے ساتھ مصروف تھا۔ایسے وقت حیدر شیخ اپنے لیگی کارکنوں کے ساتھ آیا۔دور ہی سے بانہیں پھیلاتے ہوئے بولا۔"شادی خانہ آبادی مبارک ہو محبوب علی! تم نے کل آنے کی دعوت دی ہم آج ہی آگئے۔"

وہ خوشی سے جھومتا ہوا آکر محبوب علی سے لپٹ گیا۔پھر بولا۔"تم نے ہاتھ سے چٹھی لکھی تھی۔وہی ہمارے لئے دعوت نامہ تھا۔اسے پڑھ کر ایسی خوشی ہوئی، جیسے پھر سے ہماری شادی ہو رہی ہو۔"

اس بات پر سب ہی قہقہے لگانے لگے۔محبوب نے گلے لگ کر کہا۔"خوش آمدید۔آپ بہت زندہ دل ہیں۔ویسے اچانک کیسے آگئے؟ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔"

وہ دو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔حیدر شیخ نے کہا۔"اس لئے دوڑا آیا ہوں کہ تم نے پہلی بار چٹھی لکھی ہے۔پہلی بار بلایا ہے۔دل نے کہا' تم مسلمان ہو۔ایمان تمہیں مسلم لیگ کی طرف کھینچ رہا ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔"مسلم لیگ میں آنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایمان والے ہیں ورنہ نہیں ہیں؟"

"نہیں...یہ بات نہیں ہے۔میرے کہنے کا مطلب ہے جس طرح خون خون کو کھینچتا ہے اور ایمان والے ایمان والوں کو کھینچتے ہیں۔اسی طرح ہم تمہیں کھینچ رہے ہیں اور تم ایک اسلامی جماعت کی طرف کھنچے آرہے ہو۔"

"شیخ صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ہمارا اسلام سیاسی نہیں ہے، روحانی ہے۔مسلم لیگ ایک بہت بڑی اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتی ہے۔ہم ہر نماز میں دعا مانگتے رہیں گے کہ پاکستان بن جائے مگر....."

وہ ذرا چپ ہوا تو شیخ نے پوچھا۔"مگر....؟"

"دنیا میں بہت سے اسلامی ملک ہیں۔ہم ادھر جا کر نہیں رہتے۔اس لئے پاکستان بنے گا تب بھی ناگ پارا میں رہیں گے اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ میل محبت سے رہیں گے۔"

وہ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔"آپ بتائیں ہم پاکستان کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ دعائیں کر سکتے ہیں۔خدا گواہ ہے میں دل سے چاہتا ہوں کہ اس دنیا کے نقشے میں ایک اور اسلامی ملک قائم ہو جائے۔آپ ہم سے اور کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے کہا۔"ہندو رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔یہاں اخبار نہیں آتا تو تم لوگوں کو پتہ نہیں چلتا۔بنگال بہار اور یوپی میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہے۔اس سے پہلے کہ ہندو درندے یہاں تک پہنچیں، تم لوگوں کو ہتھیاروں سے

ساتھ ہوشیار رہنا چاہئے۔'

محبوب نے کہا۔''ہمارے گھروں میں صرف لاٹھیاں رہتی ہیں۔ہم جنگلی جانوروں کو بھگاتے ہیں۔آپ کو کسی گھر میں ہتھیار نہیں ملے گا اور نہ ہم رکھیں گے۔ یہاں کوئی مسلمان ہندو پر اور کوئی ہندو مسلمان پر لاٹھی نہیں چلاتا۔آپ ہماری فکر نہ کریں۔ہم یہاں کبھی دنگا فساد ہونے نہیں دیں گے۔''

''تم نہیں ہونے دو گے'لیکن اچانک آگ بھڑکے گی تو بجھا نہیں پاؤ گے۔جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔یہ ہماری تمہاری شرافت ہے کہ ہندوؤں سے نہیں لڑتے ہیں مگر وہ الزام دیتے ہیں کہ ہم فسادی ہیں،ہم درندے ہیں۔اور چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ لڑ کے لیں گے پاکستان....''

''ایسے نعرے کیوں لگاتے ہیں؟''

شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔''بھئی اس کے یہ معنی نہیں ہیں، جو ہندو سمجھتے ہیں۔ہم کہتے ہیں ہمارے بچے ہمارے لڑکے بالے پاکستان بنالیں گے۔''

سب ہنسنے لگے'ایک نے کہا۔''ہم کہتے کچھ ہیں'ہندو شر پسند سمجھتے کچھ ہیں۔''

محبوب نے کہا۔''لڑ کے' کہنے میں بھی شر پسندی ہے۔ایک اسلامی ریاست قائم کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔پھر کیوں کہتے ہیں کہ لڑ کے لیں گے پاکستان؟''

شیخ نے کہا۔''تم تو بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہو۔یہ مان لو کہ ہندو فسادی ہیں۔''

''ہمارے ناگ پارا میں کوئی ہندو کوئی مسلم فسادی نہیں ہے۔ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سیاست میں نہیں پڑیں گے۔ہم یہاں بڑے سکھ چین سے جی رہے ہیں۔آپ سے گزارش ہے کہ ہمیں جینے دیں۔''

حیدر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم یہاں نہ آیا کریں؟''

''آپ ضرور آئیں'جم جم آئیں۔مگر ہتھیار نہیں پھول لے کر آئیں۔''

وہ اپنے حواریوں کے ساتھ تانگے پر جا کر بیٹھ گیا۔محبوب نے السلام وعلیکم، خدا حافظ کہا۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔گھوڑے کو غصہ دکھایا۔تانگہ آگے بڑھانے کے لئے اسے زور کی چابک ماری تو وہ بدک گیا۔ہنہناتا ہوا اگلی دو ٹانگوں سے اٹھ

کر پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔پیچھے بیٹھے ہوئے حواری گر پڑے۔وہ آگے تھا گرتے گرتے سنبھل گیا۔لگام کھینچ کر گھوڑے کو قابو میں کرنے لگا۔

وہ غصہ دکھا کر مشکل میں پڑ گیا تھا۔گھوڑا بڑی مشکل سے قابو میں آیا تو اسے دوڑاتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔محبوب اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔''اچانک آگ بھڑکے گی تو بجھا نہیں پاؤ گے۔جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔''

ناگ پارا میں کیا پیسے والے، کیا غریب' کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب ہی پیار سے اور امن و امان سے رہتے تھے۔بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا تھا کہ کہیں سے آگ نہیں بھڑکے گی۔

مگر بھڑک سکتی تھی۔دھرمو نے اسلام قبول کر کے بارود بجھا دی تھی۔

اگر چہ یہ راز منتو دھرمو اور محبوب علی کے بیچ تھا اور ان تینوں کے پیٹ سے یہ بات باہر آنے والی نہیں تھی۔پھر بھی توقع کے خلاف کب کیا ہو جاتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔

سلطانی بیگم نے بھی عہد کیا تھا کہ بیٹی کے ساتھ جو ہو چکا ہے' اس بات کو گھر سے باہر نہیں جانے دے گی۔مگر کیا کرتی' اس کے پاؤں بھاری ہوتے ہی محبوب کے دروازے پر جانا پڑا۔اسے راز دار بنانا پڑا۔قسمت اچھی تھی۔وہ ہمراز فرشتہ بن کر تمام بدنامیوں پر پردہ ڈال رہا تھا۔

پھر یہ بھید بلقیس کو معلوم ہوا وہ بھی پردہ رکھنے والی تھی مگر رفتہ رفتہ قدرتی حالات سمجھ میں آتے ہیں کہ بھید چھپائے نہیں چھپتا۔آگے اور کھلتا چلا جاتا ہے۔

محبوب نے بھی عہد کیا تھا کہ دھرمو کا راز کھلنے نہیں دے گا۔لیکن حیدر شیخ خطرے کی گھنٹی بجا گیا تھا۔منتو اور دھرمو کے نیچے بارود سرنگ بچھی ہوئی تھی۔کسی وقت بھی دھماکہ ہو سکتا تھا۔

منصور نے ظہر کی نماز سے ابتداء کی۔مسجد کے پیش امام مولانا اجمیری نے کہا۔

''بسم اللہ....پہلی بار خدا کے گھر آئے ہو۔خدا کرے پانچوں وقت آتے رہو۔تم پر رحمتیں نازل ہوں۔آج یہاں ہو،کل مکے مدینے جاؤ۔''

وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''پتہ نہیں میں گھر سے یہاں تک کیسے آ گیا ہوں؟ یہ پیش امام مجھے مکّے مدینے بھیج رہا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''آپ مجھے بتائیں ظہر کی نماز کتنی دیر تک پڑھی جاتی ہے؟ کتنی مرتبہ اٹھنا بیٹھنا اور سجدے کرنا ہوگا؟''

مولانا نے سمجھایا۔ ''نماز کے متعلق اس طرح نہیں پوچھا جاتا۔ یوں پوچھو کہ ظہر کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں اور رکعت کیا ہوتی ہے؟ میں تمہیں ایک ایک وقت کی نماز سکھاؤں گا تو تم سیکھ جاؤ گے۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''جو نماز آسان ہو، وہی سکھائیں۔ بعد میں مشکل نمازیں بھی پڑھا کروں گا۔''

مولانا نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاتھ نہ جوڑو۔ تم مندر میں نہیں مسجد میں آئے ہو۔ خدا کے گھر میں یوں سینے سے ذرا نیچے ہاتھ باندھ کر سر جھکاتے ہیں۔''

وہ اسے ادب سے باتیں کرنے اور نماز پڑھنے کے طریقے سکھانے لگے۔ وہ بے دلی سے سیکھ رہا تھا۔ عصر مغرب اور عشاء کے وقت بھی وہ مسجد سے گھر اور گھر سے مسجد جاتا رہا۔ جو کام دل سے نہ کیا جائے وہ بوجھ لگتا ہے۔ مولانا اسے عشاء کی نماز تک سورہ فاتحہ اور تینوں قل زبانی یاد کراتے رہے۔ وہ بھولتا رہا اور یاد کرتا رہا اور جھنجھلاتا رہا۔

جب وہ عشاء کے بعد گھر جانے لگا تو مولانا نے کہا۔ ''میں تمہارے اندر کی جھنجھلاہٹ کو سمجھ رہا ہوں۔ تم ایک کافر ہو مسجد میں آ گئے ہو۔ تمہیں مسلمان بنانے میں بہت وقت لگے گا۔ جاؤ میں تمہارے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں۔''

وہ گھر آ کر مویشیوں کے باڑے میں لیٹ گیا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دماغ میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی کہ نماز نہ پڑھے، ناگ پارا چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یا اتنی طاقت حاصل کر لے کہ محبوب کا سر کچل دے۔

دونوں ہی باتیں ممکن نہیں تھیں۔ گناہ قبول کرنا آسان نہ تھا۔ بستی کے تمام لوگ اس پر تھوکتے پھر وہ قانونی گرفت میں آ جاتا۔ جیل جاتا، چکی پیستا اور ڈنڈے کھاتا

رہتا۔ ایک رات کی دیدہ دلیری اور عیاشی مہنگی پڑ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نماز روزے تمام عمر کے لئے گلے پڑ جائیں گے۔

ایسے بیشمار مسلمان ہیں جو نماز روزوں کو مصیبت کہتے ہیں۔ اس نے پہلے دن چار وقت کی نمازیں پڑھی تھیں۔ بس اٹھتا بیٹھتا اور سر جھکاتا رہا تھا۔ پیش امام اونچی آواز میں آیات پڑھتے رہتے تھے اور وہ محبوب کے شکنجے سے نکلنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔

ایسا ہوتا ہے جب دل مائل نہ ہو تو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے والا بھی دل کے صنم خانوں میں پہنچ جاتا ہے۔ نماز کی نیّت باندھنے کے بعد بھی اسے پارو یاد آتی رہی تھی۔ اسی کی وجہ سے اسے مسجد میں آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔

صبح دن چڑھے تک سونے کی عادت تھی۔ فجر کی نماز کے لئے بیدار نہ ہو سکا۔ اس نے ظہر کی نماز کے وقت مولانا سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ناغہ نہیں کرے گا۔ رات کو گھڑی میں الارم لگا کر سوئے گا۔

مولانا خاموش رہے۔ پھر وہ جان بوجھ کر عصر کی نماز پڑھنے نہیں آیا۔ مسجد میں آ کر مغرب کی نماز پڑھی۔ توقع کے مطابق مولانا نے شکایت نہیں کی۔ وہ خاموش تھے۔ اس سے بات نہیں کر رہے تھے۔

تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ محبوب علی بہت مصروف ہے۔ شادی کے نشے میں سرشار ہے۔ اتنی فرصت نہیں مل رہی ہے کہ اس مجرم کی طرف توجہ دے سکے۔ یہ ایسی بات تھی کہ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے نماز عشاء کی بھی چھٹی کر دی۔

ایسا لگ رہا تھا گلے سے پھندا اُتر گیا ہے۔ وہ مویشی کے باڑے میں آ کر اپنی کھاٹ پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ بہت ساری بکریاں ممنا رہی تھیں۔ وہ ایسے جھوم رہا تھا جیسے وہ سب کی سب آزادی کا نغمہ الاپ رہی ہوں۔ آزادی حوصلہ دے رہی تھی کہ وہ فجر کی بھی چھٹی کر سکتا ہے۔

اس نے محبوب علی کی مصروفیات کا حساب کیا۔ ''کل اور پرسوں مہندی کی رسمیں ادا کی جائیں گی۔ پھر جمعہ کو نکاح پڑھایا جائے گا۔ یعنی کہ وہ شادی کی مسرتوں اور انتظامات میں ایسا مصروف رہے گا کہ میری طرف دھیان نہیں دے گا۔ میں تین دن

تک کبھی مسجد جاؤں، کبھی نہ جاؤں تو وہ میری نمازوں کا حساب کرنے نہیں آئے گا۔"

وہ سوچ رہا تھا' ان تین دنوں میں نجات کا کوئی راستہ ڈھونڈ لینا چاہئے۔ دشمن غافل ہے۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ایک بات ذہن میں آ رہی تھی کہ محبوب کانگریسی ہے' مسلم لیگی اس کے مخالف ہوں گے۔ اسے رکاوٹ سمجھ کر راستے سے ہٹانا چاہتے ہوں گے۔ مجھے ان سے مل کر اسے ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا دینا چاہئے۔

سوچتے سوچتے ذہن تھک گیا۔ آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں پارو کو دیکھا۔ وہ روٹھی ہوئی تھی۔ شکایت کر رہی تھی۔ 'کیا میں ایسی گئی گزری ہوں کہ ایک ملاقات کے بعد بھول گئے پھر پلٹ کر نہیں آئے؟"

"ہائے.... کتنی پیاری اور دلفریب شکایت تھی۔ وہ اسے بڑے پیار سے طلب کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں مجبور ہو گیا ہوں۔ وہ بن مانس گوریلا راستہ روک رہا ہے۔"

پارو نے پوچھا۔ "کیا میری خاطر ایک رکاوٹ دور نہیں کر سکتے؟ حوصلہ کرو گے تو اسے لات مار کر میرے پاس آسکو گے۔"

"حوصلہ ہی تو نہیں ہو رہا ہے۔"

"میں دوا لائی ہوں۔ جسے پینے کے بعد تم چوہے سے شیر بن جاؤ گے۔"

وہ دارو کی بوتل اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ "اسے پی کر اتنے دلیر ہو گئے تھے کہ میرے گھر میں گھس آئے تھے۔ اسے پیو اور رقیب کو ٹھوکر مارو۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ یہ کھوپڑی اُلٹا دیتی ہے۔ میں نہیں پیوں گا۔"

"تم پیو گے۔ میرے پاس آؤ گے۔ تمہیں پینا ہی ہو گا۔"

اس نے بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ وہ انکار کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کیسے نہیں پیو گے؟ تمہارا تو باپ بھی پیئے گا۔"

اس نے بوتل کو منہ میں گھسا دیا۔ دارو حلق میں گئی تو ایکدم سے آنکھ کھل گئی۔ اس پر چند سائے جھکے ہوئے تھے۔ بوتل منہ میں گھسی ہوئی تھی اور وہ اسے اپنے

ڈھنگ سے پینے پر مجبور کرتے جا رہے تھے۔

اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ انکار میں سر ہلاتا تو گلا دبا دیا جاتا۔ گھونٹ لینے سے انکار کرتا تو ناک چٹکی میں دبائی جاتی۔ وہ سانس لینے کے لئے مجبوراً پینے لگتا تھا۔ آخر اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے ان کی مرضی کے مطابق پینے لگا۔

ایک پوا پیتے ہی سر چکرانے لگا تھا۔ دماغ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ ایسے وقت کان کے قریب محبوب علی کی آواز سنائی دی۔ "تو کتا ہے۔ کتے کو مسجد میں نہیں جانا چاہئے۔ لوگ تجھے سڑکوں گلیوں اور نالیوں میں دیکھا کریں گے۔ اپنی سلامتی چاہتا ہے تو یہاں سے بھاگ جا...."

پھر اسے پلائی گئی' اتنی پلائی گئی کہ دارو الٹ کر منہ سے نکلنے لگی۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ محبوب باڑے کا بڑا گیٹ پوری طرح کھول کر اپنے پہلوانوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

رات کے تین بجے تھے۔ مقبول بکرے والے کی آنکھ کھل گئی۔ بکرے اور بکریوں کی میں میں سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ لالٹین کی بتی اونچی کرتے ہوئے بستر سے اتر کر ایک دروازے پر آیا پھر اس پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "منظور! جلدی اٹھو... دیکھو یہ جانور شور کیوں مچا رہے ہیں؟"

پھر وہ ذرا کان لگا کر سنتے ہوئے بولا۔ "ارے یہ جانوروں کی آوازیں دور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟"

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ مویشیوں کا باڑا مکان کے پیچھے تھا۔ وہ اور تیزی سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ باڑے کا بڑا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ تمام جانور وہاں سے نکل کر باہر بھاگ رہے تھے۔ انہیں قید سے رہائی مل گئی تھی۔

وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ "یا خدا! میں مر جاؤں گا۔ یہ گیٹ کس نے کھولا ہے؟"

پھر اس نے منصور کو آواز دی۔ "ارے او کتے کے بچے! تو کہاں مر گیا ہے؟"

وہ دوڑتا ہوا باڑے کے دوسری طرف آ کر رک گیا۔ لالٹین کی روشنی میں وہ کچھ

دور چاروں شانے چت پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا مردہ پڑا ہے، لیکن دور سے ہی دارو کی بو نے سمجھا دیا کہ بیٹے نے آج بھی خوب پی ہے۔

منظور بھی لالٹین اٹھائے آگیا۔ وہ دیکھ رہے تھے منصور کے ایک ہاتھ کی گرفت میں بوتل تھی۔ وہ گہری نیند میں تھا یا مدہوش تھا۔ باپ نے کہا۔ ''اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے جانوروں کو پکڑو۔''

وہ دونوں دوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگے۔ مقبول بکرے والا بول رہا تھا۔ ''بھائیو! بزرگو! جلدی آؤ۔ ہماری مدد کرو۔ میں لٹ رہا ہوں۔ برباد ہو رہا ہوں۔ یہ جانور واپس نہ آئے تو میں مر جاؤں گا۔''

جانوروں کا اور انسانوں کا شور ایسا تھا کہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر آنے لگے۔ کسی کے ہاتھ میں لالٹین' کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ وہ سب دور تک دوڑتے ہوئے جانوروں کو پکڑ رہے تھے۔ ان سب کی ملی جلی آوازوں سے غضب کا شور برپا ہو رہا تھا۔ جیسے قیامت آگئی ہو۔ عورتیں اور بچے بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ باڑے کا گیٹ کتنی دیر سے کھلا ہوا تھا؟ کتنے جانور نکل چکے تھے؟ وہ کئی گھنٹے تک انہیں گھیرتے اور پکڑتے رہے۔ پھر باپ بیٹے نے باڑے میں واپس آنے والے جانوروں کی گنتی کی تو اسی میں تیس ہاتھ آئے تھے۔ پچاس جانوروں کا ہزاروں روپے کا نقصان ہو چکا تھا۔ مقبول بکرے والا چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

ایسا ہنگامہ برپا ہوا تھا کہ دور دور سے بستی کے لوگ دوڑے چلے آئے تھے۔

بیہوش ہونے والے کو سنبھالا جا رہا تھا۔ اس کے منہ پر پانی چھڑکا گیا تو اس نے آنکھیں کھول کر بہت سی لالٹین کی روشنیاں اور بیشمار انسانی چہرے دیکھے۔ جانوروں کی میں میں گونج رہی تھی۔ وہ زمین سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مار ڈالوں گا۔ اس حرام زادے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک بزرگ نے کہا۔ '' مقبول غصہ نہ کر۔ نقصان تو برداشت کرنا ہی ہوگا۔''

ایک عورت نے کہا۔ ''جوان بیٹے کو کتنا مارو گے؟ کتنی سزا دو گے؟ تمہارے بھاگے ہوئے جانور واپس تو نہیں ملیں گے۔''

منصور کی ماں نے کہا۔ ''میرے بچے نے کل سے نماز شروع کی تھی۔ آج بھی مسجد گیا تھا۔ اس پر کوئی شیطانی سایہ پڑ گیا ہے۔ وہ سایہ اسے ایمان کی راہ سے بھٹکا رہا ہے۔''

باپ نے منظور سے کہا۔ ''میرے تو ہاتھوں پیروں میں جان نہیں ہے۔ اس ڈھیٹ کو تم مارو' اس کی کھال اتار دو۔''

منظور نے کہا۔ '' کچھ حاصل نہیں ہوگا ابا! منصور کا دماغ کھسک گیا ہے۔ پہلے دارُو شروع کی پھر نماز شروع کی۔ اب پھر بوتل لے کر پڑا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''اس کا علاج شہر کے ڈاکٹر سے کراؤ۔ کسی عامل کسی تانترک مہاراج کے پاس لے چلو۔''

منصور کھاٹ پر غافل پڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایک نے اس پر بھری ہوئی بالٹی الٹ دی تو وہ ذرا کسمسایا۔ دوسرے نے اس کا منہ کھول کر لیموں کا رس ٹپکایا، اسے جھنجھوڑا گیا، منہ پر طمانچے مارے گئے۔ اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔

ایسے ہی ہنگامے میں رات گزر گئی۔ صبح ہو گئی۔ وہ سوتا پڑا رہا۔ جب سورج سر پر آیا تو آنکھ کھلی۔ اس وقت ماں کے کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ اسے تنہائی میں سوچنے کا موقع ملا تو یاد آیا کہ پچھلی رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

اسے محبوب علی کی باتیں بھی یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ناگ پارا سے بھاگ جاؤ...''

وہ بڑی بے بسی سے سوچنے لگا' کیا کرے؟ اس دشمن سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پہلوان پھر کسی رات پٹخ کر دارُو پلانے والے تھے۔ وہ بار بار تماشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ بہت زیادہ پینے والے کو پیکّو کہا جاتا تھا۔ سب اسے یہی کہنے لگے۔

دوسرے کمرے سے باپ کی آواز سنائی دی۔ '' کیا وہ مر چکا ہے۔ آخر کب

آنکھیں کھولے گا؟"

ماں کی آواز سنائی دی۔"آپ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟اس نے جان بوجھ کر باڑے کا گیٹ نہیں کھولا تھا۔اس نے پچاس جانوروں کو نہیں بھگایا ہے۔سب ہی کہہ رہے ہیں کہ اس پر آسیب کا سایہ ہے۔کوئی بلا اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

باپ نے کہا۔"میں اس بلا کے ساتھ اسے گھر سے نکال دوں گا۔جب تک میرا نقصان پورا نہیں کرے گا،تب تک یہاں قدم رکھنے نہیں دوں گا۔"

وہ زور دار آواز کے ساتھ دروازہ کھولتا ہوا اندر آیا۔منصور کے ذہن میں فوراً یہ تدبیر آئی کہ اسے ذرا نیم پاگل بن جانا چاہیے۔وہ پاگل بیٹے کو کوئی سزا نہیں دے سکے گا،گھر سے نہیں نکالے گا۔اب وہ اسی طرح گھر میں رہ کر تین وقت کی روٹیاں کھا سکتا تھا۔

وہ باپ کو دیکھتے ہی اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔دیدے پھیلا کر بولا۔"کون ہے تُو....؟ جل تُو جلال تُو آئی بلا کو ٹال تُو...تُو ہی کل آیا تھا... ہاں تُو ہی کل آیا تھا..تُو نے کہا تھا مجھے نماز نہیں پڑھنے دے گا۔مجھے دارُو پلائے گا۔"

ماں دروازے پر تھی۔وہ قریب آتے ہوئے بولی۔"یہ آپ کو آسیب سمجھ رہا ہے۔ابھی تک اُس بلا کے اثر میں ہے۔"

وہ گرج کر ماں سے بولا۔"اے بُڑھیا کون ہے تُو؟ بھاگ جا یہاں سے۔اب میں دارُو نہیں پیئوں گا۔"

منظور بھی وہاں آ گیا تھا۔وہ سب تشویش میں مبتلا ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔
منظور نے کہا۔"اس نے پہلے بھی ایک رات میں پوری بوتل پی تھی۔کل رات بھی ایک بوتل خالی کی ہے۔دارُو اس کے دماغ پر چڑھ گئی ہے۔اسے شہر لے جانا ہوگا۔کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرانا ہوگا۔"

باپ نے غصے سے کہا۔"پچاس بکرے گئے' ہزاروں روپے ڈوب گئے۔میرے پاس کیا رہ گیا ہے؟ ڈاکٹر اور علاج کے پیسے کیا تمہارا باپ دے گا؟"

ماں نے کہا۔"دیکھو یہ کیسے دیدے پھیلائے بیٹھا ہے۔سامنے کسی کو دیکھ رہا

ہے۔میں اسے تانترک مہاراج کے پاس لے جاؤں گی۔وہ بڑے بڑے بھوت بھگا دیتے ہیں۔"

وہ آپس میں بحث کر رہے تھے۔منصور کھاٹ کے سرے پر بیٹھے بیٹھے بستر پر گر پڑا۔وہ تینوں فوراً ہی اس کے قریب آئے۔تو دیکھا اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔وہ نیند میں ڈوب گیا تھا۔ماں نے آواز دی پھر کہا۔"اسے سونے دو۔یہاں سے چلو۔میں ابھی تانترک مہاراج کو بلاتی ہوں۔"

وہ ایک ایک کر کے وہاں سے جانے لگے۔اس نے تھوڑی دیر بعد دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو آنکھیں کھول دیں۔اطمینان کی سانس لی۔اطمینان یہ تھا کہ باپ جوتے نہیں مارے گا۔بھائی اس کی پٹائی نہیں کرے گا۔اس نے طے کر لیا کہ فی الحال پاگل بن کر ہی رہنا چاہیے۔

اس طرح وہ محبوب کو بھی اُلّو بنا سکتا تھا۔وہ بھی یہی رائے قائم کرتا کہ دارُو اس کے دماغ پر چڑھ گئی ہے۔اب وہ پاگل ہو گیا ہے۔آئندہ پاگل کو سزا دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

یوں ناگ پارا میں یہ مشہور ہو گیا کہ مقبول بکرے والے کا بیٹا منصور پاگل ہو گیا ہے۔مرد،عورتیں،بچے اور بوڑھے اسے دیکھنے آ رہے تھے۔وہ مکان کے باہر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ایک نوکیلے پتھر سے زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر کسی کو بلاتا تھا۔کبھی ایسی حرکتیں کرتا تھا،جیسے زیرِ لب کچھ پڑھ کر اُچھل کر چھو منتر کہہ رہا ہو۔بچے دور بھاگ جاتے تھے پھر آ جاتے تھے اس سے دلچسپی لے رہے تھے۔

عورتیں اس کے پاگل ہو جانے پر افسوس کر رہی تھیں۔وہ سب سے پوچھتا تھا۔
"میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میرے پاس آؤ' میرے ساتھ کھیلو...اے چھبیلی' میرے سنگ بیاہ رچائے گی؟"

ایک شخص اس کا ہاتھ پکڑ اسے ناگ پارا کی سیر کرانے لگا۔اسے سمجھانے لگا۔"ہم تم یہیں پیدا ہوئے تھے۔تم یہاں کی ایک ایک گلی' ایک ایک مکان اور ایک فرد سے واقف ہو۔ابھی بھول گئے ہو۔ہم تمہیں یاد دلائیں گے۔"

اس نے شام تک یہ ثابت کردیا کہ واقعی یادداشت کھو چکا ہے اور تقریباً پاگل ہو چکا ہے۔محبوب علی نے آکر اسے دیکھا۔اس سے باتیں کیں۔اس نے بڑے بھولپن سے وہی سوال کیا۔''کیا تم مجھے جانتے ہو؟میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ سب کہتے ہیں میں بکرے والے بڈھے کا بیٹا ہوں۔مگر وہ بڈھا مجھے ایک ذرا اچھا نہیں لگتا۔میں اس کا بیٹا نہیں ہوں۔''

محبوب کو یقین ہوگیا۔اس نے کہا۔''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دارو یوں اثر دکھائے گی۔فی الحال تمہارے لئے یہ سزا اچھی ہے کہ پاگل ہوگئے ہو اور وہ تمہارا کنجوس باپ تمہارا مہنگا علاج نہیں کرائے گا۔''

محبوب نے اپنی بگھی ایک طرف کھڑی کردی۔منصور کے پیچھے بولتا جارہا تھا۔

پھر اس نے چونک کر پوچھا۔''اے!تم جانتے ہو کدھر جارہے ہو؟''

اس نے پوچھا۔''میں کدھر جارہا ہوں؟ بھائی! تم کون ہو؟میرے پیچھے کیوں آرہے ہو؟''

''تمہارا پاگل پن دیکھ رہا ہوں۔اپنے آپ کو بھول گئے ہو۔مگر پارو کو شائد نہیں بھولے۔''

اس نے رک کر پوچھا۔''کون پارو؟''

''وہی جس کے گھر کی طرف جارہے ہو۔بولو وہ سامنے والا گھر کس کا ہے؟''

ادھر بچے کھیل رہے تھے۔عورتیں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔وہ سب اسے دیکھ کر رک گئیں۔اس کے پاگل ہونے پر افسوس کرنے لگیں۔ایک نے محبوب سے کہا۔''دولہے میاں!کل تمہارا نکاح ہے۔تمہیں دلہن کے دروازے پر نہیں آنا چاہئے۔''

محبوب نے کہا۔''میں اس پاگل کو سمجھاتا آرہا ہوں۔دیکھنا چاہتا ہوں ادھر کیوں آیا ہے؟''

سلطانی بیگم اور بنّے میاں باہر آئے۔محبوب نے سلام کرتے ہوئے کہا۔''اس پاگل کے پیچھے آیا ہوں۔دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ ادھر کیوں آیا ہے؟''

سلطانی نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔''خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں

ہے۔یہ زندہ ہے مگر مر چکا ہے۔جب دنیا کو پہچاننے والا دماغ نہیں ہے تو پھر کیسی یہ زندگی ہے؟''

ایسے وقت بلقیس باہر آئی۔محبوب نے اسے سلام کیا۔وہ دعائیں دیتے ہوئے بولی۔''کیسے آگئے میاں؟ آج ادھر نہیں آنا چاہئے تھا۔''

وہ پھر بولا۔''اس پاگل کے پیچھے آیا ہوں۔''

بلقیس کو ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔سلطانی نے یقین سے کہا تھا کہ اس رات واردات کرنے والے کا نام منصور ہے۔بنّے میاں نے بلقیس سے کہا۔''آپا!یہ وہی کتا ہے۔ہم چاہتے تھے' یہ مرجائے خدا کی قدرت دیکھیں یہ زندہ ہے مگر مر چکا ہے۔''

بلقیس زیر لب اسے گالیاں دینے لگی۔پھر چپ ہوگئی۔محلے کی کئی عورتیں ان کے قریب آگئی تھیں۔منصور کو دیکھ کر افسوس کررہی تھیں۔اس سے ہمدردی جتا رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔''یہ کیا غضب کا آئیڈیا ہے۔سب کو اُلّو بنا رہا ہوں۔گالیاں بھی سن رہا ہوں اور ہمدردی کرنے والے دعائیں بھی دے رہے ہیں۔''

وہ ایک پاگل کے انداز میں سامنے کھلے ہوئے دروازے کو تک رہا تھا۔وہاں سے آنگن کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔دل کہہ رہا تھا' شائد وہ بھی دکھائی دے گی۔

اسے ایک بار پایا ہے دوسری بار پانے کی ہوس ہے۔نہ پاسکوں تو دیکھنے کی ہوس ہے۔اس پاگل پن سے کچھ تو فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔''

محبوب اسے بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔اسے کچھ شبہ ہو رہا تھا۔وہ کھلے ہوئے دروازے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔''یہ کس کا گھر ہے؟''

سلطانی بیگم نے کہا۔''ہمارا ہے۔''

اس نے پوچھا۔''میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''کیوں آئے ہو؟ جاؤ یہاں سے....

''نہیں جاؤں گا۔کوئی مجھے دھکا دیتے دیتے لایا ہے۔''

محبوب علی نے کہا۔''کسی نے تمہیں دھکا نہیں دیا ہے۔تم خود یہاں آئے ہو۔''

"نہیں۔ سچ بولتا ہوں۔ کوئی اب بھی دھکا دے رہا ہے۔ میرے دماغ میں بول رہا ہے اندر جاؤ... گھر کے اندر جاؤ۔"

بلقیس نے کہا۔ "ہمارے دروازے پر پاؤں رکھو گے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

محبوب نے کہا۔ "ذرا ایک منٹ... یہ ایسا دیدہ دلیر نہیں ہے کہ ہمارے گھر کے اندر جانے کی بات کرے گا۔ یہ سب کچھ بھول چکا ہے اور بھولنے کے بعد بھی اس کا ضمیر پچھتاوے کے لئے اسے یہاں لے آیا ہے۔ اسے اندر جانے کو کہہ رہا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آرہا ہے۔"

بنّے میاں نے کہا۔ "یہ نہ سمجھتے ہوئے بھی پچھتا رہا ہے تو پچھتائے۔ ہم اسے اندر نہیں جانے دیں گے۔"

سلطانی نے کہا۔ "ہاں۔ ہمیں بدنام نہیں ہونا ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ بھولا ہوا ہے۔ پچھلی کوئی بات کسی سے نہیں بول پائے گا۔"

سلطانی بیگم نے پوچھا۔ "محبوب علی! تم چاہتے کیا ہو؟"

"یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ قدرتی حالات اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟ یہ اندر کیوں جانا چاہتا ہے؟ آپ اسے اندر جانے دیں۔ اگر بات بگڑے گی تو سنبھالنے والا میں ہوں۔ کسی بھی طرح کی بدنامی کو ڈھانپنے والا میں ہوں۔"

بلقیس سلطانی اور بنّے میاں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر بلقیس نے کہا۔ "میں جاکر پردہ کراتی ہوں۔ کسی باہر والی کو اندر نہ آنے دو۔ میرے اندر بھی کھلبلی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہوں' یہ پاگل ہونے کے بعد یہاں کیوں آیا ہے؟"

وہ اندر چلی گئی۔ وہاں پارو کی دو سہیلیاں تھیں۔ اس نے کہا۔ "لڑکیو! تھوڑی دیر کے لئے باہر جاؤ۔ محبوب یہاں آئے ہیں۔ ہمیں ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہاں دو بوڑھیاں بھی تھیں۔ وہ سب باہر چلی گئیں۔ پارو نے پوچھا۔ "پھوپھی! محبوب علی کیوں آئے ہیں؟"

"اس کے ساتھ منصور بھی آیا ہے۔"

یہ بات کھٹ سے دماغ میں لگی۔ اس نے نفرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں آیا

ہے؟ وہ تو پاگل ہوگیا ہے۔"

"ہاں۔ اپنے آپ کو بھی بھول چکا ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ادھر تمہارے پاس کیوں آنا چاہتا ہے؟"

"وہ بھولنے کے بعد بھی آرہا ہے تب بھی نہ آنے دیں۔ میں اسے دیکھنا تو کیا اس پر تھوکنا بھی نہیں چاہتی۔"

"تھوکنا چاہئے۔"

اس نے چونک کر پھوپھی کو دیکھا۔ وہ اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر بولی۔ "یہی موقع ہے۔ مجرم تمہارے سامنے آرہا ہے۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالو۔ جوتے مارو اس پر تھوک دو۔"

وہ پھوپھی سے لپٹ کر بولی۔ "میں تو اسے مار ڈالنا چاہتی ہوں۔ اس کے ٹکڑے کرنا اسے کچل دینا چاہتی ہوں۔"

"نہیں بیٹی! قدرت کی لاٹھی اسے مار رہی ہے۔ یہی بہت ہے۔ میں جتنا کہہ رہی ہوں اتنا ہی کرو۔"

بلقیس نے باہر آکر کہا۔ "اس پاگل کو لے آؤ۔"

باہر سلطانی بیگم نے اور بنّے میاں نے محلے کی عورتوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک پاگل کو دلہن دکھائیں گے اور محبوب سے ذاتی معاملات پر باتیں کریں گے۔ اس لئے ابھی کوئی گھر میں نہ آئے۔

وہ سب اندر آگئے۔ آنگن کے دروازے کی چٹخنی لگا دی گئی۔ منصور اپنی مسرتوں کو چھپا رہا تھا۔ جو چاہتا تھا وہ ہو رہا تھا۔ ابھی معشوق کا دیدار ہونے والا تھا۔

پارو کے آنگن میں قدم رکھتے وقت محبوب کا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اگرچہ دیدار ہونے والا نہیں تھا آج وہ پردہ کرنے والی تھی پھر بھی اس کے بہت قریب پہنچنے سے ایک عجیب طرح کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پاگل آنگن میں آکر متلاشی نظروں سے دیکھتا ہوا کبھی ادھر کبھی ادھر جا رہا تھا۔ پھر وہ برآمدے میں آگیا۔ وہ سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

پارو کمرے میں تھی۔ کھڑکی کے پیچھے کھڑی صرف منصور کو ہی نہیں محبوب کو بھی

دیکھ رہی تھی۔دو عاشق جوان تھے۔ان میں سے ایک اسے حاصل کر چکا تھا' دوسرا حاصل کرنے والا تھا' ایک کے چہرے سے نفرت تھی اور دوسرے سے ....؟

وہ سوچتے سوچتے رک گئی۔محبوب کو دیکھنے لگی۔جو نیک نامی دے رہا ہے۔سر پر بٹھا رہا ہے۔اس سے نفرت ہو نہیں سکتی تھی۔لیکن بیزاری بھی کیوں تھی؟

اس وقت منصور کے مقابل اسے دیکھا تو شدت سے یوں لگا، جیسے فرشتہ ابھی آسمان سے اتر کر اس کے آنگن میں آگیا ہے۔

منصور نے ایک کمرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔''مجھ کو لگتا ہے میں یہاں آیا تھا۔کیا میں یہاں آیا تھا؟''

جیسے وہ پاگل بن کر چیلنج کر رہا تھا۔''ہاں۔میں یہاں کھڑا ہو کر کہہ رہا ہوں یہاں آیا تھا۔کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

محبوب اسے گہری سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اس نے بلقیس اور سلطانی کی طرف جھک کر کہا۔''شائد اس کا ضمیر اسے جگا رہا ہے۔اسے کچھ یاد آ رہا ہے۔یہاں اس کی یادداشت بھی واپس آسکتی ہے۔ہم قدرتی معاملات کو سمجھ نہیں پاتے اور کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔''

سلطانی نے کہا۔''اسے کچھ یاد نہ آئے۔یہ پاگل رہ کر مر جائے۔''

وہ برآمدے سے گزر کر پارو کے دروازے پر پہنچا۔وہ اندر سے بند تھا۔اس نے دل میں کہا۔''میری جان! کیوں چھپی بیٹھی ہے؟ تیرا کھلاڑی آیا ہے۔دروازہ کھول ...یہ دنیا کبھی تجھ سے ملنے نہ دیتی۔دیکھ لے۔میں پاگل دیوانہ بن کر آیا ہوں۔''

بلقیس نے کھڑکی کے پاس آ کر کہا۔''بیٹی! دروازہ کھولو۔شروع ہو جاؤ۔''

ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔حسن یار نے جلوہ دکھایا اور دکھاتے ہی منہ بھر کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔وہ ایکدم سے بوکھلا گیا۔کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دربارِ حُسن میں یوں پذیرائی ہو گی۔اب تو مجبوری تھی پاگل پن کو قائم رکھنا تھا۔

وہ قمیض کے دامن سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔''میں جان گیا' پہچان گیا۔تم وہی ہو۔کل رات کو آئی تھیں۔مجھ سے جھگڑا کر رہی تھیں۔''

بات ختم ہوتے ہی منہ پر چپل پڑی۔ایسی پڑی کہ آنکھوں کے سامنے قمقمے جلنے بجھنے لگے۔معشوق بجھ گئی تھی۔چپل تڑ تڑا روشن ہو رہی تھی۔کبھی منہ پر، کبھی سر پر، کبھی شانے پر پڑ رہی تھی۔

عقل نے سمجھایا۔''منصور بیٹے آگے اور بہت کچھ ہو سکتا ہے۔اپنی سلامتی کی فکر کرو۔بھاگو یہاں سے...''

وہ پلٹ کر بھاگنا چاہتا تھا۔محبوب نے ایک لات ماری۔وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔پارو نے محبوب کو دیکھا۔پہلی بار اس نے نظریں نہیں پھیریں۔پہلی بار اس نے بیزاری محسوس نہیں کی۔شاید اس لئے کہ اس نے ایک شیطان لٹیرے کو لات ماری تھی۔اسے آسودگی کا احساس ہوا تھا۔دل کا غبار نکل رہا تھا۔

اس نے پھر چپل چلائی۔وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے بولا۔''یہ کون ہے؟ مجھے کیوں مار رہی ہے؟ خواب میں بھی آ کر مجھ سے جھگڑا کر رہی تھی۔مجھے اس سے بچاؤ۔''

محبوب نے قریب آ کر کہا۔''مجھے شبہ ہے۔تم پاگل بن رہے ہو۔''

وہ بے اختیار بولا۔''نہیں۔میں سچ مچ پاگل ہوں۔''

''اچھا تو پاگل خود کو پاگل کی حیثیت سے پہچان رہا ہے؟''

آں....اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔وہ بولا۔''تم دونوں مجھے کیوں مار رہے ہو؟ مجھے جانے دو۔''

محبوب نے اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چیر ڈالا۔پھر کہا۔''پاگلوں کو اپنا ہوش نہیں رہتا۔پھر وہ لباس کیسے پہن سکتے ہیں؟ میں نے دہلی میں ایک پاگل کو ننگا گھومتے دیکھا تھا۔ناگ پارا کے مرد عورتیں بھی تمہیں ننگا دیکھیں گے۔''

وہ گڑگڑانے لگا۔''مجھے چھوڑ دو۔یوں ننگا نہ کرو۔'

'تم تو پاگل ہو۔لباس کی اہمیت کو کیسے سمجھ رہے ہو؟''

اس نے خواتین سے کہا۔''آپ سب کمرے میں جائیں۔میں اسے اصلی پاگل

بنا رہا ہوں۔"

اس نے پاجامے پر ہاتھ ڈالا تو وہ نہیں کہتا ہوا فوراً ہی فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔"تم بہت ضدی ہو۔میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے۔مجھے معاف کر دو۔یہاں سے جانے دو۔"

"تم پاگل پن کا ڈھونگ کیوں رچا رہے تھے؟"

"میں پاگل بن کر نہیں رہوں گا تو ابا پچاس جانوروں کا نقصان پورا کرنے کے لئے روز مجھے ڈنڈے مارتا رہے گا۔"

سلطانی بیگم نے دو ہتڑ مارتے ہوئے کہا۔"تُو نے اس گھر کی عزت مٹی میں ملا دی۔ ہماری عزت واپس لا..... بول کہاں سے لائے گا؟میں تجھے تڑپ تڑپ کر سسک سسک حرام موت مرتے دیکھوں گی تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔"

پارو دروازے کی آڑ میں ہوگئی تھی۔محبوب سے رسمی پردہ کر رہی تھی۔اس نے منصور کو اس کے قدموں میں لاکر اس پر تھوکنے کا موقع دیا تھا۔اسے جوتے مار کر دل سے ذرا بوجھ اتر گیا تھا۔وہ چپکے چپکے اس کا احسان مان رہی تھی۔

یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ جسے مجبور ہو کر اپنا رہی ہے وہی اوّل رہے گا، وہی آخر رہے گا۔ساری عمر مضبوط ڈھال بن کر اسے نیک نام رکھے گا...پہلی بار اس میں تبدیلی آرہی تھی۔پہلی بار وہ غرور ہار رہی تھی۔

بلقیس نے منصور پر تھوکتے ہوئے کہا۔"محبوب میاں!اس غلاظت کو باہر لے جا کر پھینکو۔خیال رکھو باہر والے باتیں نہ بنائیں۔"

وہ منصور سے بولا۔"جیسے آئے تھے، ویسے ہی پاگل بن کر یہاں سے نکلو۔ہوش مندی سے بولو گے تو وہیں گلا دبوچ کر مار ڈالوں گا۔"

وہ اسے دھکے دیتا ہوا آنگن کے دروازے پر آیا۔پھر باہر نکلنے سے پہلے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔جیسے پاگل کو سہارا دے رہا ہو۔اس گھر سے نکلتے وقت کتنے ہی لوگوں نے اس کا پھٹا ہوا لباس دیکھا اور پوچھا کہ اس کی یہ حالت کیسے ہوگئی ہے؟

محبوب نے بات بنائی۔"اس پر اچانک دورہ پڑا تھا۔میں قابو میں نہ لاتا تو یہ ننگا ہو جاتا۔اس بیچارے کو شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔"

وہ بگھی کے پاس آکر اس پر بیٹھ گیا۔پھر بولا۔"جاؤ یہاں سے۔اور یاد رکھو اسی طرح پاگل بن کر ہمیشہ ناکارہ بن کر رہو گے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔کبھی سزا نہیں دوں گا۔"

وہ گھوڑے کو ہانکتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔اس کے دل میں شادیانے بج رہے تھے۔اس نے پہلی بار پارو کی نظروں میں احسان مندی اور اپنائیت دیکھی تھی۔دل باغ باغ ہو رہا تھا۔کہیں تنہائی میں جا کر ناچنے کو جی کر رہا تھا۔

منصور ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔"بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔" کے مصداق اس کی بڑی توہین ہوئی تھی۔وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔پارو کا تھوک اب تک چہرے پر جل رہا تھا۔انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔چپل منہ سر پر اور دل پر پڑ رہی تھی۔

اس نے بڑی اچھی تدبیر کی تھی۔پاگل بن کر جانے سے حسن کی جلوہ نمائی آسان ہوگئی تھی۔اب جھنجھلا رہا تھا' اس کی شامت اسے وہاں لے گئی تھی۔

وہ دل ہی دل میں قسمیں کھا رہا تھا کہ پارو اور محبوب سے انتقام لے گا۔کیسے لے گا...؟یہ ابھی نہیں جانتا تھا۔یہ سنا تھا کہ ایک چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے تو وہ مر جاتا ہے، وہ چیونٹی تھا مگر حوصلہ کر رہا تھا۔

وہ بدستور پاگل بن کر ناگ پارا کی گلیوں اور محلوں میں گھومنے لگا۔دوسرے دن بنیا بنواری لال کے گھر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔وہاں شمبھو دادا اپنے کارندوں کے ساتھ آیا تھا۔بنواری لال کو اس علاقے میں کانگریسی لیڈر بنانے کے لئے محبوب علی کے خلاف بول رہا تھا۔ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے والی باتیں کر رہا تھا۔

منصور ایک کھڑکی کے پاس آکر ان کی باتیں سننے لگا۔اس کے ذہن میں یہ بات کلبلا رہی تھی کہ وہ شمبھو دادا کے قدموں میں بیٹھ کر محبوب علی کا سر کچل سکتا ہے۔

بنواری لال نے شمبھو دادا کو ٹکا سا جواب دیا تھا۔وہ ناگ پارا میں ہندو اور مسلمانوں کو لڑانے کے خلاف تھا۔یہ بات کانگریسی لیڈر کے منصوبے کو خاک میں ملا رہی تھی۔لہٰذا وہ غصے میں آکر وہاں سے جا رہا تھا۔

منصور کے دماغ میں تیزی سے یہ بات پک رہی تھی کہ وہ شمبھو دادا کے کام آ کر اپنا کام نکال سکتا ہے۔وہ سوچنے لگا۔وہاں وہ پاگل تھا۔اس لیڈر سے بات نہیں کرسکتا تھا۔شہر جانے کے لئے دکاندار اسے سائیکل کرائے پر نہ دیتا۔کوئی تانگے والا بھی اسے نہ لے جاتا۔

ان حالات میں وہ پیدل ہی چل پڑا۔دو کوس کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔وہ آرام سے چلتا ہوا منصوبے بناتا ہوا پیلے تالاب کے پاس پہنچا۔وہاں کانگریس پارٹی کا دفتر تھا۔اس نے کارندے سے کہا۔''میں دادا سے ملنا چاہتا ہوں۔ناگ پارا سے ایک گرما گرم خبر لایا ہوں۔''

کارندے نے جا کر خبر کی۔اسے فوراً ہی اندر بلایا گیا۔دادا نے پوچھا۔''کون ہو تم؟اور وہ خبر کیا ہے؟''

''میرا نام منصور ہے۔میں مقبول بکرے والے کا بیٹا ہوں۔خبر یہ ہے کہ آپ ناگ پارا میں جو چاہتے ہیں وہ بنواری لال اور محبوب علی کے بغیر بھی ہو جائے گا۔''

اس نے منصور کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔پھر کہا۔''بیٹھو اور بولو کیسے ہوگا؟''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔''محبوب اور بنواری لال کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کو کبھی لڑنے نہیں دیں گے۔مگر لڑانا تو بہت آسان ہے۔اگر یہاں سے ہندو جا کر ایک مسلمان کے گھر کو آگ لگائیں۔ان کی عورتوں کی بے عزتی کرے تو ایکدم سے تعصب کی آگ بھڑک اٹھے گی۔''

وہ بولا۔''اتنی سی عقل مجھ میں بھی ہے۔میرے غنڈے وہاں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔مگر وہاں کے دو بڑے آدمی آپس میں گہرے دوست ہیں۔''

''ہاں۔محبوب بنواری لال کو باپ کے برابر سمجھتا ہے۔اسے بابو جی کہتا ہے۔''

''جہاں ہندو اور مسلمانوں میں ایسی دوستی اور رشتے داری ہو اور سب ہی انہیں اپنا بڑا مانتے ہوں۔وہاں ہمارے گنڈے جائیں گے تو مار کھا کے آئیں گے۔ان لوگوں کے پاس کوئی تو ہتھیار ہوگا؟''

''صرف محبوب علی کے گھر ایک طمنچہ اور بنواری لال کے گھر میں ایک بھالا

ہے۔باقی لوگوں کے ہاں لاٹھیاں ہیں۔''

وہ سوچنے لگا۔''ہوں۔ہمارے پاس بندوقیں ہیں۔ان کے آگے کوئی نہیں ٹھہرے گا۔مگر سب یہی کہیں گے کہ باہر کے لوگوں نے آ کر ایسا کیا ہے۔وہاں کے کسی ہندو پر الجام آنا چاہئے۔''

''الزام آئے گا۔جس گھر میں واردات کی جائے گی وہاں ایسی چیزیں چھوڑی جائیں گی، جنہیں دیکھ کر یہ یقین ہو جائے گا کہ ناگ پارا کے ہی کسی ہندو نے باہر والوں سے مدد حاصل کی ہے اور ایک مسلمان کے گھر کو تباہ کیا ہے۔''

''کیا تم ایسی چیزیں لا کر دے سکتے ہو؟''

''ہاں لاسکتا ہوں۔''

''تم تو مسلمان ہو۔مسلمانوں کے خلاف کیوں واردات کرار ہے ہو؟''

وہ اپنی روداد سنانے لگا۔شمبھو دادا بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔پھر خوش ہو کر بولا۔

''تم محبوب کے دشمن ہو تو پھر ہمارے دوست ہو۔وہ شادی کا جشن منا رہا ہے۔وہاں راتوں کو پٹاکھے پھوڑتے رہتے ہیں۔آج رات ہم بھی پٹاکھے پھوڑیں گے۔یہ بتاؤ کیا وہ لوگ تم پر شبہ نہیں کریں گے؟''

''نہیں....پورا ناگ پارا جانتا ہے کہ میں پاگل ہوں۔صرف وہ دشمن محبوب میری اصلیت جانتا ہے۔مگر مجھ پر شبہ نہیں کرے گا۔میں ابھی واپس جاؤں گا۔کوئی اتنا دھیان نہیں دے گا کہ ایک پاگل کہاں گیا تھا اور کہاں سے آ رہا ہے؟''

وہ جلد ہی شہر سے ناگ پارا کی طرف لوٹ گیا۔بڑا ٹھوس منصوبہ بنایا گیا تھا۔اسے یقین تھا کہ محبوب دوسرے دن دولہا نہیں بن سکے گا۔شادی کی دیوالی منانے والے کا دیوالیہ ضرور نکلے گا۔

حویلی کو دلہن کی طرح سجایا جارہا تھا۔ بنیا بنواری لال کا بیٹا کشوری لال طرح طرح کے رنگ برنگے سجاوٹ کے سامان لاکر حویلی کو ایسا حسن دے رہا تھا کہ شہر کے اور آس پاس کے گاؤں کھیڑوں سے لوگ دن کو دیکھنے آتے تھے اور رات گئے تک آتش بازی کے تماشوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔

محبوب نے اس کے سامنے کھانے کی پلیٹیں رکھتے ہوئے کہا۔''بھائی میاں! پہلے کھاؤ کام بہت ہوگیا۔تم تو دن رات لگے رہتے ہو پھر بھی سجاوٹ سے دل نہیں بھر رہا ہے۔''

وہ دونوں ایک تخت پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔کشوری لال نے کہا۔

''یہاں اگر بجلی ہوتی تو تم دیکھتے ایسی روشنی کرتا کہ تمہاری شادی اور ویسے تک کبھی رات نہ ہوتی۔''

''ہم نے کہا ناں بہت ہوگیا۔کھانے کے بعد کمر سیدھی کرو۔ہم تمہیں کام نہیں کرنے دیں گے۔''

''کرنے دو۔باپو آکر دیکھتے رہتے ہیں۔ان کے من میں یہ بات آنی چاہئے کہ میں تم سے تین برس بڑا ہوں۔چھوٹے بھائی کو دولہا بنانے کے لئے اتنی محنت کر رہا ہوں۔میری بھی تو شادی ہونی چاہئے۔''

محبوب نے ہنستے ہوئے کہا۔''ہم بابو جی سے کہیں گے۔واقعی اب تمہاری شادی ہوجانی چاہئے۔یوں بھی تمہاری کسی سے پریم کہانی چل رہی ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''تم کیسے جانتے ہو؟''

''ناگ پارا کوئی بہت بڑا شہر نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔تمہاری وہ رامپور پڑھنے جاتی ہے ناں؟ اور اس کا نام کلپنا ہے؟''

وہ حیرانی سے بولا۔اے علی! اتنی باتیں کیسے جانتے ہو؟''

''ہم کئی بار اسے بگھی میں رامپور لے گئے ہیں۔ایک بار اس کے ہاتھوں سے کتابیں اور کاپیاں گر گئی تھیں۔انہیں اٹھا کر دیتے وقت اس کی ایک کتاب اور کاپی میں تمہارا نام پڑھا۔اس نے قلم سے پھول پتیاں بنا کر تمہارے نام کو سجایا تھا۔''

وہ خوش ہوکر بولا''ہاں۔میں نے بھی دیکھا تھا پوچھا تھا تمہارے ماتا پتا دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟''

وہ بولی۔''میں نہیں ڈرتی۔جو نام دل پر لکھ گیا ہے، اسے آسمان تک لکھتی جاؤں گی۔''

محبوب نے کہا۔''واہ کیا بات ہے۔وہ دلیر ہے اور تم بزدل ہو۔اپنا پیار چھپا رہے ہو۔''

''بزدل نہیں ہوں۔وہ ایک برس بعد بیاہ کرلے گی۔سوچتا ہوں تب یہ بات باپو کو معلوم ہوجائے اور یہ تم ہی انہیں بتاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے۔ہم ہی یہ بات چھیڑیں گے۔''

''باپو مان جائیں گے؟''

''ہم انہیں منالیں گے۔پھر رامپور جاتے وقت وہ بگھی میں آکر بیٹھے گی تو اسے بھابی کہیں گے۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔بنواری نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔''تم دونوں بھائی کس بات پر ہنس رہے ہو؟ دوپہر کا کھانا شام کو کھا رہے ہو۔''

محبوب نے کہا۔''بابو جی! کام سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔''

''میں نے پہلے بھی سمجھایا ہے، چاہے کتنے ہی کام میں جتے رہو کھانا اور سونا سمے پر ہونا چاہئے۔''

محبوب نے کہا۔''بھائی میاں کی شادی بھی سمے پر ہوجانا چاہئے۔مگر ہماری ہو رہی ہے اور بڑا بھائی بیٹھا ہوا ہے۔''

اس نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے کشوری کی ہوتی مگر تم ہتھیلی پر سرسوں جما رہے ہو۔ اچانک چار دن میں میری بہو لا رہے ہو۔''

''چلیں ہماری طرح چار دنوں میں نہ سہی۔ چار ہفتوں میں یا چار مہینوں میں دوسری بہو لے آئیں۔''

''ٹھیک ہے آجائے گی۔ ابھی تو منتو اور دھرمو کی شادی میں چلنا ہے۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے یہ شادی ہمارے لئے سمّسیا (مسئلہ) بن جائے گی۔''

محبوب کو بھی یہی اندیشہ تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیسے سمّسیا بنے گی؟''

''باہر سے آنے والے یہی خبر سناتے رہتے ہیں کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ تمہارے پاس حیدر شیخ آیا تھا اور میرے پاس شمبھو دادا.... ان دونوں کے یہی ارادے ہیں کہ ناگ پارا کے ہندو مسلمانوں میں ٹھن جائے۔''

''اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ یہاں سے مایوس ہو کر گئے ہیں۔''

''بیٹے! شیطان کی کھوپڑی رکھنے والے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ وہ دوسرے روپ میں آکر یہاں بلوہ کر سکتے ہیں۔ یہاں کچھ ہندو کچھ مسلمان کٹر کانگریس اور کٹر مسلم لیگی بن گئے ہیں۔ ان کی باتوں میں آکر ان کے گرگے بن کر یہاں گڑبڑ کر سکتے ہیں۔''

محبوب نے کہا۔ ''ہاں۔ کچھ مسلمان منتو سے دھرمو کی شادی کے خلاف جھگڑنے کے انداز میں بول رہے تھے اور ہندو انہیں طیش دلانے کے انداز میں خوش ہو رہے تھے۔''

بنواری لال نے کہا۔ ''دل میں یہی دُھک دُھکی لگی ہے کہ یہ شادی کبھی کچھ گڑبڑ کر سکتی ہے۔''

محبوب سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بنواری کو بابو جی کہتا تھا۔ دونوں کے درمیان اعتماد کا گہرا رشتہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے بابو جی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ دھرمو اسلام قبول کر چکا ہے۔

اسے بنواری پر اعتماد تھا۔ وہ حقیقت معلوم ہونے پر کبھی مخالفانہ روّیہ اختیار نہ کرتا۔ تاہم یہ منتو اور دھرمو کا راز تھا۔ انہوں نے اس پر بھروسہ کر کے اسے اپنا بھیدی بنایا تھا۔ اس لئے وہ اپنے سائے کو بھی یہ بھید نہیں بتانا چاہتا تھا۔

بنواری نے کہا۔ ''ہم سوچتے ہیں' ایسا نہیں کریں گے' ویسا نہیں کریں گے' مگر تقدیر اپنے ڈھنگ سے جو چاہتی ہے وہ کرا ہی دیتی ہے۔''

کشوری لال نے کہا۔ ''بابو جی! یہ دین دھرم کا جھگڑا ہے۔ ایک تدبیر سے ختم ہو سکتا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے محبوب سے بولا۔ ''میرا بیٹا اب دور کی کوڑی لائے گا۔''

بیٹے نے کہا۔ ''اگر دھرمو سب کے سامنے مسلمان ہو جائے....''

محبوب نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''پوری بات تو سنو اور ادھر منتو ہندو ہو جائے تو ہندو خوش ہوں گے کہ منتو ان کے دھرم میں آگئی ہے۔ مسلمان بھی دھرمو کے مسلمان ہونے پر چپ بیٹھ جائیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ دھرم بدلنے سے یہاں سارے ہندو دھرمو کے جانی دشمن بن جائیں گے۔ مسلمان منتو کو بھی نہیں بخشیں گے۔''

''تو پھر ایک اور راستہ ہے۔''

بنواری نے طنزیہ کہا۔ ''میرا بیٹا پھر دور کی کوڑی لا رہا ہے۔''

''بابو جی! آپ طعنہ نہ دیں۔ تھوڑا دھیان سے سوچیں کہ منتو ویواہ کے سمے دھرمو کو اپنے دل سے اپنی آتما سے سُویکار کرے گی تو اس کے دھرم میں آجائے گی۔''

''ہاں۔ ہونا تو یہی چاہئے۔''

''اور جب دھرمو اپنے دل سے اپنی آتما سے منتو کو سُویکار کرے گا تو وہ بھی اس کے دین میں آجائے گا۔ یعنی ویواہ کے بعد منتو اور دھرمو مسلمان بھی رہیں گے اور ہندو بھی....''

''بھئی یہ تو سچ مچ دور کی کوڑی لا رہا ہے۔ جب شادی کے بعد پورا وجود ایک

دوسرے کے لئے ہوتا ہے۔ جذبات احساسات وفائیں ایک دوسرے کے لئے ہوتی ہیں تو دین دھرمو کے لئے اور دھرم منتو کے لئے کیوں نہیں ہوگا؟"

بنواری نے کہا۔"بس یہی نہیں ہوگا۔ہم کبھی نہ ٹوٹنے اور کبھی نہ مٹنے والی شکتی کو بھگوان کہتے ہیں۔تم اللہ کہتے ہوتو وہ ایک ہی شکتی ہے۔مگر لوگ نہیں مانیں گے۔منتو نماج پڑھ کے پوجا کرے گی۔دھرمو پوجا کر کے نماج پڑھے گا۔تو لوگ نہیں مانیں گے۔جب کہ ہماری پوجا ہماری عبادت اللہ کو منانے کے لئے ہوتی ہے۔مگر بندے لاٹھی کٹار لے کر نکل آئیں گے۔"

کشوری لال نے کھانے کے بعد اپنے باپ کو حویلی کے اندر کی سجاوٹ دکھائی۔ حجلہ عروسی کی آرائش قابل دید تھی۔باپ نے تعریف کی۔کشوری نے کہا۔"پتہ ہے بابو جی! کل رات دلہن کے آنے سے پہلے سیج پر پھولوں کی پتیاں بچھائی جائیں گی۔"

بنواری لال نے کہا۔"مجھے پتہ ہے۔تیری ماں ہوتی تو بتاتی ' ایسی ہی سیج کی پتیوں پر تجھے پیدا کیا تھا۔"

محبوب قہقہہ لگانے لگا۔کشوری جھینپ کر بولا۔"کیا بابو جی....؟ منہ کو لگام دے کے بولا کرو۔"

وہ تینوں بہت خوش تھے۔اگرچہ سیاسی حالات تشویش میں مبتلا کر رہے تھے۔ تاہم خوشی بھی لازمی ہوگئی تھی۔پارو کے ایک ذرا سے بدلتے ہوئے روّیے نے آس دلائی تھی کہ وہ نامرادی کے صحرا میں نہیں بھٹکے گا۔وہ ساقی بن کر آئے گی۔وہ پیاسا نہیں رہے گا۔

بنواری لال سجاوٹ دیکھتا ہوا دوسری طرف گیا تو کشوری نے پوچھا۔"دلہن کی سیج کو ابھی سے کیوں تک رہے ہو؟ ایک شعر بولوں؟ جلدی سے سن لو۔بابو جی آجائیں گے۔"

اس نے باپ کی طرف دیکھا، پھر جھک کر محبوب کے کان میں کہا۔

اس نے میرا نہ کچھ کیا آداب
کر دیا سیج کے پھولوں کو خراب

کیا شعر تھا۔چشم تصور سے پارو بکھری ہوئی دکھائی دی۔وہ سحر زدہ سا ہو کر سیج کو

دیکھتا رہ گیا۔کیا جاگتی آنکھوں کے سپنے پورے ہوتے ہیں یا بہلاتے ہیں؟

اگر بہلاتے ہیں تو دل سے آہ نکلے گی۔وائے نصیب! خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ بنواری کے ساتھ منتو اور دھرمو کے پاس پہنچا۔اس نے دونوں گھروں میں بیشمار چراغوں کی روشنی کرائی تھی۔ناگ پارا کے بیشمار لوگ ان کا ویواہ دیکھنے آئے تھے۔وہاں دونوں گھروں کے درمیان لگن منڈپ سجایا گیا تھا۔

اس شادی کا چرچا رامپور سے ہوتا ہوا دہلی تک پھیل گیا تھا۔کتنے ہی ہندی اور اردو اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافرز وہاں پہنچ گئے تھے۔ان میں روزنامہ جنگ کے نمائندے بھی تھے۔کراچی کے اس پاکستانی اخبار کی اشاعت کا آغاز میر خلیل الرحمان نے 1940ء میں دہلی سے کیا تھا۔

جنگ کے نمائندے نے کہا۔"ایسے وقت جب کہ ہر سُو فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔منتو اور دھرمو کی شادی ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے ایسی شادیاں ہونی چاہئیں یا نہیں' یہ عالم دین اور پنڈت مہاشے بہتر جانتے ہیں اور بہتر کہہ سکتے ہیں۔ میں اتنا کہوں گا کہ بوڑھے اور بے یار و مددگار دھرمو اور منتو کو ایک دوسرے کا سہارا ضرور بننا چاہئے۔"

دوسرے نمائندوں نے کہا۔"دھرمو اور منتو کی شادی یہ پیغام دیتی ہے کہ ہم بڑھاپے میں اور دکھ مصیبت میں ایک دوسرے کے ساتھ میل محبت اور امن و امان سے رہ سکتے ہیں۔ہمیں دین دھرم کا نام لے کر لڑنا نہیں چاہئے۔"

محبوب نے کہا۔"آپ لڑنے کے خلاف ہیں تو اپنے اخبار کا نام جنگ کیوں رکھا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔"دوسری جنگ عظیم جاری ہے یہ کسی دن ختم ہو جائے گی۔ لیکن انسانوں کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے اور رہے گی' جنگ مستقل ہے۔ روزنامہ جنگ بھی انسانی فطرت کے ساتھ جاری رہے گا۔"

امرت بازار پتریکا کے نمائندے نے کہا۔"یہ جو لگن منڈپ میں آگ جل رہی

ہے۔ یہ آپ کے ناگ پارا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔‘‘

بنواری نے کہا۔’’ہماری جیتے جی تو ایسا نہیں ہوگا۔ آج یہاں دین اور دھرم کا ملاپ ہے۔ اس لئے ہندو اور اسلامی دونوں طریقوں سے انہیں شادی کے بندھن میں باندھا جائے گا۔‘‘

ایک نے کہا۔’’یہ نہیں ہوسکتا۔ شادی مرد کے دھرم کے مطابق ہوتی ہے۔ عورت کو سر پر نہ چڑھاؤ۔ یہ مرد کے پیچھے چلنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔‘‘

بنواری لال نے کہا۔’’ہمیں بھگوان خود پیدا نہیں کرتا، عورت سے پیدا کراتا ہے۔ سوچو سمجھو کہ عورت مان مرتبے میں ہم سے آگے ہے۔ اسے مرد کے پیچھے چلنے والی نہ کہو۔ اس نے تمہیں پیدا کیا اور تم یہاں بیٹھ کر اس کا مان گرا رہے ہو۔‘‘

محبوب نے کہا۔’’اگر ہم دونوں طریقوں سے شادی کرائیں گے تو ہندو اور مسلمان دونوں کی تسلی ہوگی۔ ابھی پنڈت جی کے کہنے سے دھرمو منتو کی مانگ میں سندور بھرے گا، یہ اسے قبول کرے گی۔ پھر مولانا اجمیری کے کہنے سے دھرمو کو بھی کلمہ پڑھ کر نکاح قبول کرنا چاہئے۔‘‘

تمام مسلمانوں نے اس بات کی تائید کی۔ ہندوؤں کی اکثریت بنواری لال کے زیر اثر تھی۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا جو اعتراض کر رہے تھے۔ انہیں سمجھا منا کر چپ کرا دیا گیا۔ یوں ان کی شادی ہوئی۔ پنڈت جی نے سنسکرت بھاشا میں بہت کچھ پڑھنے کے بعد دھرمو سے کہا۔’’منتو کی مانگ میں سندور بھرو۔‘‘

اس نے مانگ میں سندور کی لکیر کھینچ دی۔ پھر پنڈت جی نے منتو سے کہا۔

’’اپنے پتی کو مالا پہناؤ۔‘‘

اس نے دھرمو کو پھولوں کی مالا پہنائی۔ مرد عورتیں بدھائی دینے لگے۔ پھر ان دونوں کو لگن منڈپ کی آگ سے دور بٹھایا گیا۔ مولانا اجمیری نے دھرمو کو وضو کرایا۔ کلام پاک کی آیات پڑھائیں پھر اسے کلمہ پڑھا کر نکاح قبول کرایا۔

منتو، دھرمو اور محبوب نے جو راز چھپایا تھا اسے کسی حد تک بڑی حکمت عملی سے ظاہر کر دیا گیا۔ تمام ہندوؤں کے سامنے دھرمو سے کلمہ پڑھایا گیا تھا۔ منتو سر اٹھا کر بنواری لال کو بڑی احسان مندی سے دیکھ رہی تھی۔ اسی نے اپنی سوچ کے مطابق

دونوں کو ہندو دونوں کو مسلمان بنا دیا تھا۔

محبوب کو بھی یہ قلبی اطمینان تھا کہ دھرمو نے صرف چوری سے نہیں اعلانیہ بھی کلمہ پڑھا ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دین اسلام کے حوالے سے یہ طریق کار کہاں تک جائز ہے؟ بس اتنا جانتے تھے کہ کسی بھی طرح وہاں کے تمام لوگوں میں اتحاد قائم رکھنا ہے۔ شرپسند جو آگ بھڑکانا چاہتے تھے وہ اس پر پہلے ہی پانی ڈالتے جا رہے تھے۔

رپورٹرز اپنی اپنی نوٹ بکس میں بہت کچھ لکھ رہے تھے۔ فوٹو گرافرز دولہا دلہن کے علاوہ محبوب اور بنواری لال کی بھی تصویریں اتار رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے اپنے اخبارات میں انہیں امن کے پیغامبر لکھیں گے۔

دراصل پرامن سماجی زندگی میں بدلتے ہوئے سیاسی حالات اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انیس سو سینتیس کے صوبائی انتخابات میں کانگریس کو چھ صوبوں میں تن تنہا کامیابی ہوئی۔ دوسرے صوبوں میں مسلم لیگ کو کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومتیں قائم کرنی تھیں۔ اس کامیابی سے کانگریس کو یہ گھمنڈ ہوا کہ وہ ہندوستان بھر کی اکیلی اکثریتی جماعت ہے۔

ایسے وقت انہوں نے اپنی اصلیت دکھائی۔ تمام صوبوں میں ہندو راج قائم کرنا چاہا۔ مسلمانوں کو طاقت سے دبانے کی کوششیں کرنے لگے۔ ان حالات میں ہندو مسلم فسادات نے شدت اختیار کر لی۔

اگر بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو حیدر شیخ محتاط رہنے اور اپنے بچاؤ کے لئے ہتھیار رکھنے کو کہتا تھا۔ اور شمبھو دادا ہندو راج قائم کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو کچلنے کے لئے ہتھیار سپلائی کرنا چاہتا تھا۔ یا اپنے طور پر ناگ پارا میں بلوہ کرانا چاہتا تھا۔

تاریخ کہتی ہے کہ کافر بعد میں مارتا ہے۔ پہلے مسلمان مسلمان کو مارتا ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ نواب سراج الدولہ اپنے مقرب اور معتمد خاص میر جعفر کی سازشوں سے انگریزوں کے زیرِ دام آ کر مارا گیا تھا۔ اب منصور وہی کردار ادا کر رہا تھا۔ شمبھو دادا کا گرگا بن گیا تھا۔ ذاتی انتقام کی آگ بجھانے کے لئے ناگ پارا میں پہلی بار فرقہ وارانہ آگ بھڑکانے جا رہا تھا۔

وہ بظاہر پاگل تھا۔ پاگل خطرناک نہ ہوں تو بے ضرر ہوتے ہیں۔ ان سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ وہاں سب دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے آپ میں مست رہتا تھا۔ کسی کو پتھر تو کیا کنکر بھی نہیں مارتا تھا۔ بچے اس کے آگے پیچھے اچھلتے کودتے رہتے تھے۔ عورتیں اسے بڑی اپنائیت سے دیکھتی تھیں۔ اسے کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں۔ مرد بڑے افسوس سے کہتے تھے۔ ”کیسا بانکا جوان ہے۔ بھری جوانی میں پاگل ہوگیا ہے۔“

اور وہ پاگل رامپور جاکر کانگریسی لیڈر کے ساتھ سازشی تانے بانے بنتا رہا۔ یہ طے پایا کہ شادی سے پہلے محبوب علی کی خانہ بربادی ہوگی۔ وہاں جیسی بھی واردات ہوگی، اس کا الزام ناگ پارا کے کسی ہندو پر لگایا جائے گا اور الزام لگانے کے لئے اس ہندو کے خلاف وہ کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرے گا۔

رامپور سے واپس آیا تو ماں پریشان تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”کہاں چلا گیا تھا؟ پوری بستی میں ڈھونڈ کر ابھی آئی ہوں۔“

وہ ایک طرف خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ”وہ آئی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔“

”کون آئی تھی؟ کون تجھے لے گئی تھی؟“

”وہ بہت خوبصورت ہے۔ کہتی ہے مجھ سے شادی کرے گی۔“

ماں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”ارے وہ ہے کون یہ تو بتا؟“

”وہی، جسے تم بلا کہتی ہو۔“

ماں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہائے میں مرگئی۔ میں کیا کروں؟ تانترک مہاج کے جادو ٹونے اور منتروں کا اثر نہیں ہورہا ہے۔ وہ تو تجھے مارڈالے گی۔“

ماں کی ممتا تڑپانے لگی۔ وہ اسے پکڑ کر کھاٹ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ”تُو اب باہر نہیں جائے۔ اگر جائے گا تو میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ تجھے رامپور کے عامل بابا کے پاس لے جاؤں گی۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں خود اس بلا کو دور کرسکتا ہوں۔ میں بہت

چالاک ہوں اماں!“

”پاگل ہو اور خود کو چالاک سمجھتے ہو۔“

وہ ماں کے قریب جھک کر بولا۔ ”ایک بات بولوں، کسی سے نہیں بولوگی ناں؟“

”نہیں بولوں گی۔ کیا بات ہے؟“

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں، ابا کے لات جوتوں کی سے بچنے کے لئے پاگل بن گیا ہوں۔“

ماں نے خوش ہوکر اسے دیکھا۔ ”کیا سچ کہہ رہے ہو؟“

”تمہاری قسم کھا کر بولتا ہوں۔ دیکھ رہی ہو ابا ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ مجھے غصہ نہیں دکھاتے ہیں۔“

وہ خوش ہوکر بولی۔ ”ہاں۔ یہ تم ٹھیک کررہے ہو۔ بس اسی طرح پاگل بنے رہو۔ پھر تو تم پر کسی کا سایہ نہیں ہے ناں؟“

”ہے اماں! وہ بلا میرے پیچھے پڑی ہے۔ کہتی ہے میں اس کا ایک کام کروں گا تو وہ پیچھا چھوڑ دے گی۔“

”ہائے اللہ! وہ کیسا کام کرنے کو کہہ رہی ہے؟“

وہ دروازے کی طرف دیکھنے کے بعد دھیمی آواز میں بولا۔ ”یہ بات کسی کو بتانے کی نہیں ہے۔ یہ کام بہت چھپ چھپا کر کرنے کا ہے۔ اگر کرجاؤں گا تو سمجھو وہ مجھے بہت ساری دولت دے کر چلی جائے گی۔“

ماں نے تعجب سے پوچھا۔ ”وہ پیچھا بھی چھوڑ دے گی اور دولت بھی دے گی۔ ایسا کیا کام ہے؟“

”اماں! وہ جو منگو لوہار ہے۔ وہ اپنی کلائی میں لوہے کا ایک کڑا پہن کر رہتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے ناں؟“

”ہاں۔ سب ہی دیکھتے ہیں۔ وہ اسے دن رات پہنے رہتا ہے۔“

”وہ بلا اس کڑے کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

”کیوں حاصل کرنا چاہتی ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟ کوئی جادو منتر والی بات ہوگی۔ کہتی ہے کسی کو پتہ نہ چلے اور وہ

اسے مل جائے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا اسے چرا کر لے جاؤ گے؟ وہ کڑا اس کے ہاتھ سے اترے گا تو کیا اسے پتہ نہیں چلے گا؟"

"اماں! وہ دن رات پہن کر نہیں رہتا ہوگا۔ نہاتے وقت یا سوتے وقت اتار دیتا ہوگا۔"

"ہاں۔مگر...."

"اگر مگر نہ بولو۔ یہ سوچو وہ کڑا چپ چاپ چوری سے مل جائے گا۔ تو اس بلا سے نجات مل جائے گی اور دولت بھی ملے گی۔ میں ابا کے پچاس جانوروں کا نقصان پورا کردوں گا۔ پھر پاگل بن کر نہیں رہوں گا۔"

وہ فکر میں مبتلا ہوگئی۔ سوچنے لگی کیا کرے؟ پھر وہاں سے اٹھ کر جاتے ہوئے بولی۔"کیا کروں یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ منگو پاگل تو نہیں ہے کہ کڑا ہاتھ سے اترے گا تو اسے خبر نہیں ہوگی۔ وہ لوہار ہے۔ کڑا اتارنے والے کا گلا دبا دے گا۔ پھر بھی دیکھتی ہوں شائد کوئی کرشمہ ہوجائے۔ وہ کڑا ہاتھ لگ ہی جائے۔"

وہ ماں کے ساتھ مکان کے باہر آتے ہوئے بولا۔"اس بات کا دھیان رکھنا کہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ورنہ بلا تمہارے بیٹے کو سچ مچ پاگل بنا دے گی۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ بیٹے کے لئے پریشان ہوگئی۔ زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے منگو لوہار کی طرف جانے لگی۔ منصور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا سوچتا رہا کہ اس لوہے کے کڑے کو حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے مگر وہی ضروری تھا۔

اس لئے ضروری تھا کہ منگو لوہار محبوب سے کدورت رکھتا تھا۔ اس کے خلاف بولتا رہتا تھا۔ ایک بار ہوا یہ تھا کہ منگو نے بگھی کے پہئے کی مرمت کی تھی۔ مگر دوسرے دن پہیہ پھر ناکارہ ہوگیا تھا۔ محبوب نے شکایت کی۔"یہ تم کیسا کام کرنے لگے ہو؟ کام کی طرف دھیان دیا کرو اور اسے ابھی ٹھیک کرو۔"

منگو نے کہا۔"جیادہ نہ بولو۔ ہاتھ کا کام ہے کبھی کھرابی ہوجاتی ہے۔ مگر دوسری بار مرمت کے الگ پیسے لوں گا۔"

محبوب نے کہا۔"جس کام کے پیسے کل دیئے تھے وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ تمہارا فرض

ہے کہ ان ہی پیسوں میں پہئے کو ٹھیک کرو۔"

اس نے کام کرنے سے انکار کردیا۔ کچھ لوگ جمع ہوگئے۔ محبوب نے کہا۔"پیسہ ہمارے ہاتھ کا میل ہے۔ مگر اصول یہ ہے کہ جو کام خراب کیا ہے، اسے ٹھیک کرنے کے پیسے دوبارہ نہ لو۔"

کچھ لوگوں نے محبوب کی حمایت کی۔ ایک نے کہا۔"علی بھائی! بھگوان نے آپ کو بہت دیا ہے۔ اصول کو جانے دیں۔ جھگڑا ختم کردیں۔"

محبوب نے کہا۔"ہم بھی دو چار روپے کے لئے جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتے۔ ٹھیک ہے' اسے دو روپے دیں گے، مگر وہ ایک مزدور کی جائز مزدوری نہیں ہوگی بلکہ بھیک ہوگی۔"

وہ گرج کر بولا۔"میں بھکاری نہیں ہوں۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ میں لوہار ہوں۔ بھیک دینے والے ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔"

محبوب نے کہا۔"اور ہم پہلوان ہیں۔ رامپور اور دہلی کے چار پہلوانوں کو چت کر چکے ہیں۔ تمہیں ایسی پٹخنیاں دیں گے کہ زمین سے اٹھنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

وہ دور سے باتیں کر رہے تھے۔ منگو طیش میں آکر اس کی طرف لپکا۔ اسی وقت بنواری لال نے آکر کہا۔"رک جاؤ...."

وہ بنواری لال کو اپنا بڑا مانتا تھا۔ اس کا احسان مند رہتا تھا۔ کیونکہ اس کی دکان سے کھانے پینے کی چیزیں اُدھار لیا کرتا تھا۔ پھر یہ کہ ناگ پارا کے تمام لوگ بھی اسے بہت ہی ذہین اور تجربہ کار بزرگ مانتے تھے۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی رک گیا۔

بنواری نے پوچھا۔"کیا ہورہا ہے یہ...؟ تم علی سے لڑنا چاہتے ہو؟ بہت مستی میں آگئے ہو؟ مجھے بتاؤ' معاملہ کیا ہے؟"

اسے بتایا گیا۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔"منگو! تمہیں شرم آنی چاہئے۔ آگ میں لوہا گرم کرتے ہو اور اپنا دماگ بھی گرم رکھتے ہو۔ اپنے کام میں جو کھرابی ہوتی ہے، اسے مانتے نہیں ہو۔"

علی نے کہا۔ ''بابو جی! یاد ہے اس نے ایک بار ہمارے گھوڑے کی نال بنائی تھی' گھوڑا کچھ دور چلنے کے بعد بیٹھ گیا تھا۔ لنگڑانے لگا تھا۔ تب بھی یہ اپنی غلطی نہیں مان رہا تھا۔ اس روز بھی ہم سے جھگڑا کر رہا تھا؟''

بنواری لال نے کہا۔ ''منگو! یہاں سب سن رہے ہیں' سب مان رہے ہیں کہ تم گاہکوں سے اسی طرح لڑتے رہتے ہو۔ بولو بگھی کا پہیہ ٹھیک کرو گے یا علی کے پیسے واپس کرو گے؟''

وہ بولا۔ ''میں ابھی ٹھیک کر دیتا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''بابو جی! یہ آپ کے سامنے ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ دل میں کینہ رکھتا ہے۔ ہم شہر سے دوسرا پہیہ لا کر لگائیں گے اور آئندہ شہر کے لوہار سے ہی کام کرائیں گے۔''

بیٹے! جو ہوا اس پر مٹی ڈالو۔ ہمیں شہر والوں سے نہیں اپنی بستی کے کاریگروں سے کام کرانا چاہئے۔ ان کی دال روٹی ہم سے ہی چلتی ہے۔''

محبوب نے اپنے بابو جی کی بات مان لی۔ اس روز بظاہر صلح صفائی ہو گئی' لیکن منگو پیٹھ پیچھے اس کے خلاف کچھ نہ کچھ بولتا رہتا تھا۔ اس نے ایک بار دارو کے نشے میں کہا تھا۔ ''یہ علی خود کو بڑا پہلوان سمجھتا ہے۔ کسی دن ہتھے چڑھے گا تو کاٹ کے پھینک دوں گا۔''

اس کی بات کتنے ہی لوگوں نے سنی تھی۔ اگرچہ وہ بڑبولا تھا۔ بولتا بہت تھا مگر کرتا کچھ نہیں تھا۔ کبھی دوسروں کو بھڑکانے کے لئے کہتا تھا۔ ''ہم تو علی کو نہیں اپنے بنواری لال کو 'بڑا' مانتے ہیں۔ علی کو تو ہم دیوتا کبھی نہیں کہیں گے۔ ہاں ہمارے بنواری جی اوشے دیوتا سمان ہیں۔''

یوں اپنی حماقتوں سے وہ محبوب کے خلاف کینہ ظاہر کر دیتا تھا۔ منصور نے طے کر لیا تھا کہ محبوب اور پارو سے انتقام لینے کے لئے اسی خر دماغ کو استعمال کرے گا' لیکن استعمال کرنے کا جو طریقہ تھا اس پر عمل کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ منگو لوہار کی کلائی سے کڑا اتار کر لے آنا تقریباً ناممکن تھا۔

منصور کی نظروں میں مزید دو ہندو گھرانے اور بھی تھے۔ وہ لوگ مسلمانوں سے

کتراتے تھے۔ ان کے گھروں کا پانی بھی نہیں پیتے تھے۔ وہ منگو کے سلسلے میں ناکام ہونے کے بعد ان گھرانوں کے کسی فرد کو استعمال کرنے والا تھا۔

وہ بچوں کے ساتھ اچھلتا کودتا تالاب گھاٹ پر آیا۔ وہاں عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ اور اشنان کر رہی تھیں۔ ایک عورت نے کہا۔ ''اے منصور! جا اِدھر سے..... تجھے شرم نہیں آتی؟''

دوسری عورت نے کہا۔ ''کیوں ڈانٹ رہی ہو؟ یہ بیچارہ پاگل ہے۔ ہمارے بھیگے بدن کو کیا دیکھے گا اور کیا للچائے گا؟''

تیسری نے کہا۔ ''بڑی مشکل ہے۔ دیکھنے والے للچائیں تو ہم اسے سناتی ہیں۔ نہ للچائیں تو لگتا ہے ہمارا کوئی مول ہی نہیں ہے۔''

ایک عورت نے منصور کو دیکھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ اور کہا۔ ''آیا بھی تو پاگل..... نہ مول جانے، نہ تول جانے۔''

سب ہی اس بات پر ہنسنے کھلکھلانے لگیں۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالنے لگیں۔ منصور کنارے کنارے چلتا ہوا ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچا۔ وہاں مرد کپڑے دھو رہے تھے اور اشنان کر رہے تھے۔ پھر جیسے منصور کی لاٹری نکل آئی۔

اس نے منگو لوہار کو دیکھا۔ وہ ادھر نہانے آیا تھا۔ اپنی صدری اور دھوتی اتار کر ایک درخت کی اُبھری ہوئی جڑوں کے پاس رکھ رہا تھا۔ اس کے بدن پر ایک چڈی تھی۔ وہ اپنی کلائی سے کڑا اتار کر اسے صدری کے نیچے اچھی طرح چھپا کر رکھ رہا تھا۔

منصور جھاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ گھاٹ اس درخت سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ درجنوں ہندو مسلمان وہاں نہانے دھونے میں مصروف تھے۔ ان کے کپڑے اور سامان بھی مختلف درختوں اور پتھروں کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ جھاڑیوں کے پیچھے چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا اس درخت کے پاس پہنچ گیا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا جس کام کو کرنا بالکل ہی ناممکن ہوتا ہے تقدیر اسے بہت

ہی آسان بنا دیتی ہے۔ نہ ملنے والی چیز کو تھال میں سجا کر پیش کر دیتی ہے۔ صدری کے نیچے دبا ہوا کڑا مل گیا۔ وہ اسے لے کر کپڑوں کو اسی طرح وہاں رکھ کر چپ چاپ رینگتا ہوا جھاڑیوں کے پیچھے سے ذرا دور نکل گیا۔ پھر اس نے گھنی جھاڑیوں سے سر اُٹھا کر تالاب کی سمت دیکھا۔ سب نہانے دھونے میں مصروف تھے۔ وہ ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

ماں بیچاری کڑا حاصل کرنے کے لئے منگو کی طرف گئی تھی۔ اس نے دور سے دیکھا لوہار کی دھونکنی ٹھنڈی پڑی تھی۔ کام کرنے کے اوزار بکھرے پڑے تھے مگر وہ نہیں تھا۔ مکان کے اندر سے اس کی گھر والی کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی۔ ”تیرا باپ گھاٹ پر اشنان کرنے گیا ہے۔ مگر صابن بھول گیا ہے۔ جا دوڑ کر اسے دے آ...“

منصور کی ماں فوراً ہی پلٹ کر گھاٹ کی طرف جانے لگی۔ راستے میں بیٹا مل گیا۔ اس نے کہا۔ ”فکر نہ کرو ماں! کام ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو....“

اس نے لباس کے اندر سے کڑا نکال کر دکھایا پھر کہا۔ ”اب تم اپنے ہونٹ سی لو۔ جان چلی جائے تب بھی کڑے کے بارے میں منہ کھولو۔ میں شہر جا رہا ہوں۔ رات کو جیسی بھی حالت میں واپس آؤں، پریشان نہ ہونا۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا یہ کڑا دینے شہر جا رہے ہو؟ کیا وہ بلا شہر میں رہتی ہے؟“

”وہ کہیں بھی رہتی ہے۔ بس آج کی رات ذرا بھاری ہے۔ کل سے ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔“

وہ ماں کو تسلیاں دے کر پاگلوں کے انداز میں اچھلتا کودتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ادھر منگو لوہار اشنان کرنے کے بعد درخت کے پاس آیا۔ اپنا لباس اٹھایا تو کڑا غائب تھا۔ وہ حیرانی سے بڑبڑایا۔ ”کڑا کہاں ہے؟“

ایک بوڑھے نے اپنا لباس پہنتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ ادھر گلہریاں بہت ہیں، چیزیں اٹھا کر لے جاتی ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”لوہے کا کڑا بہت بھاری ہے۔ اسے گلہری اٹھا کر نہیں لے جا سکے گی۔“

”تو پھر جہاں رکھا تھا، وہیں اچھی طرح دیکھو۔ بھاری لوہا اپنی جگہ سے کہیں نہیں جائے گا۔“

وہاں نہانے والے ایک ایک کر کے آنے لگے۔ منگو کے ساتھ ادھر ادھر جاتے ہوئے گمشدہ کڑے کو تلاش کرنے لگے۔ لیکن وہ ملنے والا نہیں تھا۔ وہ تھک ہار کر حیرانی سے سوچتا ہی رہ گیا کہ صدری کے نیچے رکھے رکھے کڑا کیسے غائب ہو گیا؟

اور یہ سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی اسے چرا کر لے جائے گا۔ وہ کوئی سونے چاندی کا نہیں تھا۔ بہرحال نقصان اٹھانے والے کو صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس نے بھی یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ اپنے ہی ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز تھی، دوبارہ بن جائے گی۔

زلزلہ آنے سے پہلے زمین بہت ہولے ہولے لرزتی ہے پھر چپ ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا قدموں تلے پاتال سے کیسی قیامت پھٹ پڑنے والی ہے۔ ناگ پارا کے سیدھے سادے پرامن باشندے بے خبر تھے، نہ انہیں کسی شرپسند سے کسی طرح کی سازش کا شبہ تھا' نہ وہ کسی کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ بس اپنے حال میں مست رہنے والے لوگ تھے۔

دوسرے دن پارو اور محبوب علی کی نکاح خوانی تھی۔ اس سے پہلے خوب جشن منایا جا رہا تھا۔ ہزار ہا دیئے روشن کر کے ناگ پارا کی گلی گلی اور گھر گھر کو منور کر دیا گیا تھا۔ لنگر کھلا ہوا تھا۔ لوگ کھا پی رہے تھے' ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔ وہاں کے غریب جیسے دن کو عید اور رات کو دیوالی منا رہے تھے۔

ایسے وقت دو شخص منصور کو رامپور سے تانگے میں ڈال کر لائے۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔ اسے گھر کے دروازے پر پہنچایا گیا۔ ماں بیٹے کی حالت دیکھ کر چھاتی پیٹنے لگی۔ بستی کی عورتیں مرد بچے بوڑھے سب ہی وہاں آ کر اسے دیکھنے لگے۔

باپ اور بھائی غصے سے بڑبڑا رہے تھے۔ اسے لانے والے ایک شخص نے کہا۔ ”کیوں بیچارے پر غصہ کر رہے ہو؟ وہاں کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ پاگل ہے۔“

باپ نے کہا۔ ”یہ کیسا پاگل ہے؟ ہمیں بھول گیا ہے مگر دارُو کو نہیں بھولتا؟ اسے

یہاں نہ ملی تو پینے کے لئے شہر چلا گیا۔“

اسے لانے والے دوسرے شخص نے کہا۔”اس نے خود نہیں پی ہے۔کچھ لوگ زبردستی اس کے منہ میں بوتل ٹھونس کر پلا رہے تھے۔“

ایک عورت نے کہا۔”ہائے بیچارے پاگل کو جبر جستی پلائی گئی ہے۔“

دوسرے نے پوچھا۔”کون تھے وہ دشمن؟“

”وہ دشمن نہیں تھے۔شرارتی لوگ تھے۔ایک پاگل سے کھلواڑ کر رہے تھے۔ہم نے دور سے دیکھ کر للکارا تو وہ بھاگ گئے۔ایک تانگے والے نے بتایا کہ یہ ناگ پارا کا پاگل ہے۔ہم نے کہا بیچارے کو گھر پہنچا دیں۔بس ہم پُن کمانے کے لئے اسے لے آئے ہیں۔“

سب ہی منصور سے ہمدردی کرنے لگے، جنہوں نے زبردستی پلائی تھی۔انہیں کوسنے اور گالیاں دینے لگے۔اس نمائشی پاگل کی یہ چال بھی کامیاب رہی۔اس نے منگو کا کڑا شمبھو دادا کے پاس پہنچا دیا تھا۔پھر اسے کہا تھا۔”میرے لئے دارو کی بوتل منگواؤ۔میں خوب پیوں گا۔جب پی کر مدہوش ہو جاؤں تو کوئی مجھے تانگے میں ڈال کر ناگ پارا پہنچائے گا اور یہ بیان دے گا کہ کچھ لوگوں نے مجھے جبراً پلائی ہے۔“

وہ ایسی تدبیر پر عمل کرتے ہوئے مدہوش ہو کر گھر پہنچ گیا تھا۔یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اس رات وہاں جو بھی واردات ہونے والی ہے۔اس کا الزام کبھی اس پر نہیں آئے گا۔

محبوب علی بھی اسے دیکھنے آیا تھا۔آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر رہا تھا کہ واقعی اس نے پی ہے اور اس پر نیم بے ہوشی طاری ہے۔مگر وہ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔

”ہم نے اسے دو بار زبردستی پلائی ہے۔ہمارا ارادہ تھا اسے ایسی ہی سزا دیتے رہیں گے۔لیکن وہ کون لوگ ہیں، جنہوں نے اسے مفت میں پلائی ہے؟اور کیوں خوامخواہ پلائی ہے؟“

وہ سوچ رہا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔وہ کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ منصور نے اس کی چال اسی پر الٹ دی ہے۔وہ محبوب کی زبردستی سے پینے کے بعد تماشہ بن جایا کرتا تھا۔اب خود ہی پی کر بے ہوش ہو کر یہ ثابت کرنے والا تھا کہ

رقیب کی زندگی میں جو قیامت آنے والی ہے۔اس کا ذمہ دار ایک پاگل اور شرابی نہیں ہے۔

⊛✪⊛

وہ ناچتی گاتی اور آتش بازیوں سے گونجتی ہوئی رات تھی۔مسرتوں کے دن رات آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے، یہ کبھی واپس نہیں جائیں گے۔ان عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کی خوشیاں دیکھ کر ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ اپنا سارا دکھ درد بھول چکے ہیں۔

نیند لازمی ہوتی ہے، دکھ درد کے کانٹوں میں بھی آتی ہے۔مسرتوں کے ہجوم میں سونا نہ چاہو، تب بھی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔وہاں نصف شب کے بعد مسرتوں بھرے ہنگامے سرد پڑنے لگے۔دوسرے دن صبح دس بجے نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔اس لئے ذرا کمر سیدھی کرنا، ذرا سونا ضروری تھا۔

رات کے ایک بجے ہی محلے پڑوس کی عورتیں سلطانی بیگم کے گھر سے چلی گئی تھیں۔سلطانی، بلقیس اور بنے میاں اپنی اپنی کھاٹ پر سونے کے لئے چلے گئے۔ایسے وقت پارو اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ میکے میں اس کی آخری رات تھی۔نیند آنے سے انکار کر رہی تھی۔کہہ رہی تھی۔”جاگو، سوچو، کل سے تمہارے آنے والے تمام کل کیا ہوں گے؟“

مقدر میں جو ہوتا ہے، سو ہوتا ہے۔لیکن دلہن کے اختیار میں بھی کچھ ہوتا ہے۔وہ کل سے شروع ہونے والی زندگی کو انتہائی سنگین بھی بنا سکتی تھی اور رنگین بھی بنا سکتی تھی۔اس نے جتنے ارمان جتنی حسرتیں کسی آئیڈیل کے لئے چھپا رکھی تھیں۔وہ سب کی سب محبوب کو دے سکتی تھی۔

اور ایسی تبدیلی اس کے اندر آ رہی تھی۔وقت، حالات اور مزاج کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔دل چپکے چپکے اس سے متاثر ہو رہا تھا۔جو اس کے لئے تاثیر نہیں رکھتا تھا۔

حالات نے سمجھا دیا تھا کہ وہ جسے نہیں چاہتی ہے وہی اس کی شرم و حیا اور نیک نامی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ایسا کوئی دوسرا ناگ پارا میں تو کیا ساری دنیا میں نہیں ہے۔

اس نے بستر سے اتر کر لالٹین کی لو بڑھائی۔سرہانے ایک صندوق پر کتابیں

اور کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔وہ ان میں سے ایک کاپی کو ڈائری کے طور پر استعمال کرتی تھی۔اس میں اپنی زندگی کی اہم باتیں اہم خیالات اور چور جذبات لکھا کرتی تھی۔ان لمحات میں بھی جو جذبات تھے، وہ اسے کچھ لکھنے کی طرف مائل کر رہے تھے۔

وہ کاپی قلم لے کر فرش پر بیٹھ گئی۔دل میں پھنسی ہوئی باتوں کو زبان دینے لگی۔

اس نے لکھا۔"یہ انسانی فطرت ہے۔ہم پھول خوشبو رنگ و نور کی طرف جاتے ہیں۔کوئی جنگل کے بے رنگ پھول پودوں کو گلدان میں نہیں سجاتا۔"

"کیسی عجیب سی بات ہے۔ان جنگلی پھول پودوں سے بننے والی دوائیں ہمیں صحت‘ حسن اور نکھار دیتی ہیں اور ہم انہیں اہمیت نہیں دیتے۔

سب گورے رنگ پر مرتے ہیں۔کالی صورت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔لیکن کالے پتھر کو چومتے ہیں اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔وہیں سے منتیں اور مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

آج یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ جسے ہم نظر انداز کرتے ہیں، وہی ہماری دوا بھی ہوتا ہے اور دعا کی قبولیت بھی۔

وہ چراغ کا تیل ہوتا ہے۔اس کے بغیر ہم روشن نہیں رہ سکتے۔

چاند دن کی روشنی مین پھیکا پڑ جاتا ہے۔کالی رات اس کے حسن کو اجال دیتی ہے۔یہ دنیا رنگ و بو اور بے رنگ و بو کے اجلے اور میلے امتزاج سے قائم ہے۔دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں۔

محبوب علی....! آج تم لازمی ہوگئے۔

مجھے ایسا لگ رہاہے، جیسے اب تک کہیں کھوئی ہوئی تھی۔یہ نہیں جانتی تھی کہ سوچنے سمجھنے والی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ اب دھندلا سا مگر اجلا سا راستہ مل رہا ہے۔

یہ جو نیا راستہ اور نیا نیا سا رشتہ ہے۔مجھے آپ ہی آپ تمہاری سمت لے جا رہا ہے........"

وہ لکھتے لکھتے رک گئی۔آس پاس کوئی نہیں تھا۔وہ چور راستے سے آنے والے کو محسوس کر رہی تھی۔اس نے لکھا۔"میں چاہتی ہوں میری زندگی کے تمام موسم ہرے

ہوں۔یہ تب ہی ممکن ہے جب تمہارا کوئی زخم ہرا نہ ہو۔اب میں تمہیں زخمی نہیں کروں گی۔

محبوب علی! ایک بات کہوں...؟

تمہارے لئے جو اپنائیت پیدا ہو رہی ہے۔وہ کچھ محبت محبت جیسی لگ رہی ہے۔دماغ تو اسے سمجھ نہیں پارہاہے۔مگر دل سمجھ رہاہے۔

"یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ صرف محبت ہی ایسا امتحان ہے، جہاں ہم دماغ سے نہیں دل سے پاس ہوتے ہیں۔

صرف محبت ہی ایک ایسا کھیل ہے، جس میں ہارنے والے جیت جاتے ہیں۔

لو، میں تمہارے آگے ہار گئی۔"

وہ لکھتے لکھتے پھر رک گئی۔رات کے سناٹے میں ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"دھپ..."

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔دوسری بار بھی دھپ کی آواز سنائی دی۔

یکبارگی یاد آیا۔اس رات بھی آنگن سے ایسی ہی ایک آواز ابھری تھی۔پھر میاؤں میاؤں کی آواز سن کر سلطانی بیگم بلی کو بھگانے برآمدے میں گئی تو واردات کرنے والے نے انتہا کردی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔جس کاپی میں پہلی بار اپنائیت سے اور محبت سے محبوب کا نام لکھا تھا۔اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینے سے لگالیا۔پھر اس نے بنّے میاں کو آواز دی۔"ماموں! یہ آنگن سے کیسی آواز آرہی ہے؟ آپ جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں؟"

سلطانی نے کہا۔"ہاں۔میں نے بھی جیسے نیند میں آواز سنی تھی۔اس کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔"

بات ختم ہوتے ہی کئی قدموں کی دھپا دھپ آوازیں سنائی دیں۔سلطانی نے چیخ کر کہا۔"بنّے! دروازہ نہ کھولنا۔باہر نہ جانا...اے! آنگن میں کون ہے؟"

بنّے میاں کی آواز سنائی دی۔"اے! بولو باہر کون ہے....؟"

"آپا! معلوم ہوتا ہے چور ہیں۔ہم سب شور مچائیں گے تو یہ بھاگ جائیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی بند دروازے لرزنے لگے۔انہیں دھکے مار کر کھولنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔سلطانی' بلقیس' بنّے میاں اور پارو حلق پھاڑ کر چیخنے لگے۔"چور چور....چور آئے ہیں۔اچھی خالہ! بلراج بھیا! حشمت چاچا....!"

وہ نام لے لے کر آوازیں دے رہے تھے۔جواباً دور دور سے محلے والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔وہ مدد کے لئے آرہے تھے۔ایسے ہی وقت ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔پچھلی تین راتوں سے آتشبازی ہورہی تھی۔پٹاخ ٹھوں ٹھاں کی آوازوں سے گونجتے رہتے تھے۔اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پٹاخے بول رہے ہیں یا گولیاں چل رہی ہیں؟

مدد کو آنے والے نہیں آرہے تھے۔ان کی آوازیں دور چلی گئی تھیں۔وہ لوگ کچھ بول رہے تھے مگر ان کی طرف نہیں آرہے تھے۔

پھر جیسے قیامت آگئی۔ان سب نے طے کرلیا تھا کہ دروازہ نہیں کھولیں گے مگر اوپر سے چھت کھلنے والی تھی۔گھاس پھونس کی چھت کو آگ لگائی گئی۔آگ پھیلنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔بڑی تیزی سے شعلے بھڑکنے لگے۔اوپر سے جلتے ہوئے کچھ حصے کمروں کے اندر گرنے لگے۔یوں آگ اندر بھی پھیلنے لگی۔

انہیں مجبوراً اپنے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر بھاگنا پڑا۔ہائے ری بدنصیبی...بھاگنے کے راہ میں موت کھڑی ہوئی تھی۔وہ سب آگ سے بچنے کے لئے آنگن میں آئے۔

"ہر ہر مہادیو..."

کسی نے تلوار چلائی۔بنّے میاں کے سینے پر یہاں سے وہاں تک لہو کی لکیر بنتی چلی گئی۔وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔"ماموں...!ہائے ماموں...!"

وہ خوف سے لرزتی ہوئی آنگن سے باہر بھاگنا چاہتی تھی۔ایک کٹار والے نے اسے پکڑلیا۔جکڑ لیا پھر اسے کاندھے پر لادلیا' ایسے وقت اس نے دیکھا دو شخص سلطانی بیگم کو اٹھا کر آگ میں پھینک رہے تھے۔پارو حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔"اماں!

میری اماں...!میری اماں کو بچاؤ۔"

کوئی بچانے والا نہیں تھا۔وہ پھوپھی کو نہ دیکھ سکی۔پتہ نہیں اس خاتون کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا تھا؟وہ شخص اسے لادے ہوئے چیختا ہوا آنگن کے دروازے سے نکلا۔"جے بجرنگ بلی کی...."

باہر دو گھڑ سوار تھے۔انہوں نے بھی نعرے لگائے۔ہر ہر مہادیو...."

ایک گھڑ سوار نے پارو کو لے کر اپنے سامنے گھوڑے کی پیٹھ پر ڈال دیا۔بھڑکتے ہوئے شعلے پورے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔باہر دو گھڑ سوار تھے ایک تانگا تھا۔وہ سب ہر ہر مہادیو اور بجرنگ بلی کی جے جے کار کرتے ہوئے گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں سے دور ہوتے چلے گئے۔

ناگ پارا کے نہتے لوگ بُری طرح خوف زدہ ہوگئے تھے۔بندوقیں اور تلواریں دیکھ کر دور بھاگ گئے تھے۔پھر بلوائیوں کے جاتے ہی جیسے پوری بستی امڈ آئی۔وہ بالٹیاں بھر بھر کر آگ بجھانے کی کوششیں کرنے لگے۔عورتیں ہائے ہائے کررہی تھی کہ وہ پارو کو لے گئے ہیں۔یہ خیال کیا جارہا تھا کہ سلطانی' بلقیس اور بنّے میاں جلتے ہوئے مکان کے آنگن میں کہیں محفوظ ہیں۔آگ بجھنے پر باہر آئیں گے۔

کتنے ہی لوگوں نے کہا۔"وہ اپنا بچاؤ کررہے ہیں تو چپ کیوں ہیں؟انہیں چیخنا چلانا چاہئے۔"

عورتیں آوازیں دینے لگیں۔ان کے نام لے لے کر پکارنے لگیں۔اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا' خاموشی بتارہی تھی کہ وہ دائمی خاموشی ہے۔

ہائے!یہ شادی کا گھر ہے؟دیوالی منارہے تھے اور ہولی کی آگ گھر جلارہی ہے۔دل جلارہی ہے۔

کتنی ہی عورتیں سینہ پیٹ پیٹ کر رورہی تھیں۔وہاں کے امن پسند لوگوں نے پہلے کبھی ایسے جلتا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔پہلے کبھی ڈاکو یا منظم بلوائی نہیں آئے تھے۔آج تک کسی لڑکی کو کوئی اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ہائے پارو...!وہ تجھے کہاں لے گئے ہیں؟

محبوب علی گہری نیند میں تھا۔ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔باہر سے دروازہ پیٹ پیٹ کر

کہا جارہا تھا۔''مالک! اگجب ہوگیا ہے۔جلدی آئیں۔دلہن کے گھر میں آگ لگی ہے۔سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ بلوائی دلہن کو اٹھا کے لے گئے ہیں۔''

وہ بستر سے اچھل کر فرش پر آیا۔آگے بڑھ کر دروازے کو کھولا تو کئی لوگ کھڑے ہوئے تھے اور وہ سب بیک وقت بول رہے تھے۔وہ تو اس کے بعد اور کچھ سن ہی نہیں سکتا تھا کہ بلوائی پارو کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔اس کے اندر جیسے بجلی بھر گئی تھی۔وہ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو دھکے مارتا ہوا راستہ بناتا ہوا اور دوڑتا ہوا چیخ بولا۔''میں جارہا ہوں۔جلدی سے میرا گھوڑا تیار کر کے لاؤ۔''

وہ جیسے چھلانگیں لگاتا ہوا بیٹھک کے دروازے تک آیا۔پھر رک گیا۔دماغ میں کوئی بات آئی۔وہاں سے پلٹ کر دوڑتا ہوا اپنی خوابگاہ میں پہنچا۔اس نے بڑی سی الماری کو کھولا پھر اس کی ایک دراز کو کھولا۔سامنے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔انہیں اٹھا کر جیبوں میں ٹھونسنے کے بعد بھرے ہوئے ریوالور کو اٹھا کر چیک کیا۔پھر بلٹس کے ایک ڈبے کو مٹھی میں دبوچ کر دوڑتا ہوا باہر آگیا۔

سب لوگ اس کے پیچھے تھے۔وہ اسی طرح دیوانہ وار دوڑتا ہوا چھلانگیں مارتا ہوا پارو کے گھر کی طرف جانے لگا۔یہ سوچ سوچ کر دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے کہ پھر پارو کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ایسے وقت سب ہی گہری نیند سوتے ہیں۔لیکن ایسی دہشت زدہ کر دینے والی واردات ہوئی تھی کہ تمام بستی والوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔سب ہی گھروں سے نکل آئے تھے۔محبوب کو ہاتھوں میں ریوالور اور گولیوں کا ڈبہ اٹھا کر دوڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور اس کے آگے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔

بنواری لال اور کشوری لال بیشمار لوگوں کے ساتھ بالٹیاں بھر بھر کر پانی لانے اور آگ بجھانے میں مصروف تھے۔آگ بجھ رہی تھی۔اب شعلے نہیں لپک رہے تھے۔وہ لوگ پانی ڈالتے ہوئے آنگن میں آئے تو وہاں بنے میاں کی لاش دیکھ کر ٹھٹک گئے۔کتنے ہی دلوں سے آہیں نکلیں۔چند ساعتوں کے لئے جیسے سب پر سکتہ طاری ہوگیا۔

''اے خدا! ہے بھگوان! ایسا تو ناگ پارا میں کبھی نہیں ہوا تھا۔یہ ہمارے ساتھ

کیا ہو رہا ہے؟''

جیسے پورا ناگ پارا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔بنواری لال بوجھل قدموں سے چلتا ہوا لاش کے پاس آیا۔وہ لہو سے تربتر تھی۔کشوری نے چونک کر دیکھا۔جہاں زمین پر لہو پھیلا ہوا تھا وہاں لوہے کا کڑا دکھائی دے رہا تھا۔اس نے باپ کے بازو کو تھام کر کہا۔''بابو جی! وہ دیکھو....''

باپ نے ادھر دیکھا۔پھر قریب جا کر اسے جھک کر اٹھایا۔دوسرے لوگ بھی متوجہ ہوئے۔ایک نے کہا۔''یہ تو منگو لوہار کا کڑا ہے۔''

سب نے قریب آکر دیکھا۔سب کے ذہن میں ایک ہی سوال پیدا ہوا۔''کیا منگو بلوائیوں کے ساتھ آیا تھا؟''

کمرے کے اندر آگ بجھ گئی تھی۔دھواں اٹھ رہا تھا۔وہاں کچھ لوگ گئے تھے۔پھر چار عورتیں روتی اور سینہ پیٹتی ہوئی برآمدے میں آئیں۔ایک تو چکرا کر وہیں گر پڑی۔انہوں نے سلطانی اور بلقیس کی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں۔اپنی زندگی میں پہلی بار قیامت کا منظر دیکھا تھا۔اور وہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔کتنی ہی عورتیں جلی ہوئی لاشیں دیکھے بغیر ہی صدمے سے بیہوش ہوگئیں۔

مرد بھی رو رہے تھے۔جب یہ سمجھ میں نہ آئے کہ مجبوری اور بے بسی میں کیا کرنا چاہئے تو پھر رونا ہی آتا ہے۔محبوب علی ڈورتا ہوا ہانپتا ہوا آیا۔وہاں بنے میاں کی لاش کو اور رونے والوں کو دیکھا پھر اندر جا کر جلی ہوئی لاشیں دیکھیں تو تڑپ کر رہ گیا۔ایک بازو میں منہ چھپا کر دیوار پر گھونسا مارتے ہوئے کہنے لگا۔''آہ! خالہ جان! آہ پھوپھی جان! یہ ہمیں محبتیں دے رہی تھیں۔پارو کو ہماری پناہ میں دی رہی تھیں۔یا خدا! یہ کس انجام کو پہنچ رہی ہیں؟ ایسا کون سا گناہ عظیم کیا تھا' جس کی ایسی سزا مل رہی ہے؟''

وہ برآمدے میں آکر چیخ چیخ کر بولنے لگا۔''ہم باہر سے سنتے آرہے ہیں کہ ہندوؤں نے ایک مسلمان کے گھر کو جلایا ہے۔میں پوچھتا ہوں صرف ایک گھر کو اور بیبیوں کو کیوں جلایا ہے؟

صرف ایک مسلمان بنے ماموں کی ہتیا کیوں کی ہے؟

صرف ایک مسلمان لڑکی کو اٹھا کر کیوں لے گئے ہیں؟ ہمیں بتاؤ وہ کدھر گئے ہیں؟ ہم اسے واپس لانے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیں گے۔"

وہ بول رہا تھا اور غصے سے زمین پر پاؤں پٹخ رہا تھا۔ بنواری لال نے کہا۔"وہ دشمن آستین کا سانپ ہے۔ ہمارے ہی ناگ پارا میں رہتا ہے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر منگو کا کڑا دکھایا۔ محبوب نے اسے لپک لیا۔ پھر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔"یہ منگو کا ہے۔ یہ تو منگو کا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔"منگو شام کو گھاٹ پر نہانے گیا تھا۔ وہاں سے یہ کڑا گم ہو گیا تھا۔"

دوسرے نے بھی تائید کی۔"ہاں۔ سب اسے ڈھونڈتے رہے، یہ نہیں ملا تعجب ہے' یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"منگو نے جھوٹ کہا ہو گا کہ یہ گم ہو گیا ہے یا پھر اسے گھاٹ پر نہیں لایا ہو گا گھر میں بھول آیا ہو گا۔"

بنواری لال نے کہا۔"یہی ہو سکتا ہے۔ وہ اسے گھر میں بھول کر گیا ہو گا۔ گھاٹ سے واپس آ کر اسے پہن لیا ہو گا۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ اس کی کلائی سے نکل کر یہاں کیسے گر گیا؟"

کشوری لال نے کہا۔"ہم سب نے دیکھا ہے یہ کڑا اس کی کلائی میں پھنسا رہتا تھا۔ یہ آپ ہی آپ نہیں نکلتا اسے نکالنا پڑتا ہے۔"

بابو جی نے کہا۔"منگو اسے کلائی سے نکال کر یہاں پھینک کر نہیں گیا ہو گا۔ بات کو سمجھنا ہو گا۔ منگو کو پکڑنا ہو گا۔"

ایک نے کہا۔"اسے کہاں پکڑیں؟ وہ تو بلوائیوں کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔"

منگو کی بیوی نے کہا۔"میرے پتی پر شبہ نہ کرو۔ وہ تو رات کا کھانا کھانے کے بعد شہر چلا گیا تھا۔"

محبوب نے پوچھا۔"وہ رات کو شہر کیوں گیا ہے؟"

وہ بولی۔"شمبھو دادا نے اسے پورے سو روپے کا کام دینے کے لئے بلایا ہے۔

وہ صبح آئے گا۔"

بنواری لال نے دانت پیس کر محبوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔"شمبھو دادا...."

محبوب نے کہا۔"بڑی سیاست کھیلی جا رہی ہے۔ وہ کانگریسی نیتا ہمارے ناگ پارا کے آدمی کو گرگا بنا کر آگ لگا رہا ہے۔"

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔"اس کتے کو آگ لگانے کے لئے ہماری ہی پارو کا گھر ملا تھا۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ایسے تڑپا تڑپا کر ماریں گے کہ پھر کوئی نیتا ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا۔ بابو جی اور کشوری لال نے اسے پکڑ لیا۔"رک جاؤ... صبح ہونے دو۔ اس سے کوئی نہیں ملے گا۔ پتہ نہیں وہ پارو کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"بابو جی! ہم جا کر ڈھونڈ لیں گے۔ وہ ضرور ملے گی۔"

"کہاں ملے گی؟ کہاں جاؤ گے؟ کیا اندھے کی طرح بھٹکتے رہو گے؟ ذرا صبر کرو منگو اور شمبھو کو پکڑنے کے بعد ہی تم پارو تک پہنچ سکو گے۔"

ایسے وقت کوتوال سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اسے بنواری اور محبوب سے کچھ نہ کچھ ماہانہ رقم ملتی رہتی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر دونوں کو نمستے کہا۔ محبوب سے ہمدردی کی۔"علی میاں! یہ کیا ہو گیا؟ شادی کا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ تم فکر نہ کرو میں شام تک مجرموں کو پکڑ لوں گا۔ پارو بی بی کو واپس لے آؤں گا۔"

سپاہی لوگوں کو گھر کے آنگن سے باہر جانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ ایسے وقت محبوب نے دور آنگن کی کچی زمین پر کالج کی ایک کاپی پڑی ہوئی دیکھی۔ اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ اوپر ماہ پارا کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ نام بے اختیار اس کے سینے سے آ کر لگ گیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔"مجھے ڈھونڈو.... مجھے دھڑکنوں سے لگاؤ۔"

اس نے سر گھما کر کوتوال ہری داس کو دیکھا۔ بابو جی اسے منگو کے کڑے کے متعلق بتا رہے تھے۔ وہاں سے تین لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے شہر لے جانے کا مسئلہ تھا۔ انہیں تانگوں پر ڈال کر نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا کئی لوگ انہیں تین

چارپائیوں پر ڈال کر سپاہیوں کے ساتھ شہر لے گئے۔

محلے کے تمام لوگ وہاں سے باہر چلے گئے تھے۔ پارو محبوب کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔اس نے آنگن کے دروازے کو اندر سے بند کیا۔پھر کوتوال کو ایک طرف لے جا کر کہا۔"آپ کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔"آپ ایسے وقت میری بیٹی کی شادی..."

"میں جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دیں۔"

"ہاں۔دو مہینے بعد شادی ہے۔"

"آپ ہم سے پچیس ہزار روپے قرض مانگ رہے تھے۔ہم ابھی دیں گے۔"

وہ ایکدم سے خوش ہو کر سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔محبوب نے کہا۔"آپ ہماری آنکھوں کے سامنے مجرموں قاتلوں کو پکڑیں گے تو یہ رقم قرض نہیں ہوگی۔آپ کو انعام میں ملے گی اور پارو واپس ملے گی تو ہم پچاس ہزار روپے دیں گے۔"

کوتوال ہری داس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ بنواری نے پوچھا۔"داس جی! کبھی اتنے روپے ایک ساتھ گھر لے گئے ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔اسے اتنی بڑی رشوت پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔بنواری نے کہا۔"میری بہو واپس آئے تو میں بھی اوپر سے دس ہزار دوں گا۔"

اس کا منہ حیرت سے اور مسرت سے کھل گیا۔محبوب نے کہا۔"اب کھل جائیں اور بتائیں یہاں کیا سیاست کھیلی جا رہی ہے؟"

"ایں.." وہ چونک کر ہچکچاتے ہوئے بولا۔"میں کوئی سیاست ویاست نہیں جانتا۔میں کچھ نہیں جانتا۔کل شام تک ان واردات کرنے والوں کو پکڑ لوں گا۔"

بنواری نے کہا۔"شیر کی جگہ بکری پکڑ کر لاؤ گے ہم اتنے بدھو نہیں ہیں کہ آنکھیں بند کر کے تمہیں پچاس ساٹھ ہزار دے دیں گے۔'

محبوب نے کہا۔"ایسی بڑی واردات ہر جگہ کوتوال کی ملی بھگت سے ہوتی ہے۔ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔آپ صاف اور سیدھا لین دین رکھیں گے، جو سچ ہے وہ بتائیں گے تو...."

اس نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی پھر کہا۔"ہم ابھی پانچ ہزار روپے

ایڈوانس دیں گے۔"

اس نے نوٹوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔"وہ بات یہ ہے کہ ہم تو اوپر والوں کے حکم سے مجبور ہو جاتے ہیں۔دہلی سے آرڈر آیا تھا کہ آج رات ناگ پارا میں کچھ بھی ہو جائے، ادھر نہ جائیں۔بعد میں کارروائی کرنے کی اجازت تھی اس لئے ابھی آئے ہیں۔"

"ہمیں تمہاری مجبوریوں سے کچھ نہیں لینا ہے۔واردات کرنے والوں کے نام بتاؤ؟"

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ یہ سب شمبھو دادا نے خود نہیں کیا ہے۔ دوسروں سے کرایا ہے۔"

علی نے کہا۔"بابو جی! ایک سرا مل گیا ہے۔ہم اس کے ذریعے دوسرے قاتلوں تک پہنچ سکیں گے، مگر پہلے پارو تک پہنچیں گے۔"

"بیٹے! شمبھو دادا کی پہنچ دہلی تک ہے۔تم اس سے دشمنی کرو گے تو اسے کھل کر تم سے دشمنی کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"بابو جی! میری کوشش ہوگی کہ اسے دشمن نہ بناؤں پہلے پارو تک پہنچ جاؤں اس کے بعد خالہ جان پھوپھی اور بنے میاں کے قاتلوں سے نمٹوں گا۔"

پھر اس نے کوتوال سے کہا۔"آئیے داس جی! حویلی میں چلتے ہیں۔وہاں آپ کی سیوا کریں گے۔"

اس نے بنواری لال اور کشوری لال سے کہا۔"مجھے واپس آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔جب پوسٹ مارٹم کے بعد تین میتیں لائی جائیں گی تو آپ آخری رسومات کا انتظام کریں گے۔ہم شام تک ضرور آ جائیں گے۔"

باہر اس کی بگھی آ گئی تھی۔ملازم ایک گھوڑا بھی لے آیا تھا۔اس نے ملازم سے کہا۔"ہم بگھی پر رہیں گے تم گھوڑا ساتھ لے کر چلو۔"

کوتوال اس کے ساتھ بگھی میں بیٹھ گیا۔وہ حویلی کی طرف جانے لگے۔محبوب نے کہا۔"آپ یہ بتائیں ہم کتنی جلدی پارو کو واپس لا سکتے ہیں؟ کیسے معلوم کر سکتے ہیں کہ شمبھو کے آدمی اسے کہاں لے گئے ہوں گے؟"

کوتوال نے کہا۔"یہ شمبھو اور اس کے خاص آدمی ہی جانتے ہوں گے۔ شمبھو تو بھولا بھالا انجان بن کر رہے گا۔ یہاں جو ہوا ہے اس کا الزام کبھی اپنے سر نہیں لے گا۔"

"آپ ہمیشہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مجرموں کے حلق میں ہاتھ ڈال کر اندر کا بھید نکال لیتے ہیں۔ ہم بہت بڑی رقم دینے والے ہیں۔ آپ یہ کام کر دکھائیں۔"

اس نے کہا۔"ہم مجرموں کو پکڑ کر الٹا لٹکا دیتے ہیں۔ ان کی پٹائی کرتے ہیں۔ تب وہ اندر کی بات اگلتے ہیں۔ شمبھو ایک نیتا ہے۔ بڑے نام والا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اسے تو ہاتھ بھی نہیں لگا سکیں گے۔"

"تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ شمبھو کمزور ہوگیا ہے۔ اس کی گردن آپ کے شکنجے میں آگئی ہے۔ تب تو وہ اپنی تمام کمینگیوں اور بدمعاشیوں کا اقرار کرے گا؟"

"تب تو اس کا باپ بھی مان لے گا۔"

"تو پھر سوچو کہ شمبھو کو یا کسی بھی طاقتور کو کیسے کمزور بنایا جاسکتا ہے؟"

وہ زیرلب بڑبڑایا۔"ہوں۔ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟"

وہ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔"شمبھو کو تو کوئی مجبور بنا ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں بنا سکتا؟ آپ کی طاقت کیا ہے؟ یہ کوتوال کی وردی ہے۔ اسے اتار دیا جائے نوکری سے نکال دیا جائے تو آپ کا تمام رعب اور دبدبہ پانی ہوجائے گا۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔"ہاں۔ میرا کوتوال بن کر رہنا میری شکتی ہے۔ نہیں تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"شمبھو نیتا نہیں رہے گا تو معمولی سا آدمی رہ جائے گا۔"

"وہ تو نیتا رہے گا۔ ہندوستان آجاد ہوگا تو وہ اور بہت بڑا نیتا بن جائے گا۔"

"ہم جو کہہ رہے اس بات کو سمجھو' انسان کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے دماغ میں چوٹ لگ سکتی ہے۔ وہ پاگل ہوسکتا ہے۔ کسی حادثے میں لنگڑا لولا بن سکتا ہے۔ پھر کیا نیتا بن کر رہ سکے گا؟"

"تب تو وہ مندر کی سیڑھیوں پر بھیک مانگے گا۔"

"بس ایسی ہی کوئی تدبیر لڑائیں کہ وہ مندر کی سیڑھیوں پر پہنچے یا نہ پہنچے ہمارے سامنے بے بس اور مجبور ہوجائے۔"

وہ حویلی میں پہنچ گئے۔ محبوب نے بیٹھک میں آکر اس کی مٹھی میں پانچ ہزار روپے پکڑاتے ہوئے کہا۔"اس رقم کو مضبوطی سے پکڑ کر یقین کرتے رہیں کہ پچاس ہزار ملنے والے ہیں اور تب ملنے والے ہیں جب وہ دشمن کمزور ہوگا اور پارو ہمیں ملے گی۔"

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔"ہم ابھی آتے ہیں، آپ دماغ لڑاتے رہیں۔"

اس نے خوابگاہ میں آکر پارو کی کاپی کو بستر کے سرہانے رکھا۔ پھر لباس تبدیل کرنے لگا۔ اس کے لئے دل میں کھلبلی تھی۔ ذہن میں کتنے ہی سوالات چیخ رہے تھے۔"پتہ نہیں وہ کہاں ہوگی...؟

وہ کس حال میں ہوگی؟

یہ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟

کیا وہ پھر لٹ جائے گی...؟ یا خدا میں کیا کروں؟

کیا دشمن اسے یہاں واپس آنے کے لئے زندہ چھوڑ دیں گے؟"

ہر سوال جیسے ایک خنجر تھا اور تمام خنجر اسے کچوکے لگا رہے تھے۔ جذبے تڑپ کر کہتے تھے کہ اڑ کر اس مظلوم لڑکی کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن وہ آنکھیں بند کرکے ٹھوکریں کھانے اور ناکام ہونے کے لئے کہیں جانے کی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ بڑے صبر وضبط سے پہلے اس کا سراغ لگا رہا تھا اور دشمنوں سے نمٹنے کی تدبیر کر رہا تھا۔

اس نے چست پتلون قمیض اور ہاف آستین کی جیکٹ پہنی۔ شانے سے لٹکانے والے بیگ میں نوٹوں کی گڈیاں ریوالور اور گولیاں رکھیں۔ پھر اس کاپی کو یوں اٹھایا، جیسے پارو کو تھام رہا ہو۔

وہ کبھی اس کے پاس نہیں آئی اس کی کوئی چیز تو آگئی تھی۔ اس نے کاپی کو پوری طرح سے کھول کر چہرے سے لگالیا۔ جیسے چہرے سے چہرہ ملا رہا ہو۔

وہ ان لمحات میں اس کے پاس اس کی سانسوں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس

کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔گویا وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے دیکھ ہی لیا۔

کاپی کے اس صفحے پر اسے اپنا نام لکھا ہوا دکھائی دیا۔اسے یقین نہیں آیا۔اس نے اسے ذرا پرے ہٹا کر پڑھا۔وہاں لکھا ہوا تھا۔"محبوب علی! آج تم لازمی ہو گئے..."

وہ مختصر سی تحریر کیا تھی۔پھولوں کی بارش تھی۔دل کی دھڑکنیں ایکدم سے تیز ہو گئیں، پوچھنے لگیں۔"محبوب علی...! کیا تم پارو کے لئے لازمی ہو گئے ہو؟"

وہ فوراً ہی اس صفحے کو شروع سے پڑھنے لگا۔"ہائے! تحریر کیا تھی بھری مراد تھی۔ آسمانی صحیفے کی طرح دل میں اتر رہی تھی۔"

وہ جو "نک چڑھی" تھی۔اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔اس صفحے پر اپنے قلم سے اسے دیکھ رہی تھی۔اس کے الفاظ دھیمی دھیمی سرگوشیاں کر رہے تھے۔وہ کہہ رہی تھی۔"محبوب علی! ایک بات کہوں....؟ تمہارے لئے جو اپنائیت پیدا ہو رہی ہے وہ کچھ محبت محبت سی لگ رہی ہے....."

وہ خوشی سے اچھل پڑا۔اب تک مایوس ہوتے رہنے کے باوجود اس سے محبت کی توقع کرتا رہا تھا۔وہ توقع پوری ہو رہی تھی۔اس کی دعا قبول ہو رہی تھی۔جذبہ دل کی سچائی نے پتھر کو موم کر دیا تھا۔

وہ خوشی سے پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے ادھر جانے لگا۔مستی میں آ کر ناچنے لگا۔پھر کاپی کو سینے سے لگا کر بے اختیار چیخ کر کہنے لگا۔"پارو! ہم آ رہے ہیں۔ہم نہیں جانتے تم کہاں ہو؟ خدا کی قسم ہم آ رہے ہیں اور خدا کی قسم ہم خالی ہاتھ واپس نہیں آئیں گے۔تم ہمارے بازوؤں میں سینے سے لگ کر آؤ گی۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے ادھر جانے لگا۔اسے ایسے وقت پارو کا پیار مل رہا تھا' جب وہ چھین لی گئی تھی۔ایسے وقت تو اس جانِ جگر کو بازوؤں میں ہونا چاہئے تھا۔یہ خیال اور قربت کی آرزو اسے تڑپا رہی تھی۔"میں کہاں جاؤں؟ کہاں سے اس کا ہاتھ پکڑ کے لے آؤں؟"

بہت جلدی بھی تھی اور صبر وتحمل سے بھی کام لینا تھا۔وہ اس کاپی کو الماری میں

حفاظت سے رکھ بیٹھک میں آ گیا۔ہری داس نے کہا۔"میں دماغ لڑا رہا ہوں۔یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ تمہیں اکیلا کہیں ملے تو تم اسے دبوچ لو گے؟ تمہارے پاس ریوالور بھی ہے۔"

محبوب نے پوچھا۔"وہ کہیں اکیلا مل سکتا ہے؟"

وہ دونوں باہر آ کر بگھی میں بیٹھ گئے۔ہری داس نے کہا۔"دن رات اس کے چیلے چپاٹے ساتھ رہتے ہیں۔مگر ہاں۔وہ سویرے سویرے اکیلا کھیتوں میں جاتا ہے۔"

"کیا اس کے گھر میں سنڈاس نہیں ہے؟"

"ہے۔مگر مہتر چوبیس گھنٹوں میں ایک بار صفائی کے لئے آتا ہے۔گندگی کے کارن مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔اس لئے وہ اپنے گھر کے پیچھے کھیتوں میں جاتا۔"

محبوب بگھی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔"ایک گھنٹے میں صبح ہونے والی ہے۔ اگر وہ روز صبح جاتا ہے تو آج بھی جائے گا۔"

"ہاں اور اکیلا ہو گا۔تم آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤ گے۔میں نہیں جاؤں گا۔ اس کو معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ ادھر کا راستہ میں نے بتایا ہے۔"

وہ چابک مار کر گھوڑے کی رفتار بڑھانے لگا۔جذبات کی ہلچل اسے بھی چابک مار رہی تھی۔اس کی بھی رفتار بڑھا رہی تھی اور وہ گھوڑے سے آگے اڑا جا رہا تھا۔ دشمن کی شہ رگ تک پہنچ رہا تھا۔

ساری بات رفتار کی ہے۔وقت اور حالات کے مطابق تیز رفتاری منزل تک پہنچا دیتی ہے۔بعض اوقات تیز وتند اور اندھا دھند رفتار اوندھے منہ گرا دیتی ہے۔

شمبھو دادا کبھی رامپور کا بہت ہی خطرناک غنڈہ کہلاتا تھا۔اس نے کئی قتل کئے تھے۔ڈاکے ڈالے تھے۔اکثر شراب و کباب کی مستی میں پرشباب لڑکیوں کو اٹھا کر لے جایا کرتا تھا۔

اس کے کھاتے میں کئی دہشت زدہ کردینے والے کارنامے تھے۔انگریز سرکار نے اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا تھا،مگر گرفتار نہیں کیا تھا۔کیونکہ انگریزوں کی حکومت کمزور ہوتی جارہی تھی۔ان کے خلاف پورے ہندوستان میں بغاوت پھیل رہی تھی اور وہ انڈیا چھوڑ کر جانے والے تھے۔ان حالات میں شمبھو باغیوں کا نیتا بن گیا تھا۔

چونکہ پڑھا لکھا بدمعاش تھا۔اس لئے اسے کانگریس کی رکنیت حاصل ہوگئی تھی۔وہ کانگریسی نیتا بن کر پورے رامپور کا بے تاج بادشاہ بن گیا تھا۔

کانگریس،شیوسینا اور اکالی دل جیسی پارٹیاں چاہتی تھیں کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو۔پاکستان وجود میں نہ آئے۔انگریز جانے سے پہلے ہندوستان صرف ہندوؤں کے حوالے کردیں۔ان کا دعویٰ تھا کہ مسلمان کسی بھی صوبے میں حکومت بنانے والی اکثریت نہیں رکھتے۔

یہ ثابت کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں کہ مسلمان شرپسند ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات برپا کرکے اپنی طاقت منوانا چاہتے ہیں۔محمد علی جناح ایک الگ ریاست قائم کرنے کے لئے بظاہر قانونی جنگ لڑرہے ہیں۔مگر حقیقتاً وہ لڑ کر پاکستان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اسی لئے ان کا نعرہ بھی یہی ہے۔''لڑ کے لیں گے پاکستان....''

شمبھو دادا نے رامپور میں اور آس پاس کے چھوٹے بڑے شہروں میں بلوا کرایا تھا۔اب اس نے ناگ پارا میں بھی یہ آگ بھڑکائی تھی۔یہ نتیجہ دیکھنے کے لئے بے چین تھا کہ وہاں ایک گھر جلنے،تین قتل ہونے اور ایک جوان لڑکی کو اغواء کرنے کے بعد مسلمان مشتعل ہوچکے ہیں یا نہیں؟

وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔اس کے تربیت یافتہ غنڈے بڑی دل ہلا دینے والی واردات کرنے گئے تھے۔منصور نے شمبھو دادا سے یہ بات منوائی تھی کہ اس گھر میں پارو نامی لڑکی دلہن بن رہی ہے۔اسے اغواء کرکے کم از کم ایک دن کے لئے اس کے حوالے کیا جائے۔

پاور کا تھوک اسکی مردانگی کو غضب ناک بنا چکا تھا۔اس نے جوتے بھی مارے تھے۔وہ قسم کھا چکا تھا کہ پھر ایک بار اس کی آبرو کی دھجیاں اڑائے گا۔اس کے بعد اسے غنڈوں کے حوالے کرکے اسے بازاری عورت بنادے گا۔صرف ایک لڑکی سے انتقام لینے کے لئے وہ شمبھو دادا کے جوتوں میں آکر بیٹھ گیا تھا۔اسے یقین تھا کہ اب محبوب علی کے مقابلے میں بھی طاقتور بن جائے گا۔آئندہ اس سے بھی انتقام لیتا رہے گا۔

دیکھا جائے تو وہ محبوب سے ہی انتقام لے رہا تھا۔اس کی دلہن کو اغوا کراچکا تھا۔شمبھو کے پیچھے چھپا ہوا بڑی خاموشی سے اسے للکار رہا تھا۔اسے طیش دلا رہا تھا اور اسے تلاش یار میں جانے کب تک بھٹکانے والا تھا؟

ابھی تو وہ دارو کے نشے میں گہری نیند سو رہا تھا۔یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کمینگی سے ایک مسلمان گھرانہ کس طرح خاک میں مل چکا ہے۔ایک مسلمان نے کافر کے کاندھے پر بیٹھ کر مسلمانوں کو خاک و خون میں ملایا تھا اور آئندہ کے لئے ان پر ناگ پارا کی زمین تنگ کررہا تھا۔

رات کے ایک بجے ایک چیلے نے آکر شمبھو کو بتایا کہ ناگ پارا کے اس گھر کو جلا کر راکھ کردیا گیا ہے۔ایک مرد اور دو عورتوں کی ہتیا کی گئی ہے اور ایک لڑکی کو اٹھا کر لایا گیا ہے۔اس کے خفیہ اڈے میں اسے پہنچا دیا گیا ہے۔

شمبھو نے خوش ہوکر اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔''یہ ہوئی ناں بات....

وہ کہتے تھے' ناگ پارا میں بلوا نہیں ہوگا۔ آج تو بنیاد پڑ ہی گئی۔"

وہ ولایتی پی رہا تھا۔ ایک پیگ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ بتاؤ کہ ناگ پارا والے کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

"عورتیں رو رہی ہیں۔ مرد بالٹیاں بھر بھر کے آگ بجھا رہے ہیں۔ سب ہی پریشان ہیں۔ ہائے ہائے کر رہے ہیں۔"

"کیا انہیں منگو کا کڑا نہیں ملا؟"

"مل گیا ہے۔ سب کہہ رہے ہیں کہ ناگ پارا کا ہندو بلوائیوں کو لے کر وہاں آیا تھا۔"

"پھر تو مسلمان غصہ دکھا رہے ہوں گے؟ ہندوؤں کو دشمن کہہ رہے ہوں؟"

"ایسا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ منگو وہاں جائے گا۔ اس سے پوچھ گچھ ہوگی، تب شائد بات بڑھے گی۔"

وہ سوچنے لگا اور پینے لگا۔ اس نے کہا۔ "بات بڑھنی چاہئے۔ میرے آدمیوں نے بڑے دھماکے والا کام کیا ہے۔ مجھے جشن منانا چاہئے۔ مگر شراب ہے شباب نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "ہے دادا! آپ کے اڈے میں جبردست پھلجڑی ہے۔"

شمبھو نے پوچھا۔ "ہوں....کیسی ہے؟"

"میں بول نہیں سکتا کتنی سندر ہے۔ اندر سبھا کی اپسرا لگتی ہے۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟ یا بڑھا چڑھا کے بول رہے ہو؟"

"سچ بول رہا ہوں۔ آپ اس کو دیکھیں گے تو چھوڑیں گے نہیں...."

وہ ایک سانس میں گلاس خالی کر کے ڈکار لیتے ہوئے بولا۔ "میری بگیا میں پھول کھلا ہے اور میں ادھر بیٹھا ہوں۔ چلو اس کے درشن کرتے ہیں۔"

وہ اپنے وسیع وعریض مکان کے ڈرائنگ روم میں دھوتی اور بنیان پہنے بیٹھا تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جاتے ہوئے بولا۔ "وہ مسلا (مسلمان) منصور اس چھوکری کا دیوانہ ہے۔ اس کو اٹھا کے لانے کو بولا تھا۔ وہ جرور جبردست چیج ہوگی۔"

ایک کمرے سے اس کی پتنی نے آواز دی۔ "اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟"

وہ مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "چپ سے سو جا۔ ابھی آجاؤں گا۔ سالی بڈھی ہوگئی ہے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میرا بنا سوتی نہیں ہے۔"

باہر کھٹارا جیپ کھڑی تھی۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہزاروں فوجی گاڑیوں کی نیلامی ہوئی تھی۔ اس نے تین ہزار میں وہ کھٹارا خرید لی تھی۔ اس میں بڑی شان سے گھوما کرتا تھا۔ کوئی اسے کہیں جھک کر سلام کرتا تو خود کو راجہ مہاراجہ سمجھنے لگتا تھا۔

اس کے مکان کے پیچھے دور تک کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ وہاں سے ایک پختہ سڑک دہلی کی طرف جاتی تھی۔ تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی میں ایک بڑا سا مکان تھا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت اپنے جوان بیٹوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے بیٹے شمبھو دادا کے چیلے تھے۔

انہوں نے پارو کو گھر میں لا کر ایک کمرے میں بند کیا تھا۔ اسے دھمکی دی تھی کہ منہ سے آواز نکالے گی یا بھاگنا چاہے گی تو اسے کاٹ کر پھینک دیں گے۔

وہ سہم کر چپ رہی تھی۔ اس نے وہاں پہنچتے وقت دیکھا تھا اسے کسی ویرانے میں لایا گیا تھا۔ وہاں چیخنے چلانے سے کوئی اس کی مدد کو آنے والا نہیں تھا۔ وہ بے بسی سے رونے لگی۔ خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی کہ موت آجائے یا کسی طرح وہ گھر واپس پہنچ جائے۔

اس ویرانے میں دونوں ہی باتیں ممکن نہیں تھیں۔ یہ فکر اور سوچ تھی کہ ماں کو ماموں کو اور پھوپھی کو مار ڈالا گیا ہے۔ صرف اسے زندہ کیوں لایا گیا ہے؟

اس کا حسن اس کی نوعمری خود اس کے لئے عذاب بن گئی تھی۔ یہ بات سمجھ گئی تھی کہ وہاں اس کی پوجا نہیں کی جائے گی۔ اسے پوجا کے پرساد کی طرح بانٹا جائے گا۔

باہر رات کے سناٹے میں کھٹارا جیپ کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک جوان نے کہا۔ "دادا بھائی آگئے۔"

وہ باہر چلا گیا۔ اس کی بوڑھی ماں نے پارو کے قریب آکر کہا۔ "ہمارے ان داتا آئے ہیں۔ ان کے سامنے جیادہ نکھرے نہ دکھانا۔ ان کو کھش کرے گی تو جندہ رہے

گی۔نہیں تو تیرا کریا کرم کرنے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ بری طرح سہمی ہوئی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔دیوار کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کھڑے کھڑے گر پڑتی۔باہر سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔اس بڑھیا کا بیٹا کہہ رہا تھا۔"دادا بھائی!انہیں تو آگ میں پھینک دیا گیا تھا۔یوں سمجھو مسلمان عورتوں کو جندہ چتا میں جلا دیا ہے۔"

شمبھو کی آواز سنائی دی۔"پھر تو ناگ پارا کے مسلمان لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو رہے ہوں گے؟"

"ہاں۔آج کل میں دنگا پھساد جرور ہوگا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے کمرے میں آئے۔شمبھو دادا نے دور کھڑی ہوئی پارو کو دیکھا تو رک گیا۔اسے سر سے پاؤں تک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔"سچ مچ سندر ہے۔ گجب کی چیج ہے۔رگھو...!جیب میں بوتل رکھی ہے۔دوڑ کر لے آ..."

رگھو دوڑتا ہوا کمرے سے باہر گیا۔بڑھیا مسکراتی ہوئی دروازے سے باہر آئی۔ پھر اس کے پٹ بند کر دیئے۔جہاں حسین لڑکیاں ہوتی ہیں'وہاں دروازے اندر سے ضرور بند ہوتے ہیں۔

منصور نے گھر آ کر اسے لوٹا تھا۔شمبھو دادا گھر لا کر لوٹنے کھسوٹنے والا تھا۔رگھو بوتل اور گلاس لایا۔کھاٹ کے پاس ایک شکستہ سی میز تھی۔وہ پینے کا سامان وہاں رکھ کر چلا گیا۔

شمبھو نے بوتل اٹھا کر اسے کھولتے ہوئے کہا۔"اے بلبل!یہ کھل رہی ہے۔تو بھی کھل جا۔پہلے اوپر سے...دھیرے دھیرے جلوہ دکھا۔ایکدم سے دکھائے گی تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ہی ہی...وہ ہنستے ہوئے بولا۔"بھری ہوئی بوتل اور بھری ہوئی جوانی پاگل کر دیتی ہے۔"

وہ دیوار سے اور زیادہ چپک گئی۔یہ دہشت تھی کہ وہ ظالم نہ جانے کیسی کیسی حرکتیں کرنے والا ہے؟اتنا سمجھ گئی تھی کہ بھاگنے کا بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔وہاں صرف خدا ہی بچا سکتا ہے۔

وہ دل ہی دل میں کلام پاک کی آیات پڑھنے لگی۔وہ بوتل کو منہ سے لگا کر دو گھونٹ پینے کے بعد بولا۔"اے!کھڑی کیا ہے؟سنا نہیں؟اوپر سے چھلکا اتار... پہلے جھلک دکھا...پہلے میں جرا دور سے دیکھتا ہوں پھر چمبک کے طرح آ کے چپک جاتا ہوں۔"

ہی ہی ہی....وہ پھر بوتل کو منہ سے لگا کر پینے لگا۔پہلے وہ زیر لب پڑھ رہی تھی۔پھر گھبرا کر اونچی آواز میں پڑھنے لگی۔وہ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔بوتل کو میز پر رکھتے ہوئے بولا۔"اے!یہ کیا بول رہی ہے؟کوئی منتر پڑھ رہی ہے؟"

وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔"نہیں۔یہ تو عربی بھاشا ہے۔اچھا اپنے اوپر والے کو پکار رہی ہے۔نیچے دھرتی پر تو تیرا کوئی رہا نہیں۔ہی ہی...."

وہ اس کے چہرے کو ادھر ادھر سے چھونے لگا۔"کیا بات ہے۔جہاں ہاتھ لگاؤ انگلیاں پھسل جاتی ہیں۔گلاب کی پتی ہے۔وہ سالا تجھے دلہن بنا کر مجے کرنے والا تھا۔مگر کیسے کرتا؟تُو تو میرے بھاگ میں لکھی ہوئی تھی۔"

وہ اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھرنا چاہتا تھا۔وہ تڑپ کر نکل گئی۔کہیں بھاگ نہیں سکتی تھی۔بس دور ہو سکتی تھی۔مگر دو قدم پیچھے ہٹتے ہی سر چکرانے لگا۔آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔وہ کھڑے کھڑے ڈگمگائی پھر فرش پر گر پڑی۔

اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔"واہ کیا ایکٹنگ کر رہی ہے؟ سمجھتی۔چھوڑ دوں گا۔اے!چل اٹھ...."

اس نے ایک ٹھوکر ماری وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ چاروں شانے چت پڑی رہی۔اس نے دوسری ٹھوکر ماری اسے تکلیف سے کراہنا چاہئے تھا۔مگر وہ ایک لاش کی طرح ٹھوکروں سے دکھ تکلیف سے بے نیاز ہوگئی تھی۔

اس نے جھک کر دیدے پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔"اے!ڈھونگ رچا رہی ہے۔اٹھتی ہے یا نہیں؟"

اس نے ایک بازو پکڑ کر اسے اٹھایا پھر کھینچ کر بٹھایا۔لیکن بازو چھوڑتے ہی وہ پھر فرش پر چت ہو گئی۔تب اسے تشویش ہوئی۔وہ وہاں سے اٹھ کر دروازے پر آ کر بولا۔"اے رگھو!یہاں آ۔اسے دیکھ۔معلوم ہوتا ہے یہ مر گئی ہے۔"

رگھو بوڑھی ماں کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا۔وہ جس طرح فرش پر پڑی ہوئی تھی۔
اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ مر چکی ہے۔رگھو نے جھک کر اسے ٹٹول کر دیکھا۔
بڑھیا نے اس کی کلائی تھام لی۔وہ تجربہ کار نباض تھی۔اس نے شمبھو کو دیکھتے ہوئے
کہا۔"یہ جندہ ہے مگر گربھ وتی ہے۔"

شمبھو نے چونک کر پارو کو دیکھا۔پھر بڑھیا سے پوچھا۔"کیا کہہ رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔اسے ہاتھ لگاؤ گے تو گھور پاپ ہوگا۔جو عورتیں ماں بننے
والی ہوتی ہیں ان پر ماں جگدمبے کا سایہ ہوتا ہے۔"

شمبھو ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ہندو صرف بھگوان اور دیوتاؤں کو ہی نہیں۔
عورتوں کو بھی دیویاں مان کر پوجتے ہیں۔سرسوتی دیوی اور ماں جگدمبے کی پوجا
کرنے والے ہندو کبھی کسی بیاہتا اور حاملہ عورت کو بری نیت سے ہاتھ نہیں لگاتے۔
اور شمبھو تو ماں جگدمبے کا پجاری تھا۔

وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔بڑی مدت کے بعد ایک ایسی سندر لڑکی ہاتھ آئی
تھی جسے یونہی چھوڑ دینے کو جی نہیں کر رہا تھا اور یہ مانتا بھی تھا کہ اسے ہاتھ لگانا مہا
پاپ ہوگا۔ماں جگدمبے کا کرودھ اسے تباہ و برباد کر دے گا۔

وہ کھاٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔بوتل اٹھا کر پینے لگا۔پھر بولا۔"یہ میرے دل میں
گھس گئی ہے۔میں کیا کروں؟"

بڑھیا نے کہا۔"ابھی تو کچھ نہ کرو۔دھیرج رکھو۔تھوڑا سمے بیت جانے دو۔
جب بچہ ہو جائے گا۔تب اسے رکھیل بنا کے رکھ لینا۔"

وہ ایک گھونٹ پی کر بولا۔"اس کو چھوڑوں گا نہیں... مجبوری ہے۔انتجار کرنا
ہوگا۔"

پھر وہ چونک کر پارو کو دیکھتے ہوئے بولا۔"مگر یہ تو آج دلہن بننے والی تھی۔اس
سے پہلے ماں کیسے بن رہی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پہلے ہی کسی کے ساتھ منہ
کالا کرتی رہی ہے۔"

وہ پھر دو گھونٹ پی کر بولا۔"دھت تیرے کی... میں اس کو کوری کنواری سمجھ رہا
تھا۔وہ سالا محبوب بھی دھوکہ کھانے والا تھا۔اسے اچھوتی سمجھ کر دلہن بنانے والا

تھا۔"

وہ کھاٹ سے اٹھ کر پارو کو گھورتا ہوا اس کے قریب آیا پھر بولا۔"ابھی ایک
آئیڈیا دماگ میں آ رہا ہے۔اے مائی! یہ بتا کتنے دنوں میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک
لڑکی پیٹ سے ہو گئی ہے؟"

وہ بولی۔"پہلا مہینہ ہی رک جائے تو شبہ ہوتا ہے۔دوسرا مہینہ بھی رک جائے تو
پھر یکین ہو جاتا ہے۔میں تو پہلے مہینے میں ہی ناڑی (نبض) پکڑ کے بول دیتی ہوں
کیا ہونے والا ہے؟ اور کتنے دنوں کا پیٹ ہے؟"

"اس کی بات بول... کتنے دن ہوئے ہیں؟"

"دو مہینے ہو گئے ہیں یہ تیسرا چل رہا ہے۔تم اتنی باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مسلمانوں کو شرم گیرت دلانے اور گسّا دلانے کا ایک پھنٹاسٹک آئیڈیا دماگ
میں آیا ہے۔"

وہ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔"ناگ پارا کے مسلمان لڑنے مرنے
کے لئے گھروں سے نکل آئیں گے۔"

اس نے بڑھیا سے کہا۔"مائی! ٹھیک سے حساب کر کے بتاؤ ہم اس چھوری کو
یہاں کتنے دن رکھیں اور کتنے دن بعد ناگ پارا بھیج دیں اور کھبر پھیلا دیں کہ یہ
ہندو کا بچہ پیٹ میں لے کے آئی ہے؟"

رگھو نے کہا۔"واہ دادا بھائی! کیا دماگ پایا ہے۔اب تو پورے ناگ پارا کے
مسلمان یہی کہیں گے کہ ہندوؤں نے بیچاری کا گھر جلا دیا۔اس کی ماں کو جندہ جلا دیا
اس کے ماموں کو مار ڈالا اب اس کے پیٹ میں اپنا بچہ دے کے مسلمانوں کے منہ
پر جوتے مار رہے ہیں۔"

شمبھو نے کہا۔"بنواری لال اور محبوب دعویٰ کر رہے تھے کہ ناگ پارا کے ہندو
مسلمان کبھی نہیں لڑیں گے اب تو مسلمان ہندوؤں پر چڑھ دوڑیں گے تب ہندوؤں
کو بھی لڑنا ہی ہوگا۔اس کو بولتے ہیں پولیٹکس یعنی راج نیتی یعنی سیاست...."

پھر اس نے بڑھیا سے پوچھا۔"تم چپ کیوں ہو حساب لگاؤ۔"

وہ بولی۔"تم ایک مہینے کے بعد کہہ سکو گے کہ وہ یہاں سے ماں بن کر جا رہی

ہے۔"

وہ سوچنے لگا۔"اوں.....میں جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنا کر بنواری اور محبوب کے منہ پر ماروں گا۔"

وہ بولی۔"ایک مہینے کے بعد جب یہ بات پھیلاؤ گے تو اصل میں تین مہینے بیت چکے ہوں گے۔یہ اگلے چھ مہینے میں بچہ دے گی۔تب یہ بھید کھل جائے گا کہ یہاں آنے سے پہلے یہ ماں بننے والی تھی۔اس کے پیٹ میں کسی ہندو کا بچہ نہیں ہے۔"

شمبھو نے کہا۔"ہمارا جھوٹ چھ ماہ کے بعد کھلے گا۔اس سے پہلے ناگ پارا کے ہندو مسلمان لڑ مریں گے۔بس ہم اتنا ہی چاہتے ہیں۔اس کے بعد یہ ثابت کریں گے کہ اس لڑکی نے ایک ہندو سے پیار کیا تھا۔اپنی مرجی سے منہ کالا کرتی رہی پھر مسلمانوں نے اس بات کو دنگے فساد کا بہانہ بنالیا۔"

اس نے بوتل اٹھائی پھر رگھو کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولا۔"اس لڑکی کا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔"سب اسے پارو بولتے ہیں۔"

"ہوں۔اسے اچھا کھلاؤ پلاؤ۔پولیس والے ادھر آئیں گے تو میں کوتوال سے نمٹ لوں گا۔"

وہ رگھو کو سو روپے دے کر جیپ میں بیٹھ کر گھر واپس آیا۔پچھلی تمام رات جاگتا رہا تھا۔اب بھی نیند نہیں آرہی تھی۔لیکن شیطانی تدابیر سوچنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے سونا ضروری تھا۔پھر وہ بیدار ہو کر تازہ دم ہو کر آگے بہت کچھ کر سکتا تھا۔

اپنے معمول کے مطابق کھیتوں میں جانا ضروری تھا۔بہت زیادہ کھانے پینے کے بعد بوجھل پیٹ کو ہلکا کئے بغیر نیند نہیں آسکتی تھی۔وہ لوٹے میں پانی بھر کر مکان کا پچھلا دروازہ کھول کر کھیتوں کی طرف جانے لگا۔

صبح کا دھندلا سا اجالا پھیل رہا تھا۔وہ پگڈنڈیوں پر چلتا ہوا آگے جا کر رکا۔پھر ایک طرف مڑ کر گندم کے خوشوں کو ہٹاتا ہوا اندر کی طرف آگیا۔وہاں اس نے

لوٹے اور دھوتی کو اتار کر ایک طرف رکھا۔یہ روز کا معمول تھا۔وہ معمول کے مطابق مصروف ہوگیا۔تھوڑی دیر بعد ہی گندم کے خوشوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔وہ ادھر ادھر ہل رہے تھے۔وہاں دوسرے لوگ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ایسے وقت کھنکارنے سے راستہ بدل کر دوسری طرف جا کر بیٹھ جاتے تھے۔شمبھو نے ایسا کھنکارا جیسے گانے سے پہلے گلا صاف کر رہا ہو مگر وہ آنے والا راستہ نہیں بدل رہا تھا۔سیدھا اسی طرف آرہا تھا۔

وہ زور سے کھنکارتے ہوئے بولا۔"اے...!سنائی نہیں دیتا؟ادھر نہیں ادھر جاؤ...."

مصیبت بہری ہوتی ہے۔کبھی نہیں سنتی' دندناتی چلی آتی ہے۔وہ سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔اگرچہ اوس پڑ رہی تھی۔صبح کا اجالا دھندلا گیا تھا۔تاہم بہت قریب ہو کر شکار اور شکاری نے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ لیں۔

وہ مارے حیرت کے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔"تم...؟"

اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔اس نے بڑی سفاکی سے پوچھا۔"پارو کہاں ہے؟"

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔"کیا علی بھائی!...؟ ننگے سے پوچھتے ہو ڈوپٹے والی کہاں ہے؟ جرا ادھر منہ کرو مجھے دھونے اور پہننے دو۔"

محبوب نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔"جیسے اندر سے ننگے ہو ویسے باہر سے رہو۔ہمارے سوال کا جواب دو۔پارو کہاں ہے؟"

"یہ پارو کون ہے؟ جرور تمہاری کوئی سگی ہوگی۔اسے ڈھونڈنے اتنے سویرے ناگ پارا سے ادھر آئے ہو۔بات کیا ہے؟ کچھ سمجھاؤ گے تو سمجھوں گا۔ویسے ساری دیویوں کی سوگند لے لو۔میں پارو دیوی کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔"

اس نے ریوالور کو جھکا کر فائر کیا۔ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی مٹی اور غلاظت پر آئی۔بدبودار چھینٹے اڑتے ہوئے اس کے پیروں سے چپک گئے۔اس نے کہا۔"ہم پورے یقین کے ساتھ آئے ہیں۔پارو تمہارے پاس ہے۔انکار کرو گے۔باتیں بنا کر ٹالنا چاہو گے تو دوسری گولی تمہیں زخمی کرے گی۔تم اپنی ہی

غلاظت میں گر کر تڑپنے لگو گے۔"

وہ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔"ہم پارو کو حاصل کئے بغیر تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔اس طرح سے مارتے رہیں گے کہ تم خود موت کی بھیک مانگتے رہو گے۔"

محبوب کے تیور اور اس کے سفاک لہجے نے سمجھا دیا کہ دوسری گولی ضرور اس پر چلے گی۔اس نے بھولی ہوئی بات یاد کرنے کے انداز میں کہا۔"ارے ہاں پارو... تم اس پارو کو پوچھ رہے ہو۔ہاں۔وہ میرے پاس ہے۔بڑی پیاری بچی ہے۔ابھی ہم بات کرتے ہیں' پہلے دھونے اور پہننے تو دو۔تم نے تو میرے پاؤں بھی گندے کر دیئے۔"

وہ جھک کر لوٹا اٹھانا چاہتا تھا۔اس نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔"سیدھے کھڑے رہو۔پانی سے غلاظت صاف ہوتی ہے۔نیت صاف نہیں ہوتی۔جیسے ماں کے پیٹ سے آئے تھے ویسے ہی رہو۔"

وہ جھکا ہوا تھا۔سیدھا ہو کر بولا۔"بات کھل ہی گئی ہے تو سن لو۔میں نے اسے ایسی جگہ رکھا ہے، جہاں یمدوت (ملک الموت) بھی نہیں پہنچ سکے گا۔میں وہاں پہنچاؤں گا تو پہنچو گے۔میں مرجاؤں گا تو بولو تمہیں وہاں کون لے جائے گا؟"

محبوب اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔وہ بول رہا تھا۔"میں شمبھو نیتا ہی نہیں دادا کہلانے والا گنڈہ بھی ہوں۔یاد نہیں ہے کیسے کیسے پاپ کئے ہیں۔جب کسی کی ہتیا کرتا تھا تو یہ سمجھتا تھا کہ ایک دن کوئی مجھے نرگ میں پہنچا سکتا ہے۔موت سے کیا ڈرنا؟ ڈرو تب بھی نہ ڈرو تب بھی موت آتی ہے۔"

وہ ریوالور کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔"اور شائد آ گئی ہے۔ابھی میں ہٹ دھرمی کروں گا پارو کہاں ہے' یہ نہیں بتاؤں گا تو تم گولی مار کر چلے جاؤ گے۔"

اس نے طنزیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔"پر کہاں جاؤ گے؟ وہ کہاں ملے گی؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔"ابھی وہ عجت سے ہے۔کسی نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔کیونکہ میں اس کو سیاسی معاملے میں استعمال کرنے والا ہوں' مگر میں مرجاؤں گا تو

پھر کوئی معاملہ نہیں رہے گا۔میرا ایک کھاص نوکر ہے۔میں نے اس کو بول دیا ہے۔ میں مرجاؤں تو اسے باجاری بنا دینا۔"

محبوب اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔وہ دشمن اسے مجبور اور بے بس بنا رہا تھا۔ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔"ہی ہی ہی ہی۔کسی دن اسے ڈھونڈتے ہوئے کسی چکلے میں پہنچو گے تو وہ جرور ملے گی۔"

اس کا ریوالور والا ہاتھ نیچے ہو گیا۔شمبھو اپنی کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔"یہ جو آدمی کی بدھی ہے ناں...اس کے آگے سارے ہتھیار بے کار ہو جاتے ہیں۔دیکھو میں کھالی ہاتھ ہوں تمہارے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے۔مگر یہ ہاتھی کا دانت ہے۔ دکھانے کے لئے ہے، چلانے کے لئے نہیں ہے۔"

وہ سن رہا تھا۔اس کا منہ تک رہا تھا اور بڑی دور تک سوچ رہا تھا۔وہ طنزیہ انداز میں بولا۔"ہاں تو اب میں دھولوں اور پہن لوں؟"

وہ لوٹے کی طرف جھکا۔ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی لوٹے پر آ کر لگی۔

وہ پھر اچھل کر سیدھا ہو گیا۔سہم کر بولا۔"کیا تم مجھے مار ڈالنے کی بھول کرو گے؟"

اس نے کہا۔"اس میں شبہ نہیں ہے کہ تم نے ہمیں مجبور اور بے بس کر دیا ہے۔ ہم پارو کو ہر قیمت پر عزت آبرو سے لے جائیں گے۔اس کے لئے تمہیں زندہ رکھنا ہوگا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔"یہ ہوئی ناں سمجھداری والی بات۔آگے بولو....؟"

"آگے یہ کہ ہمارے نام کے ساتھ حضرت علیؓ کا نام ہے اور ہم علیؓ کی طرح مات کھانا نہیں جانتے۔اب یہاں سے گھوم جاؤ اور ہمیں اپنے گھر لے چلو۔باقی باتیں وہاں ہوں گی۔"

"اور کیا بات کرو گے؟ یہ دیکھ رہے ہو کہ مرنے کے لئے تیار ہوں مگر پارو کو واپس نہیں کروں گا اور وہ عجت سے تب تک میرے پاس رہے گی جب تک میں جندہ رہوں گا۔"

محبوب نے کہا۔"اس کے بعد بھی کہنے کے لئے ایک اہم بات رہ گئی ہے اور وہ گھ میں ہو گی۔بحث میں وقت ضائع نہ کرو۔فوراً یہاں سے چلو۔ورنہ ایک ٹانگ

میں گولی ماروں گا پھر کیا لنگڑے بن کر چلو گے؟"

"ٹھیک ہے چلتا ہوں۔ پہلے دھونے اور پہننے تو دو۔"

وہ سخت لہجے میں بولا "نہیں۔ آج تم نے ناگ پارا میں جو کمینگی دکھائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ساری زندگی ننگے رہو۔ تمہیں ایسی حالت میں دیکھ کر مجھے آسودگی مل رہی ہے۔"

وہ غصے سے بولا "بکواس مت کرو۔ میں گھر کے اندر بیوی بچوں کے سامنے ایسی حالت میں نہیں جاؤں گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ گولی مارو گے مجھے لنگڑا بناؤ گے تو ادھر میرے آدمی پارو کو گولی مار کر لنگڑی بنا دیں گے۔ تمہارا تو باپ بھی مجھے....."

وہ بولتا ہوا جھکا، لوٹے کو اٹھانا چاہتا تھا۔ ایک ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ اپنی ٹانگ کو دیکھنے لگا۔ گہرا زخم نہیں لگا تھا۔ گولی ایک ذرا سے گوشت کو ادھیڑتے ہوئے گزر گئی تھی۔

اسے امید نہیں تھی کہ پارو کے سلسلے میں اتنی ساری دھمکیاں سننے کے بعد وہ گولی چلائے گا۔ اس نے کہا "ہم نے کہا تھا ناں ہم علی ہیں۔ ہماری مردانگی اور خودداری کسی کے آگے نہیں جھکے گی۔ فوراً اٹھو اور اب لنگڑاتے ہوئے چلو۔"

وہ کراہتے ہوئے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتا ہوا اٹھ گیا۔ زخمی پاؤں کو زمین پر ٹیک کر کراہتے ہوئے بولا "تمہارے ساتھ ٹکرانے کا مجا آ رہا ہے۔ میں بھی تمہیں مجا چکھاؤں گا۔ ابھی تو تمہارا پلڑا بھاری ہے۔"

وہ لنگڑاتا ہوا اس کے آگے آگے چلتا ہوا پگڈنڈی پر آ گیا۔ وہاں رک کر بولا "بہت درد ہو رہا ہے۔ چلا نہیں جا رہا ہے۔"

محبوب نے کہا "بیٹھ جاؤ۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے چلو۔"

اس نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ کہنے لگا "تم نے مجھے گھائل کیا ہے۔ میری جان بھی لے سکتے ہو۔ کیا میں سمجھوں کہ وہ لڑکی تمہارے لئے جیادہ جروری نہیں ہے؟"

"وہ میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے۔ میری جان سے زیادہ ضروری ہے۔"

"تو پھر میری جوابی کاروائی کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہو؟ آج وہ بھی گھائل ہوگی وہ

بھی لنگڑا کر چلے گی۔"

"ہماری شرافت تمہاری سمجھ میں نہیں آئی اور تم نے ناگ پارا میں قیامت برپا کرادی۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد وہ ذرا سی لنگڑائے گی تو برداشت کرلیں گے۔ ہم تمہاری جان لیں گے۔ ادھر اس کی بھی جان جائے گی تو اسے بھی برداشت کر ہی لیں گے۔ جب مشکلیں حد سے گزر جاتی ہیں تو آسان ہوتی ہوئی سی لگتی ہیں۔"

وہ مکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گئے۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ بچے اور بیوی اٹھ گئے تھے۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھر کا مالک ولیس کا نیتا دروازہ کھول کر اندر آیا تو بیوی جوان بیٹی اور بیٹا سب ہی حیرانی سے چیخ پڑے۔ بچے منہ پھیر کر دوڑتے ہوئے کمروں میں چلے گئے۔ پتنی نے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "ایسے ہی اٹھ کر آ گئے؟ دھوتی کہاں ہے؟ کیا آپ کو شرم نہیں آ رہی؟"

ننگے نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ محبوب علی دروازے سے اندر آ گیا۔ اس کی گھر والی ریوالور کو دیکھتے ہی سہم گئی۔ وہ بولا "ہم دشمن نہیں تھے۔ تمہارے پتی نے دشمن بنایا ہے۔ اب جو کہتے ہیں اس پر فوراً عمل کرو۔ اپنی بیٹی اور بیٹے سے کہو مضبوط رسیاں لے کر آئیں۔"

وہ بولی "بچے آئیں گے۔ پہلے انہیں کپڑے پہننے دو۔"

پھر وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولی "کیسی بدبو آ رہی ہے۔ انہیں ایسی حالت میں کیوں لائے ہو؟"

"ہم دنیا والوں کو دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ اندر سے بھی ایسا ہی ننگا ہے۔ آج ہماری شادی ہونے والی تھی۔ اس نے دلہن کو اٹھوا لیا ہے۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہوگا۔ ہم اس کے ساتھ جیسا سلوک کر رہے ہیں، اسے تم سب دیکھتے رہو۔"

ایک کمرے سے اس کی جوان بیٹی باہر آئی۔ اس کے ہاتھوں میں رسیوں کا ایک بنڈل تھا۔ ماں نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "یہاں کیوں آئی ہو؟ باپ کو دیکھ رہی ہو شرم نہیں آتی؟"

وہ بولی "میں پتا جی کو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں تو اس کو دیکھ رہی ہوں۔ کیسا

گبرو جوان ہے۔تم نے کہا تھا میرے لئے ایسا ہی پتی لاؤ گی۔تم بہت جھوٹی ہو۔ جھوٹ بول کر مجھے بہلاتی رہتی ہو۔"

شمبھو نے اپنی پتنی سے کہا۔"جانتی ہو کہ یہ آدھی پاگل ہے۔اس سے بحث نہ کرو۔یہ جو کہہ رہا ہے وہ کرو۔مجھے اس سے جان چھڑانے دو۔"

محبوب نے حکم دیا۔"تم سب کمرے میں چلو اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھو۔"

وہ ایک کمرے میں آگئے۔محبوب نے کہا۔"فرش پر اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔جتنی جلدی میری باتوں پر عمل کرو گے اتنی جلدی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

وہ منہ کے بل لیٹتے ہوئے بولا۔"علی!تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔تم نے کہا تھا یہاں آکر جروری بات کرو گے۔"

"ہاں۔ابھی کروں گا۔تمہاری دھرم پتنی کتنی دیر کر رہی ہے۔اس سے کہو تمہارے ہاتھ پاؤں باندھے۔"

بیٹی نے کہا۔"میں باندھوں۔جب میں گرلز اسکاؤٹ میں تھی تو ریف ناٹ باندھنا سکھایا گیا تھا۔"

وہ بولا۔"شاباش!تم باندھو۔"

وہ ناک سکیڑ کر بولی۔"کیسے پاندھوں۔بدبو آرہی ہے؟"

"تمہارے باپ کا مال مسالہ ہے۔برداشت کرو۔جلدی باندھو۔دیر نہ کرو۔"

وہ بڑی لگن سے یوں باندھنے لگی جیسے کوئی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا ہو۔بیٹا دس برس کا تھا۔ماں کے پیچھے کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔علی نے جھک کر رسیوں کی گرہیں دیکھیں۔اس پگلی نے واقعی مضبوطی سے باندھا تھا۔وہ بولا۔"تم تو بہت کام کی لڑکی ہو۔چلو اپنی ماں کو بھی اسی طرح باندھو۔"

ماں نے کہا۔"رادھیکا!تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔"

وہ بولی۔"کیوں نہیں کروں گی؟جرور کروں گی۔"

اس نے محبوب کے پاس آکر اس کے بازو سے لگ کر کہا۔"تم ایسا پتی نہیں لائیں یہ آپ ہی آگیا۔میرا کنیا دان کرو۔میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔"

محبوب نے کہا۔"سنو شمبھو!ہم یہاں جو کرنے آئے ہیں،وہی تمہاری بیٹی کہہ

رہی ہے۔تم نے ہماری پارو کو رکھا ہے۔ہم تمہاری بیٹی کو رکھیں گے۔جو سلوک تم پارو سے کرو گے،وہی ہم اس کے ساتھ کریں گے۔جب پارو کو حویلی میں پہنچاؤ گے تو ہم رادھیکا کو یہاں بھیج دیں گے۔جیسا کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ ہوتا رہے گا۔"

اس کی پتنی نے فرش پر بیٹھ کر پتی کے سامنے جھک کر کہا۔"آپ سن رہے ہیں۔یہ ہماری بیٹی کو لے جائے گا۔آپ چپ کیوں ہیں؟یہ پارو کون ہے؟اسے یہاں لائیں اور اس کے حوالے کریں۔"

وہ بولا۔"میں اندھا اور بہرہ نہیں ہوں۔سب دیکھ رہا ہوں'سب سن رہا ہوں۔یہ جو کر رہا ہے' کرنے دو۔میں بعد میں جو کرنے والا ہوں وہ اسے بہت مہنگا پڑے گا۔"

محبوب نے کہا۔"اپنے پتی کے پاس لیٹ کر باتیں کرو۔یہ تمہیں سستا مہنگا سمجھاتا رہے گا۔"

اس نے کنپٹی پر ریوالور کی نال رکھی۔وہ اوندھے منہ لیٹ گئی۔بیٹی نے اسے بھی مضبوطی سے باندھ دیا۔پھر محبوب سے کہا۔"میرے جہیز کے لئے اتنے ساری سونے کے گہنے اور اتنے سارے روپے رکھے ہیں۔وہ لے آؤں؟"

ماں نے رونے کے انداز میں کہا۔"اری او جنم جلی!تو جل مرے...ابھی مر جائے۔وہ سارا سونا گہنے ہم نے بیٹے کے لئے رکھے ہیں۔جا مر جا...مگر گھر میں ڈاکا ڈال کر نہ جا۔"

محبوب نے کہا۔"ہم ڈاکو نہیں ہیں۔یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں لے جائیں گے۔رادھیکا کو پارو کے بدلے لے جا رہے ہیں۔تبادلہ ہوگا۔پارو ہمیں ملے گی تو بیٹی تمہیں واپس مل جائے گی۔"

شمبھو رسیوں سے بندھا فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ایک دشمن اس کی بیٹی کو لے جا رہا تھا۔یہ ایسی بات تھی کہ ماں باپ کو تڑپنا اور فریاد کرنا چاہئے تھا۔لیکن وہ ماں بھی اپنے پتی کی طرح بیٹی کو نظر انداز کر رہی تھی۔

رادھیکا ایک کمرے میں جا کر اپنا ضروری سامان بیگ میں رکھ کر لے آئی

تھی۔محبوب نے شمبھو کے پاس آ کر فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"تم نے دشمن کو نادان سمجھ کر خود کو رسیوں سے بندھوا لیا۔ہم ایسے نادان بچے بھی نہیں ہیں۔یہ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ یہ بیچاری بیٹی تم لوگوں کے لئے زیادہ اہم نہیں ہے۔اس کے غیر اہم ہونے کے پیچھے کیا راز ہیں ہم نہیں جانتے۔ فی الحال جاننا ضروری نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہولے ہولے ہنسنے لگا۔شمبھو نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟"

اس نے کہا۔"یہ ادلے کا بدلہ ہوگا کہ میری پارو تمہارے رحم و کرم پر رہے گی اور تمہاری بیٹی اپنی مرضی سے میرے ساتھ جا رہی ہے۔لیکن اس طرح ہمارے اور تمہارے درمیان طاقت کا توازن قائم نہیں رہے گا۔ہمارے جانے کے بعد تم ہم پر بھاری پڑو گے۔"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔"مگر ہم نہیں پڑنے دیں گے۔ہم تمہارے بیٹے کو بھی لے جا رہے ہیں۔"

وہ ماں باپ ایکدم سے تڑپ گئے۔ماں نے چیخ کر کہا۔"میرا بچہ.....!نہیں اسے نہ لے جاؤ۔یہ بڑی تپسیا، بڑی پوجا پاٹ کے بعد پیدا ہوا تھا۔یہ میرا ایک ہی راجکمار ہے۔اس کے بنا جی نہیں سکوں گی۔"

شمبھو کی حالت بھی قابل دید تھی۔وہ اوندھے منہ تھا۔پھڑپھڑاتا ہوا کسی طرح چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔محبوب کو دیکھ کر گڑگڑا رہا تھا۔"بھگوان کے لئے میرے بیٹے کو نہ لے جاؤ۔یہ میرے گھر کا ایک ہی اجالا ہے۔اس سے میرا کنبہ بڑھے گا۔میری پیڑھی کا نام چلے گا۔اسے نہ لے جاؤ۔میں تمہارے اللہ کا واسطہ تمہیں دیتا ہوں۔"

"اللہ کا واسطہ دے رہے ہو تو بھروسہ کرو۔تم پارو کو جتنی عزت اور آرام سے رکھو گے اتنا ہی تمہارا بیٹا آرام سے رہے گا۔اس کے بدن پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئے گی۔"

انہوں نے اپنے بیٹا کا نام بڑے چاؤ سے راجکمار رکھا تھا۔اس وقت وہ ایک

کونے میں بیٹھا رو رہا تھا۔رادھیکا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بہادر بچے روتے نہیں ہیں۔میں ہوں ناں.... جیسے یہاں میرے ساتھ کھیلتے تھے۔ وہاں میری سسرال میں بھی کھیلا کرو گے۔"

ماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔محبوب سے کہہ رہی تھی۔"میں بندھی ہوئی ہوں۔مجھے کھولو۔میں تمہارے پیروں سے لپٹ جاؤں گی۔اپنا سر پھوڑ لوں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔بیٹا آج ہی واپس آ سکتا ہے۔اپنے پتی سے کہو یہ آج ہی پارو کو میری حویلی میں پہنچا دے۔بلکہ ابھی دشمنی ختم ہو سکتی ہے۔پوچھو اپنے پتی سے..."

ممتا تڑپ رہی تھی۔وہ چیخ کر شمبھو سے بولی۔"چپ کیوں ہو؟اس آدمی کو دشمن کیوں بنا رہے ہو۔پارو کو ابھی یہاں لاؤ اور اس کے حوالے کرو۔پھر یہ ہمارے بیٹے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

وہ بولا۔"تم جانتی ہو'میں اپنے بیٹے کو جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔مگر یہ بہت بزدل ہے اسے بہادر مرد بنانا چاہتا ہوں۔اسے جانے دو۔میں وچن دیتا ہوں' کل پارو کو حویلی پہنچا کر اسے واپس لے آؤں گا۔"

اس نے پوچھا۔"کل شام تک کیوں؟پارو کو ابھی کیوں نہیں لا سکتے؟"

"کوئی بات ہے۔ابھی نہیں بتا سکتا۔"

محبوب نے کہا۔

"ابھی نہ بتاؤ۔مگر یہ سن لو پارو کے ساتھ زیادتی ہوئی یا اسے مار پیٹ کر زخمی کیا گیا ہوگا تو تمہارے بیٹے کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا۔"

وہ رادھیکا اور راجکمار کے پاس آ کر بولا۔

"ہم انہیں لے جا رہے ہیں۔ان کے اغوا کی رپورٹ درج کراؤ گے۔ہمارے خلاف قانونی کارروائی کرو گے یا تمہارے آدمی ہمیں نقصان پہنچانا چاہیں گے تو پھر بیٹا کبھی واپس نہیں ملے گا۔یہ جو بھی معاملات ہیں یہ صرف ہمارے تمہارے درمیان رہیں گے۔"

پھر اس نے راجکمار کے شانے کو تھپک کر کہا۔"جاؤ اپنے ماتا پتا کو پیار دو۔"

وہ دوڑتا ہوا ماں کے پاس آ کر لپٹ گیا۔ وہ رونے اور چیخنے لگی۔

''میرے ہاتھ بندھے ہیں۔ تجھے سینے سے کیسے لگاؤں؟ اپنے کلیجے سے کیسے چپکا لوں؟''

وہ اسے دیوانہ وار چوم رہی تھی۔ پھر وہ باپ کے پاس گیا۔ وہ جذبات کو قابو میں رکھنا جانتا تھا۔ بیٹے کو چوم کر حوصلہ دینے لگا۔ ''میں تمہیں کل واپس لے آؤں گا۔ رادھیکا کے ساتھ ہنستے کھیلتے رہو۔''

رادھیکا محبوب سے لگی کھڑی تھی۔ نہ وہ ماں باپ کے پاس گئی نہ انہوں نے اسے پیار کرنے کے لئے بلایا۔ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سوتیلی ہے یا پھر لے پالک ہے۔ اس کے جانے کی پروا نہیں ہے جاتی ہے تو جائے۔

محبوب ان دونوں کو کمرے سے لے کر نکلا۔ پھر اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ ماں بلک بلک کر رو رہی تھی۔

شمبھو نے غصے سے کہا۔ ''جب کہہ دیا ہے کہ بیٹے کو لے آؤں گا تو کیوں رو رہی ہو؟ میرا کوئی کھیال نہیں ہے؟ ننگا پڑا ہوں۔ بند کمرے میں بھی مکھیاں آ گئی ہیں۔ اس کتے نے میرا یہ حال کیا ہے۔ میں ایسا بدلہ لوں گا کہ ساری جندگانی یاد رکھے گا۔''

وہ فرش پر کھسکتا ہوا اس کے پاس آیا پھر اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے اس کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا پارو کو آج اس کے حوالے نہیں کر سکتے تھے؟''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ وہ بہت چالاک بنتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے سیرے سیرے کھیتوں میں پہنچ گیا؟ مجھ کو اکیلے میں گھیر کر مارنا چاہتا تھا۔''

پتی کی رسیاں کھل گئیں۔ وہ اس کی رسیاں کھولنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''جب یہ بات سمجھ میں آئی کہ میرے مرنے کے بعد اسے پارو کبھی نہیں ملے گی تو وہ یہاں آ کر رادھیکا کو لے گیا۔''

وہ بولی۔ ''اسے چھوڑو وہ ہمارے بیٹے کو لے گیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''چنتا کیوں کرتی ہو؟ بیٹا کل آ جائے گا۔''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں اسے جانے کیوں دیا؟ پارو کو ابھی کیوں نہیں لائے؟''

''اس لئے کہ ناگ پارا میں پھر ایک بار بلوا کرانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا ہے۔ محبوب علی بہت سیانا بنتا ہے۔ ابھی وہ بہت بڑی مصیبت یہاں سے لے گیا ہے۔''

''کون سی مصیبت لے گیا ہے؟''

وہ رسیوں سے آزاد ہو کر بولا۔ ''رادھیکا... ایک ہندو لڑکی اس کے ساتھ رہے گی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر وہ ماری جائے گی تو محبوب علی پر اس کی ہتیا کا الجام آئے گا۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ رادھیکا کی ہتیا ہو گی؟ کیا تم اس کی ہتیا کراؤ گے؟''

''تم صرف اپنے بیٹے کی بات کرو۔''

''نہیں۔ میں نے اپنی مرنے والی بہن کو وچن دیا تھا اس کی بیٹی کو...''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''بہن مر گئی۔ اسے بھی نرک میں جانے دو۔ پولیٹکس میں سب چلتا ہے۔''

وہ دروازے کے پاس آ کر اسے دھکے مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ سب کو معلوم ہوگا کہ وہ اسے ہمارے گھر سے جبردستی لے گیا تھا اور کہیں لے جا کر اس کی ہتیا کر دی ہے۔''

وہ دھکے مارتے ہوئے کہنے لگا۔

''ایک واردات یہ ہوئی کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کا ایک گھر جلایا اور اور ایک مسلمان لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔''

دروازہ اس کے دشمن ارادوں کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''دوسری واردات یہ ہو رہی ہے کہ ایک مسلمان ہمارے گھر سے ہماری بیٹی کو یعنی ایک ہندو لڑکی کو لے گیا ہے۔''

وہ دھکے مارتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ''رادھیکا یہ بیان دینے کے لئے جندہ نہیں رہے گی کہ اپنی مرجی سے گئی تھی۔''

دروازے کی چٹخنی کمزور تھی۔ اپنی جگہ سے اکھڑ گئی۔ اس کے دونوں پٹ ایک دھڑاکے سے کھل گئے۔

انتقام لینے کا نیا راستہ کھل گیا۔ پہلے پارو کی شامت آئی تھی اب ایسا ہی عذاب محبوب علی پر ہونے والا تھا۔

محبت پھول ہی پھول ہے پھول چنا کرتی ہے
کیا کریں رفتارِ زمانہ حشر بپا کرتی ہے

❁

خدا جانے قیامت کب آئے گی۔ مگر چھوٹی بڑی عارضی قیامتیں آتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی قیامت کا نمونہ، ناگ پارہ والوں نے دیکھا تھا۔ بنے میاں کو قتل کیا گیا تھا، سلطانی بیگم اور بلقیس کو آگ کے شعلوں میں زندہ جھونک دیا گیا تھا۔ اس بستی میں کبھی کسی نے اپنے ہی گھر کی چتا میں کسی کو جلتے نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو سب ہی چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگے۔

کیا بوڑھے، کیا بچے؟ سب ہی کے ذہن ماؤف ہو گئے تھے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ خواب خواب سا لگ رہا تھا اور سب ہی خوابیدہ خوابیدہ سے چل پھر رہے تھے۔ اس روز بستی کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا۔ کیونکہ دل جل رہے تھے، دماغ سُلگ رہے تھے۔ وہ اُوپر سے گم سم تھے، اندر چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ چیختی ہوئی شکایتیں تھیں، پکارتی ہوئی فریادیں تھیں، جنہیں صرف خدا ہی سن سکتا تھا۔

مرنے والے تو اُٹھ گئے تھے۔ جو زندہ تھی، اُسے بھی اُٹھا لیا گیا تھا۔ پارو کے لئے بھی ہائے ہائے ہو رہی تھی۔ مرنے والے چار کاندھوں پر جاتے ہیں، جوان لڑکی ایک ہی کاندھے پر لے جائی جا سکتی تھی۔ اُسے اغوا کرنے والے کئی تھے، مگر سازش ایک منصور نے ہی کی تھی۔

اس گھر میں صرف ہندوؤں نے ہی نہیں، ایک مسلمان نے بھی آگ لگائی تھی۔ وہ ڈھونگی پاگل بنا ہوا، بستی میں گھوم رہا تھا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس کے سامنے اُن جانے میں اُسے کوس رہے تھے اور بددعائیں دے رہے تھے۔

ایک جگہ چند مسلمان مشتعل ہو کر ہندوؤں کے خلاف بول رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان آ کر جلتی پر تیل چھڑک رہا تھا۔ اُن کا ہم نوا ہو کر چیخ رہا تھا۔ ''ہم ہندو بلوائیوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور وہ بلوائی ہماری بستی میں چھپے ہوئے ہیں۔''

کئی مسلمان اور ہندو ان مشتعل افراد کو سمجھا رہے تھے کہ اسے ہندو مسلم کا جھگڑا نہ کہا جائے۔ باہر سے کچھ لوگوں نے آ کر واردات کی ہے۔ لیکن سازش کرنے والوں نے بات یوں بگاڑی تھی کہ منگو لوہار کا کڑا جائے واردات پر پہنچا دیا تھا۔ یہ کھلا ثبوت پیش کیا گیا تھا کہ ناگ پارا کے ہندوؤں نے باہر سے بلوائیوں کو بلوایا تھا۔

بنواری لال، اُس کا بیٹا کشوری لال اور بے شمار امن پسند ہندو اور مسلمان، آگ کو بھڑکنے سے پہلے ٹھنڈا کر دینا چاہتے تھے۔ شر پسندوں کو بڑی محبت سے سمجھا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ شام کو پیپل کی چھیّاں میں پنچایت بیٹھے گی اور امن کمیٹی قائم کی جائے گی۔

کشوری لال نے منصور کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''ابے اے بکرے والے! تُو تو پاگل ہے۔ تُو کیا جانے، ہندو کیا ہوتے ہیں اور مسلمان کیا ہوتے ہیں؟ تُو ہمارے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ دشمنی اور مخالفت کیا ہوتی ہے؟''

وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''چھوڑو مجھے، میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ لوگ جو بول رہے ہیں، وہ میں بھی بول رہا ہوں۔''

بنواری لال نے کہا۔ ''ہم مسلمانوں کے خلاف نہیں بول رہے ہیں۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کہہ رہے ہیں۔ چلو، تم بھی کہو۔''

وہاں بستی کے بے شمار لوگ تھے۔ بنواری نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''میرے بزرگو! میرے بھائیو! سب مل کے کہو، ہندو مسلم بھائی بھائی......''

سب ہی ہاتھ اُٹھا کر نعرے لگانے لگے۔ ''ہندو مسلم بھائی بھائی...... بلوا کرنے والوں سے رب دہائی......رام دہائی......''

سلطانی بیگم کا پورا خاندان جل کر تباہ ہو گیا تھا۔ اُنہیں ہلاک کیا گیا تھا۔ ایک

جوان لڑکی کو اغوا کر کے مسلمانوں کی غیرت کو للکارا جا رہا تھا۔ اسی لئے وہاں چند مسلمان طیش میں آ گئے تھے۔ وہ ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے نہیں لگا رہے تھے۔ منصور بھی ان کے ساتھ خاموش کھڑا ہوا تھا۔

بنواری نے کہا۔ ''منصور! تم ان کے ساتھ نعرے لگا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ بھی امن اور شانتی کے نعرے لگاؤ۔''

اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اُس کا باپ مقبول بکرے والا وہاں موجود تھا۔ اُس نے کہا۔ ''ابے او پاگل کے بچے! اچھی بات کیوں نہیں سمجھتا؟ ناگ پارا میں جھگڑا لگانے والی باتیں تیری سمجھ میں کیسے آ رہی ہیں؟''

بنواری لال نے کہا۔ ''مقبول بھائی! یہ پاگل نہیں ہے۔ جھوٹ موٹ پاگل بن کر تماشا کر رہا ہے۔''

یہ حقیقت منصور کی ماں جانتی تھی کہ بیٹا پاگل نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھ کر بولی۔ ''یہ معصوم ہے، پاگل ہے۔ بنواری بھیا! تم اسے جھوٹا تماشائی بول کر اس کے باپ کو نہ بھڑکاؤ۔''

مقبول نے کہا۔ ''کوئی مجھے کیا بھڑکائے گا؟ کیا میں اندھا ہوں؟ صاف دیکھ رہا ہوں، یہ گدھے کا بچہ پاگل نہیں لگ رہا ہے۔ یہ بہت بڑا نوٹنکی ہے۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''کوئی پاگل یہ نہیں سمجھتا کہ کون ہندو ہے، کون مسلمان؟ کون دوست ہے اور کون دشمن؟ مگر یہ سمجھ رہا ہے۔''

ایک مسلمان نے منصور کے سامنے آ کر کہا۔ ''ارے ہاں، تم میرے پاس آ کر کہہ رہے تھے کہ ہندوؤں نے سلطانی خالہ کو زندہ جلا دیا ہے، پارو کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ ہمیں ہندوؤں سے انتقام لینا چاہئے۔''

منصور نے کہا۔ ''میں نے ایسا نہیں کہا تھا۔''

''پھر کیسا کہا تھا؟ جھوٹ مت بولو، منصور!''

''جھوٹا میں نہیں، تم ہو۔ میں کسی سلطانی خالہ اور پارو کو نہ جانتا ہوں، نہ پہچانتا ہوں۔''

ایک پنہارن نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے پنگھٹ پر کہا تھا کہ پارو کو

ڈھونڈنے شہر جاؤ گے۔''

ایک بوڑھی خاتون نے پوچھا۔''جب جانتے نہیں ہو، پہچانتے نہیں ہو تو کیسے ڈھونڈنے کی بات کر رہے تھے؟''

اُس نے پریشان ہو کر آس پاس کھڑی ہوئی عورتوں اور مردوں کو دیکھا۔ بھید کھلنے والا تھا۔ وہ فوراً ہی ایک طرف گھوم کر جانے لگا۔ اُس کے باپ نے پیچھے سے آ کر گردن دبوچ لی، پھر کہا۔''ابے جاتا کہاں ہے؟ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ جانوروں کو باڑے سے بھگا کر میرا نقصان پورا نہیں کر سکتا تھا، لات جوتے کھا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے پاگل بن کر اپنا بچاؤ کر رہا ہے اور مجھے اُلّو بنا رہا ہے۔''

ایک طرف سے باپ نے اُس کا بازو پکڑا، دوسری طرف سے بڑے بھائی منصور نے اُسے دبوچ لیا، پھر اُسے کھینچتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگے، جیسے بکرے کو گھسیٹ کر ذبح کرنے لے جا رہے ہوں۔ ماں نے دوڑ کر اُن کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔''چھوڑ دو میرے بچے کو........اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔''

مقبول نے اُسے ایک اُلٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ مار کھا کر ذرا پیچھے گئی۔ پھر زمین پر گر کر شوہر کے قدموں سے لپٹ گئی۔ بنواری نے کہا۔''بہن! بیٹے کو نہ بچاؤ۔ اسے سزا پانے دو۔ باپ اور بھائی اسے جان سے نہیں ماریں گے۔''

باپ نے کہا۔''ہاں، جان سے نہیں ماریں گے۔ مگر ہاتھ پاؤں توڑ کر رام پور کے لاری اڈے پر بٹھا دیں گے۔ یہ وہاں بھیک مانگ کر پیٹ بھرے گا۔ اس کمبخت سے ہمارا پیچھا تو چھوٹے گا۔ ہمارے جانور بھی محفوظ رہیں گے۔''

وہ قدموں سے لپٹی ہوئی چیخ رہی تھی۔''میرے بیٹے کو اپاہج بھکاری نہ بناؤ۔ اسے چھوڑ دو۔''

منظور ماں کے پاس آ کر اسے باپ کے قدموں سے الگ کرنے لگا۔ منصور پر گرفت کمزور ہوئی تو اس نے ایک جھٹکے سے بوڑھے باپ کو دھکا دے کر خود کو چھڑایا، پھر وہاں سے سرپٹ بھاگتا چلا گیا۔

باپ زمین پر گر کر تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ منظور اُسے سنبھالنے لگا۔ کچھ لوگ منصور کے پیچھے دوڑے تھے۔ آگے ایک مکان کی دیوار سے ایک سائیکل لگی کھڑی

تھی۔ منصور اُسے لیتا ہوا اس پر سوار ہو کر تیزی سے پیڈل مارتا چلا گیا۔ پیچھا کرنے والے سائیکل سے تیز نہیں دوڑ سکتے تھے، دھیرے دھیرے پیچھے رہ گئے۔

اِس بھگوڑے کی ماں کلثوم زمین سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دُور اُس سمت دیکھنے لگی، جدھر فرار ہونے والا بیٹا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ جب سے اُس نے سلطانی بیگم اور بلقیس کی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں، تب سے اُس کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا۔ بیٹے نے منگولوہار کا کڑا چُرایا تھا اور وہ کڑا جائے واردات پر پایا گیا تھا۔ ایک ماں کے اندر ایمان چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس خاندان کی تباہی اور بربادی کے پیچھے لاڈلے بیٹے کا ہاتھ ہے۔

ایسی سنگین واردات پر کلثوم کا دل رو رہا تھا۔ سلطانی بیگم اُس کی بہن جیسی سہیلی تھی۔ انسانیت، شرافت اور ایمان کہہ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کا محاسبہ کرے۔

اُس نے جلی ہوئی لاشیں اور منگو کے کڑے کو دیکھنے کے بعد بیٹے کو ایک طرف لے جا کر پوچھا تھا۔''جو کڑا تم یہاں سے چُرا کر شہر لے گئے تھے، وہ سلطانی آپا کے آنگن میں کیسے پہنچ گیا؟''

اُس نے جواب دیا۔''میں پاگل ہوں، مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔''

وہ جیسے اندر سے روتے ہوئے بولی۔''میرا دل کہہ رہا ہے، میری عقل کہہ رہی ہے، اتنی بڑی تباہی کے پیچھے تیرا ہاتھ ہے۔ اپنی ماں سے کچھ نہ چھپا۔ سچ سچ بتا دے، تُو کیا کرتا پھر رہا ہے''

''تمہارے دماغ میں جو بات آتی ہے، وہی سوچتی رہو، وہی سمجھتی رہو۔ میرا دماغ خراب نہ کرو۔ مجھے پاگل سمجھتی رہو۔ تمہارا احسان ہو گا۔''

وہ اُس سے پیچھا چھڑا کر چلا گیا تھا۔ اب حالات کہہ رہے تھے کہ بیٹا مکافاتِ عمل سے محفوظ نہیں رہے گا۔ آدمی جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ اب بیٹا کاٹنے والا ہے۔ سزا کے ابتدائی مرحلے میں فرار ہو کر وہ خود کو مجرم ثابت کر چکا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ منگولوہار، شہر سے واپس آئے گا تو یہی بیان دے گا کہ اُس کا کڑا چوری ہو گیا تھا اور گھاٹ پر نہانے والے کتنے ہی لوگ اس چوری کے گواہ تھے۔ وہ کیا کرے؟ ایک ماں کیا کرے؟ بیٹے پر ایک سنگین واردات کا الزام

لگنے والا تھا۔

کیا لوگوں کو بتا دے کہ بیٹے سے ایک غلطی ہوگئی ہے؟ ''لوگو! میرے بچے کو معاف کردو۔''

وہ کوئی معمولی غلطی نہیں تھی۔ اندیشہ محبوب علی کی طرف سے تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اسے حقیقت معلوم ہوگی تو وہ منصور کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔

ایسے ہی وقت محبوب علی کا ملازم، گھوڑا دوڑاتا ہوا بنواری لال کے پاس آیا۔ رات کے پچھلے پہر محبوب اپنی بگھی میں کوتوال کے ساتھ گیا تھا۔ ملازم کو حکم دیا کہ گھوڑا لے کر بگھی کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ بنواری نے اس سے پوچھا۔

''محبوب کہاں ہے؟ کیا پارو کا کچھ پتہ چلا؟''

اُس نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''آپ ذرا اُدھر چلیں، ضروری بات ہے۔''

وہ ملازم کے ساتھ چلتا ہوا لوگوں کی بھیڑ سے دُور آکر بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''مالک! کوتوال کو تھانے کے پاس اُتارنے کے بعد شمبھو دادا کے گھر کی طرف گئے تھے۔ مجھے اس کے گھر سے بہت دُور کھیتوں کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ بگھی بھی وہیں چھوڑ دی تھی، خود پیدل گئے تھے۔

''کیا وہ شمبھو سے ملنے گیا تھا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ بڑا سمے گزرنے کے بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک جوان لڑکی اور آٹھ دس برس کا ایک لڑکا تھا۔ اُنہیں بگھی میں بٹھا کر حویلی میں گئے ہیں۔ آپ کو اور کشوری بابو کو فوراً حویلی میں بلایا ہے۔''

''وہ جوان لڑکی اور لڑکا کون ہیں؟ وہ تو پارو کو ڈھونڈنے گیا تھا؟''

''میں نہیں جانتا، وہ کون ہیں؟ آپ سے کہا ہے، ابھی یہ بات کسی کو نہ بتائیں۔''

بنواری لال نے بیٹے سے کہا۔ ''کشوری! اپنی سائیکل مجھے دو اور کسی کی سائیکل لے کر میرے ساتھ آؤ۔''

بستی کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ محبوب، کوتوال کے ساتھ پارو کی تلاش

میں گیا ہے۔ ایک بزرگ خاتون نے پوچھا۔ ''محبوب کہاں ہے؟''

کتنے ہی لوگ پوچھنے لگے، کیا پارو مل گئی ہے؟ بنواری نے کہا۔ ''بھگوان نے چاہا تو ضرور ملے گی۔ ابھی واپس آکر اس کے بارے میں کچھ بتا سکوں گا۔''

وہ سائیکل چلاتا ہوا کشوری کے ساتھ حویلی میں پہنچ گیا۔ محبوب نے بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ وہاں ایک جوان لڑکی، ایک کم سن لڑکے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ بنواری نے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

محبوب نے کہا۔ ''یہ شمبھو دادا کی بیٹی رادھیکا ہے اور یہ اس کا بیٹا راج کمار ہے۔''

''انہیں یہاں کیوں لائے ہو؟''

''اس دشمن نے ہماری پارو کو اغوا کیا ہے، اسے میرے حوالے کرے گا تو میں انہیں واپس کروں گا۔''

رادھیکا نے کہا۔ ''میں واپس نہیں جاؤں گی۔ کتنی بار کہہ چکی ہوں، تمہاری دُلہن بن کر رہوں گی۔''

بنواری اور کشوری نے سوالیہ نظروں سے محبوب کو دیکھا۔ اُس نے کہا۔ ''یہ نیم پاگل ہے۔''

بنواری نے کہا۔ ''وہ بدمعاش ہے۔ اس نے ایک مسلمان لڑکی کو اُٹھوالیا۔ تم تو بدمعاش نہیں ہو، ان بچوں کو اُٹھا کر کیوں لائے ہو؟''

وہ بولی۔ ''اُٹھا کر نہیں لائے ہیں۔ اپنی مرضی سے آئی ہوں۔''

بنواری نے رادھیکا کو دیکھا، پھر کہا۔ ''یہ نہیں سمجھتی، تمہیں سمجھنا چاہئے۔ اس بدمعاش لیڈر کی پہنچ بہت دُور تک ہے۔ یہ ثابت نہیں ہونے دے گا کہ اُس نے ناگ پارا میں واردات کرائی ہے اور ایک مسلمان لڑکی کو اُٹھا لایا ہے۔''

کشوری نے کہا۔ ''بابو جی کی بات کو سمجھو۔ اس کے دونوں بچے یہاں ہیں۔ یہ کھلا ثبوت ہے کہ تم اُنہیں دھونس دھمکی سے لائے ہو۔ تمہارا جرم ثابت ہو رہا ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''میں مجبور تھا، اُنہیں کہیں لے جا کر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے یہاں لاتے ہی بابو جی کو بلایا ہے۔''

بنواری، رادھیکا کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''یہ الزام نہیں آنا چاہئے کہ ایک ہندو لڑکی، مسلمان کے گھر میں ہے۔ کشوری! ابھی ان دونوں کو ہمارے گھر لے جاؤ۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا، تم کچھ نہیں جانتے۔ بابو جی آ کر ہر سوال کا جواب دیں گے۔''

محبوب نے کہا۔ ''رادھیکا! تم اپنے بھائی کو لے کر ان کے ساتھ جاؤ۔ وہاں آرام سے رہو گی۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔ میں تمہاری پتنی ہوں۔ جنم جنم تک ساتھ رہوں گی۔''

محبوب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ میری بات مانتی ہو۔ تم نے میری بات مان کر اپنے ماں باپ کو رسیوں سے باندھا تھا، میری بات مان کر اپنے جہیز کے سونے کے زیورات چھوڑ کر آئی ہو۔ اب پھر میری بات مانو اور بابو جی کے گھر جاؤ۔ وہاں ہندو پریوار ہے، تمہیں بابو جی سے محبت ملے گی۔''

''میں باپ کا گھر چھوڑ کر آئی ہوں، مجھے پتی کا پیار چاہئے۔''

بنواری اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا، پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ''جب تک لگن منڈپ میں پنڈت جی وِواہ نہیں کرائیں گے اور جب تک محبوب کو ور مالا نہیں پہناؤ گی، اُس کی پتنی نہیں بن پاؤ گی۔''

کشوری نے کہا۔ ''ہم تمہیں محبوب کی دھرم پتنی بنانے کے لئے وہاں لے جا رہے ہیں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''میں تو دُلہن بننے کے سپنے دیکھتی رہتی ہوں۔ مگر ماں جی اور پتا جی میری شادی ہی نہیں کراتے تھے۔ تم سچ مچ کراؤ گے ناں؟''

بنواری نے کہا۔ ''ہاں، تم میرے بیٹے کے ساتھ جاؤ۔ وہاں شادی کی تیاریاں کرنی ہے۔ دُلہن کے جوڑے سلوانے ہیں۔''

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھاتے ہوئے بولی۔ ''آؤ راجو! ہم شادی کرنے جائیں گے۔''

پھر اُس نے محبوب سے کہا۔ ''میں جا رہی ہوں، تم جلدی سے برات لے کر آ جانا۔''

وہ ذہنی مریضہ تھی اور ذہین بھی تھی۔ صرف شادی اور ازدواجی زندگی گزارنے کے معاملے میں ابنارمل ہو جاتی تھی۔ وہ بھائی کو لے کر کشوری کے ساتھ چلی گئی۔

بنواری نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ شمبھو نے ہی پارو کو اُٹھوایا ہے؟''

''میں نے اور آپ نے کوتوال کو بہت بڑی رقم کا لالچ دیا تھا۔ پھر میں نے اُسے پیشگی پانچ ہزار روپے دیئے تو اُس نے سچ اُگل دیا کہ یہ ساری واردات شمبھو نے کرائی ہے۔ پارو کو یقیناً اُسی کے پاس پہنچایا گیا ہوگا۔''

''تم نے پارو کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟ وہ خیر خیریت سے، عزت آبرو سے ہے؟''

''ہاں......وہ کہہ رہا تھا کہ پارو کو اب تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔''

''وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ پتہ نہیں، اس بے چاری پر کیا گزر رہی ہوگی؟''

محبوب نے کہا۔ ''بیٹا اُس کی جان ہے۔ اگر پارو کو کچھ ہوگا تو میں اُس کے بیٹے کو واپس نہیں کروں گا۔''

''کوئی بات قانون کے خلاف نہ سوچو، نہ بولو، نہ کرو۔ انہیں واپس نہیں کرو گے تو مجرم بن جاؤ گے۔ ان دونوں کو کہیں چھپا کر نہیں رکھ سکو گے۔ پولیس والے آ کر انہیں لے جائیں گے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میں کیا کروں؟ پارو کو واپس لانے کے لئے جو راستہ سجھائی دے گا، اُس پر چل پڑوں گا۔''

''یہ بات سوچنے کی ہے کہ بیٹا اُس کی جان ہے تو اُس نے تمہارے ساتھ اُسے جانے کیوں دیا؟ اسی وقت پارو کو تمہارے حوالے کیوں نہیں کیا؟''

''وہ کہہ رہا تھا، کل پارو سے بچوں کا تبادلہ ہوگا۔''

''کل کیوں ہوگا؟ اس نے آج تبادلہ کیوں نہیں کیا؟ میری عقل کہتی ہے، وہ آج اور کل کے بیچ کچھ ایسا کرنا چاہتا ہے کہ پارو کو واپس نہ کرنا پڑے اور اس کے

بچے اسے واپس مل جائیں۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، اُسے گولی مار دوں گا۔"

"مجرمانہ ذہن رکھنے والے مارنے مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ شانتی اور شرافت سے رہنے والوں کی عقل سے سوچو اور بولو۔ پھر یہ کہ صرف بیٹے کی بات کیوں کر رہے ہو؟ کیا رادھیکا کو واپس نہیں کرو گے؟"

"دونوں کو واپس کروں گا، مگر یہ بات میں سمجھ رہا ہوں کہ اسے اور اس کی پتنی کو بیٹی کی پروا نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے، وہ ان کی سگی اولاد نہیں ہے۔ شاید لے پالک ہے اور رادھیکا ان پر کسی طرح کا بوجھ ہے۔"

"ہونے دو۔ رادھیکا ہمارا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے ابھی شمبھو سے جا کر ملنا ہوگا۔ ان بچوں سے پارو کا تبادلہ ابھی ہونا چاہیے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔"بابو جی! پارو آج آ جائے گی تو سر سے پہاڑ اُتر جائے گا۔ جب میں اکیلا رہتا ہوں، چپ رہتا ہوں تو وہ میرے اندر چیخنے لگتی ہے۔ مجھے پکارتی رہتی ہے، بلاتی رہتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہوگا؟"

"چنتا نہ کرو۔ اس معاملے کو آج ہی نمٹانا ہوگا۔ نہیں تو تم بھی قانون کی پکڑ میں آ جاؤ گے۔"

"کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

"ہاں۔ تمہیں ساتھ رہنا چاہیے۔"

وہ دونوں حویلی سے باہر آئے، پھر بگھی میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔

❂✪❂

شمبھو دادا نے محبوب کی ہونے والی دُلہن کو اغوا کرایا تھا۔ بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ مگر محبوب کی فوری جوابی کارروائی نے اُس کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دشمن اپنی دُلہن کے بدلے اُس کے اکلوتے بیٹے کو لے جائے گا۔

اُس نے وقتی طور پر اپنے بیٹے کو اُس کے ساتھ جانے دیا۔ جب کہ اُس کی جدائی گوارا نہیں تھی۔ مگر سیاسی جوڑ توڑ بھی لازمی تھا۔ وہ محبوب پر دوسرا زبردست

حملہ کر کے بڑی آسانی سے بیٹے کو واپس لا سکتا تھا۔

وہ یہ سوچ کر غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ محبوب نے بڑی بے عزتی کی تھی۔ اُسے کھیت سے ننگا گھر تک لایا تھا۔ بیوی بچوں کے سامنے شرم سے ڈوب مرنے والا تماشا بنا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں قسمیں کھا رہا تھا کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے گا۔ اسے مار ڈالنے سے پہلے ننگا ضرور کرے گا۔

وہ کچھ کھائے پیئے بغیر صبح ہی سے پارٹی کے دفتر میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے چھٹے ہوئے بدمعاشوں اور قاتلوں کو طلب کیا تھا۔ جب وہ حاضر ہو گئے تو ان میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔"گپت! کل جس چھوکری کو اُٹھا کر لائے تھے، اُس کے یار نے مجھے بڑی چوٹ دی ہے۔ وہ چھوکری کے بدلے میری بیٹی اور بیٹے کو لے گیا ہے۔"

گپت نے حیرانی سے کہا۔"دادا! اُس کی ہمت کیسے ہوئی؟ مجھے بتاؤ، وہ کہاں گیا ہوگا؟ میں بچوں کو واپس لاؤں گا۔ پھر اُس کا سر کاٹ کے تمہارے آگے پھینک دوں گا۔"

وہ بولا۔"اُس نے دھمکی دی ہے کہ میں اس معاملے کو پولیس کیس نہ بناؤں۔ اگر قانونی کارروائی کروں گا تو بیٹا مجھے واپس نہیں ملے گا۔ وہ میرے بچوں کو ناگ پارا میں کہیں نہیں چھپائے گا۔ اس کو کہیں آس پاس کے گاؤں کھیڑوں اور جنگلوں میں ڈھونڈو۔"

پھر وہ سوچ کر بولا۔"ناگ پارا سے چار میل کی دُوری پر اُس کی دھان مل ہے۔ پہلے وہاں جاؤ۔"

گپت نے اُٹھتے ہوئے کہا۔"میں ابھی جا رہا ہوں۔"

"رُکو........ پہلے پوری بات سنو۔ محبوب کی ہتیا نہیں کرنی ہے، اس کے ساتھ جو میری بیٹی ہے، اُس کو ختم کر دو۔"

گپت نے شدید حیرانی سے پوچھا۔"کیا کہہ رہے ہو، دادا؟ کیا میں آپ کی بیٹی کی ہتیا کروں؟"

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا، پھر بولا۔"جو بات میں تم کو بتا رہا ہوں، کسی سے نہ

بولنا۔ وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ اُس کی ہتیا کرو گے تو اس مسلمان پر الزام آئے گا کہ وہ میرے گھر سے ہندو لڑکی کو اُٹھا کر لے گیا تھا، پھر اس کی ہتیا کر دی۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "سمجھ گیا، دادا! میں بس آپ کے بیٹے کو واپس لاؤں گا۔"

"اُسے کسی طرح جلد سے جلد لے آؤ۔ پھر جو مانگو گے، وہ دوں گا۔"

وہ سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی آنکھوں کے سامنے بیٹا دکھائی دینے لگا۔ وہ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ بائیس برس تک انتظار کرنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، اس لئے وہ جان کے ساتھ لگا رہتا تھا۔

شمبھو نے ایک بدمعاش سے نیتا بننے کے لئے بڑی محنت کی تھی، بڑی ہیرا پھیری کی تھی۔ پورے دیس کا نہ سہی، صرف اتر پردیش کا نیتا بننے کے لئے جی جان سے کوششیں کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی ٹارگٹ تک پہنچنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے انکار نہیں کرتا تھا۔

اُس نے پہلی بار جان سے زیادہ عزیز بیٹے کو داؤ پر لگایا تھا۔ اُس کی پلاننگ کے مطابق رادھیکا ایک مسلمان کے گھر میں ماری جائے گی تو کانگریس پارٹی کے تمام بڑے نیتا اُس کے گھر دوڑے چلے آئیں گے، اُسے مان دیں گے، اُس کا عہدہ بڑھائیں گے۔ اور جب دیس آزاد ہو گا تو اُسے کسی شعبے کی وزارت ضرور دیں گے۔

وہ سامنے دیوار کو تک رہا تھا اور بڑی دُور تک سوچ رہا تھا۔ پھر آہٹ سن کر چونک گیا۔ منصور دروازہ کھول کر ہانپتا ہوا اندر آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کتے کی طرح کیوں ہانپ رہے ہو؟ کون دوڑا رہا ہے تمہیں؟"

وہ بکھری ہوئی سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔ "سب کو معلوم ہو گیا ہے، میں پاگل نہیں ہوں۔ بستی کے لوگ مجھے دوڑا رہے تھے۔ میرا باپ تو میری جان کا دشمن ہے۔ وہ مجھے مار ہی ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ سمجھ لو کہ گھر سے ہی نہیں، ناگ پارا سے نکال دیا گیا ہوں۔"

"بیٹھو۔ ناگ پارا کیا اُن کے باپ کی جاگیر ہے کہ تمہیں نکال دیں گے؟ میں

تمہارے باپ کو سمجھاؤں گا۔ وہ تم کو معاف کر دے گا۔"

"میں جب تک پچاس بکروں کے کم از کم پندرہ سو روپے نہیں دوں گا، وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ محبوب اور اُس کے پہلوانوں نے مجھے زبردستی شراب پلائی تھی اور باڑے کا گیٹ کھول دیا تھا۔ پچاس بکرے بھاگ گئے تھے۔ میں جب تک یہ ہرجانہ نہیں دوں گا، وہ مجھے گھر میں قدم رکھنے نہیں دے گا۔"

"تم میرا کام کرتے رہو گے تو میں اسے پندرہ سو دوں گا۔"

"اسی لئے آیا ہوں۔ مجھے روزی روٹی سے لگا دو۔ کہیں سر چھپانے کی جگہ دو۔ میں ناگ پارا واپس نہیں جاؤں گا۔"

شمبھو اُسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہوں۔ تم آگے بھی میرے بہت کام آؤ گے۔ تمہارے لئے کچھ کرنا ہو گا۔"

وہ میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پارو کہاں ہے؟ وہ آپ کے پاس میری امانت ہے۔ میں ابھی اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ محبوب علی کو تصور میں دیکھ کر ناگواری سے بولا۔ "وہ تمہارا باپ، محبوب علی اُسے ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔ پتہ ہے، اُس کتے نے کیا کِیا ہے؟"

منصور نے پوچھا۔ "کیا کِیا ہے؟"

"وہ پارو کے بدلے میری بیٹی اور بیٹے کو اُٹھا کر لے گیا ہے۔"

وہ کرسی پر سیدھا بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا بول رہے ہو، دادا؟........وہ شیر کے منہ سے دانت نکال کر لے گیا ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو آپ اس کے سامنے کمزور کیسے پڑ گئے؟"

شمبھو نے ہچکچاتے ہوئے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سوچا، کیا جواب دے؟ منصور یا کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اتنے بڑے بدمعاش کو، دیس کے نیتا اور آئندہ دیس کے ہونے والے وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا وزیر کو وہ کھیتوں سے گھر تک ننگا لایا تھا۔

منصور نے پوچھا۔ "کیا بات ہے دادا؟"

وہ بولا۔ "کیا بتاؤں؟ وہ اچانک ہی ریوالور لے کر میرے گھر میں گھس آیا تھا۔

میں خالی ہاتھ تھا۔ میرے بیوی بچے سہم گئے تھے۔ وہ پارو کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں اُس کے حوالے کیسے کر دیتا؟ وہ تو تمہاری امانت ہے۔''

منصور نے خوش ہو کر کہا۔''دادا! آپ تو زبان کے دھنی ہیں۔ پھر کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا؟ وہ ریوالور چلانے کی دھمکی دے کر میری جوان بیٹی اور دس برس کے بیٹے کو زبردستی لے گیا ہے۔''

''اتنی بڑی بات ہو گئی ہے اور آپ یہاں خاموش بیٹھے ہیں؟''

''میں چپ نہیں بیٹھا ہوں، میرے چھٹے ہوئے بدمعاش اور قاتل اُسے ڈھونڈنے گئے ہیں۔ بہت جلد محبوب کی لاش گرا کر میرے بچوں کو زندہ سلامت یہاں لائیں گے۔''

''محبوب علی کا یہی انجام ہونا چاہئے۔ وہ ضرور حرام موت مرے گا۔ میری پارو کہاں ہے؟ اس سے ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔''

''کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ پارو کیسی مصیبت بنی ہوئی ہے؟........وہ میرے بچوں کو لے گیا ہے۔ میں نے اُسے ایسی جگہ چھپایا ہے، جہاں میری مرجی کے بِنا کوئی نہیں پہنچ پائے گا۔ ابھی وہاں تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔''

''مگر میں تو آپ کا آدمی ہوں اور پارو میری چیز ہے۔ میں وہاں جاؤں گا تو اچھا ہے۔ اس کے ساتھ چھپ کر رہوں گا۔ شاید وہ مجھے دیکھ کر اپنے بہت سارے دُکھ بھول جائے گی۔''

''تم یہاں آئے ہو تو وہاں بھی جاؤ گے۔ اُس سے جرور ملو گے۔ مگر ابھی صبر کرو۔ میرے بچوں کو واپس آنے دو۔ محبوب علی کو کھتم ہونے دو۔ پھر اپنی لگائی کے پاس جا کر رنگ رلیاں مناتے رہنا۔''

وہ ذرا چپ ہوا، پھر ایک دم چونک کر بولا۔''کیا اُس کے پیٹ میں تیرا بچہ ہے؟''

منصور نے پوچھا۔''کس کے پیٹ میں؟''

''تیری لگائی کی بات کر رہا ہوں۔''

منصور نے گھور کر اُسے دیکھا، پھر پوچھا۔''کیا آپ نے اُسے ہاتھ لگایا تھا؟''

''میں نے اُسے دُور سے دیکھا ہے۔ جس بوڑھی عورت کے پاس اُسے رکھا ہے، وہ بڑھیا کہہ رہی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔''

منصور نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔''ہاں، اُس ہونے والے بچے کا باپ میں ہوں۔''

شمبھو نے ہنستے ہوئے کہا۔''بہت جم کے کھلواڑ کیا ہے۔ ایک کنواری پر ماں کا ٹھپّا لگا دیا۔ محبوب کو اپنا جھوٹا کھلا رہا تھا۔ اُسے معلوم ہوگا تو وہ نہ کچھ سوچے گا نہ سمجھے گا، تجھے ٹھائیں سے گولی مار دے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔''دادا! اُسے سب معلوم ہے۔''

اُس نے چونک کر پوچھا۔''کیا معلوم ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ اس کی ہونے والی دُلہن کنواری نہیں ہے؟''

''ہاں۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ اُس پر ٹھپّا لگانے والا میں ہی ہوں۔''

''تعجب ہے۔ اُسے اتنی بڑی بات معلوم ہے اور اُس نے تجھے زندہ چھوڑ دیا؟''

اس بات پر وہ ہنسنا بھول گیا۔ بڑی بے بسی سے بولا۔''ہاں۔ زندہ تو چھوڑ دیا ہے، مگر تھوڑا تھوڑا کر کے مارتا رہتا ہے۔ دارُو کی پوری بوتل میرے پیٹ میں ڈال دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے، اُس کے پہلوان مجھے پیٹ دیتے ہیں۔ وہ پارو کی بدنامی نہیں چاہتا، اس لئے کھل کر مجھ سے انتقام نہیں لیتا ہے۔ میں تو اُس کے مرنے کی دُعائیں مانگتا رہتا ہوں۔ اچھا ہے، آج تمہارے ہتیارے اُسے ختم ہی کر دیں۔''

شمبھو نے کہا۔''ابھی تو وہ تم دونوں کی لگائی ہے۔ ماں قسم، بڑی سُندر ہے۔ اُسے دیکھتے ہی دل آ گیا تھا۔ مگر ہم ماں جگدمبے کے پجاری ہیں۔ کسی گربھ وتی کو بری نیت سے ہاتھ نہیں لگاتے۔ میں اس سے دُور تو ہو گیا ہوں، مگر دل بہت مچل رہا ہے۔''

''دادا! اُس کے لئے ایسا نہ بولو۔ وہ میری چیز ہے۔''

''وہ محبوب علی کی بھی چیز ہے۔ میں نے تم دونوں کے بیچ سے اُسے اُڑا لیا ہے۔ اب تو اُس پر میرا بھی ادھیکار ہے۔''

''مگر آپ تو ماں جگدمبے کے پجاری ہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے، اُسے ہاتھ نہیں

لگائیں گے۔"

"ہاں۔ ابھی دو ماہ کا حمل ہے۔ سات ماہ صبر کروں گا، اس کے بعد موج مستی کر سکوں گا۔"

"دیکھیں دادا! وہ میری چیز ہے۔ اُس پر نیت خراب نہ کریں۔"

"وہ تمہاری چیز کیسے ہے؟ اُسے تو محبوب لے جانے والا تھا۔ جب اپنی سیج پر اُسے لے جاتا تو تم اُس کا کیا بگاڑ لیتے؟ اب میرا کیا بگاڑ لو گے؟"

وہ بدمعاش دادا بڑی بڑی کھا جانے والی آنکھوں سے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سہم کر اپنی کرسی پر سست پڑ گیا تھا۔ سامنے چیر پھاڑ کر کھا جانے والا شیر تھا۔ وہ مجبور ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے، مگر ایک بار......"

اُس نے پوچھا۔ "کیا ایک بار......؟"

وہ بولا۔ "میں نے اُسے ایک ہی بار پایا ہے۔ میری پیاس نہیں بجھی اور بڑھ گئی ہے۔ اس لئے ایک بار مجھے اُس کے پاس جانے دو۔"

"جب ہم کسی گربھ وتی کو ہاتھ نہیں لگاتے تو دوسرے کو بھی نہیں لگانے دیں گے۔ اُس کو بھول جاؤ۔ آٹھ دس مہینے انتجار کرو۔ جب میرا دل بھر جائے تو تم اُسے لے جانا۔"

شکار پر پہلا حق شکاری کا ہوتا ہے۔ شیر اپنے شکار کو اچھی طرح نوچ کھسوٹ کر پیٹ بھر لیتا ہے، تب دوسرے جانور بچے ہوئے راتب پر منہ مارتے ہیں۔ منصور منہ سے کچھ نہ بول سکا۔ دل ہی دل میں اُسے گالیاں دینے لگا۔

ایسے وقت ایک ملازم دروازہ کھول کر جیسے دوڑتا ہوا آیا، پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مالک! محبوب علی آیا ہے۔"

شمبھو کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا تھا کہ اُس کے ہتیارے اُسے ڈھونڈنے گئے ہیں، جلد ہی بہت اچھی خبر لائیں گے۔ ایسی بری خبر کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے فوراً ہی میز کی دراز کھول کر وہاں رکھے ہوئے پستول کو دیکھا، پھر پوچھا۔ "کیا وہ میرے بچوں کو لایا ہے؟"

"نہیں مالک! پرچون کا تھوک بیوپاری بنواری لال اُس کے ساتھ ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی بنواری لال، دروازہ کھول کر اندر آیا۔ محبوب علی اُس کے پیچھے تھا۔ شمبھو اُسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ محبوب کی نظریں بھی جیسے کھا جانے والی تھیں۔ منصور فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کر شمبھو کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں میز کے دوسری طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

یہ سب کچھ خاموشی سے ہو رہا تھا۔ کوئی کسی سے بول نہیں رہا تھا۔ پھر شمبھو نے دراز سے پستول نکال کر محبوب کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "بنواری لال! تم اس کے ساتھ نہ ہوتے تو میں اسے دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔"

بنواری نے کہا۔ "پستول ہٹاؤ۔ بھول سے بھی گولی چل سکتی ہے۔ ہم دشمنی کرنے نہیں آئے ہیں۔ دوستی اور محبت سے معاملہ نمٹائیں گے۔"

وہ محبوب کو گھورتے ہوئے بولا۔ "میرے بچے کہاں ہیں؟"

محبوب نے پوچھا۔ "میری پارو کہاں ہے؟"

"بکواس مت کرو، پہلے میری بات کا جواب دو۔ نہیں تو تین تک گنتے ہی گولی مار دوں گا۔"

پھر اس نے گنتی شروع کی۔ "ایک......"

بنواری نے پوچھا۔ "کیا اسے جان سے مارنے کے بعد تمہیں بچے مل جائیں گے؟"

"میں اسے جان سے نہیں ماروں گا۔ اس نے اپنے ریوالور سے مجھے گھائل کیا تھا، میں بھی اس کو گھائل کروں گا۔ دو......"

وہ دو کے بعد تین کہہ کر اُسے زخمی کرنے والا تھا، محبوب نے حقارت سے کہا۔ "گدھے ہو۔ ذرا سر جھکا کر میز کے نیچے دیکھو، تم میرے نشانے پر ہو۔"

شمبھو نے گھبرا کر سر جھکاتے ہوئے دیکھا۔ واقعی میز کے نیچے ریوالور کا رُخ اُس کی طرف تھا۔ گولی سیدھی اُس کے پیٹ میں گھسنے والی تھی۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگا۔

اس نے کہا۔ "بدمعاشوں کے دادا! گولی دونوں طرف سے چلے گی، مگر عقل ذرا ساتھ دے تو صرف ایک طرف سے چل سکتی ہے...... جانتے ہو، کیسے؟"

یہ کہتے ہی وہ اچانک کرسی سے پھسل کر میز کے نیچے گھس گیا۔ گرجتے ہوئے بولا۔ ”خبردار! اپنی جگہ سے ہلو گے تو مرو گے۔“

وہ کرسی سے اُٹھنا چاہتا تھا، اس سے پہلے ہی محبوب نے ریوالور کی نال اُس کی ناف کے نیچے گھسا دی، پھر کہا۔ ”زندہ رہنا چاہتے ہو تو پستول بابو جی کو دے دو۔“

اُس کے دیدے پھیل گئے۔ ”آہ! گولی کہاں لگنے والی تھی؟ وہ مسلمان تو اُسے ننگا کرنے پر تُل گیا تھا۔ اُسے ہیجڑا بنا کر نرک میں پہنچانے والا تھا۔ اُس نے فوراً ہی بنواری کو پستول دے دیا۔

وہ پستول لے کر بولا۔ ”بیٹے! گولی نہ چلانا۔ پستول مجھے مل گیا ہے۔ وہاں سے نکل آؤ۔“

وہ میز کے نیچے سے باہر آ گیا۔ کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”جو ہوتا ہے، عقل سے ہوتا ہے۔ ہتھیار سے کچھ نہیں ہوتا۔“

پھر اُس نے بنواری سے کہا۔ ”آپ نے راستے میں مجھ سے ریوالور چھین لیا تھا۔ مجھے نصیحت کی تھی کہ مرنے مارنے کی باتیں نہ کروں۔ ہم یہاں شرافت سے معاملات طے کریں گے۔ مگر میں جانتا تھا، یہ شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔“

وہ اپنا ریوالور بنواری کو دے کر، اُس سے پستول لے کر بولا۔ ”آپ اسے نشانے پر رکھیں۔“

وہ پستول کی گولیاں نکالنے لگا۔ بنواری نے شمبھو سے کہا۔ ”میں نے محبوب سے ریوالور لیا تھا، پھر اس کی گولیاں نکال کر واپس کر دیا تھا۔ یہ ریوالور خالی ہے۔ تمہارا پستول بھی خالی ہو گیا ہے۔ اب تو ضرور شرافت سے باتیں ہوں گی۔“

شمبھو نے چونک کر غصے سے محبوب کو دیکھا۔ وہ اب تک خالی ریوالور سے اُس پر حاوی ہوتا رہا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بابو جی! اب تو اس کا باپ بھی بڑی شرافت سے بولے گا۔“

حالات نے شمبھو کو سمجھا دیا کہ نہ رادھیکا ماری جائے گی، نہ ایک ہندو لڑکی کے قتل کا الزام محبوب پر آئے گا۔ پھر یہ کہ اس کی حمایت میں ایک دولت مند، ہر دلعزیز ہندو بنواری لال بھی آیا تھا۔ پستول بھی اس کے پاس چلا گیا تھا۔ ہر پہلو سے اُس کا

پلڑا بھاری تھا۔

بنواری نے کہا۔ ”تمہارے دونوں بچے ایک ہندو پریوار میں صحیح سلامت ہیں۔ پارو کو یہاں لاؤ، بچے ابھی تمہیں مل جائیں گے۔“

محبوب نے پستول بنواری کو دے کر اپنا ریوالور لیتے ہوئے کہا۔ ”اسے لوڈ کرنے دیں۔ یہاں کسی وقت بھی اس کے بدمعاش ہتیارے آ سکتے ہیں۔“

بنواری نے جیب سے گولیاں نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”اب میری بھی سمجھ میں آ گیا ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ بدمعاشوں کو بدمعاشی سے ہی دبایا جا سکتا ہے...... ہاں تو شمبھو! چپ کیوں ہو؟ کیا تمہارے اندر اب بھی کوئی سازش پک رہی ہے؟“

اُس کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”میں پارو کو یہاں لاؤں گا۔ تم بچوں کو بھی یہیں لے آؤ۔“

”نہیں۔ ہم پارو کو ناگ پارا لے جائیں گے، تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ وہاں سے بچوں کو لاؤ گے۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”کیا مجھے وہاں لے جا کر بلوائی اور ہتیارا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔“

محبوب نے کہا۔ ”تم نے ایک رات میں جو قیامت برپا کی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ناگ پارا کا ایک ایک آدمی تمہیں جوتے مار مار کے چِتا میں پہنچا دے۔“

بنواری نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ”محبوب! پچھلی باتوں میں سمے برباد نہ کر۔ اس نے جو کیا ہے، اس کی سجا شاید کانون تو نہ دے سکے، بھگوان جرور دے گا۔ بس لین دین کی بات کرو۔“ پھر اُس نے شمبھو سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم نہ جاؤ۔ تمہاری دھرم پتنی ہمارے ساتھ جا کر بچوں کو لے آئے گی۔“

وہ بولا۔ ”ہاں، یہ منجور ہے۔ میں ابھی جا کر پارو کو لاتا ہوں۔“

وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ محبوب نے ریوالور کی نال سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ چالاک نہ بنو۔ اپنے کسی آدمی سے کہو، وہ پارو کو یہاں لائے یا پھر ہم سب وہاں چلیں گے۔“

اس نے بے بسی سے بھرے ہوئے ریوالور کو دیکھا، پھر کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ ہم سب چلیں گے۔''

محبوب اپنی جگہ سے اُٹھ کر منصور کے سامنے آیا، پھر اُس نے ایک اُلٹا ہاتھ اُس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ پیچھے دیوار سے جا کر لگ گیا۔ مدد حاصل کرنے کے لئے شمبھو کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ محبوب نے دوسرا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تیری موجودگی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ ناگ پارا چل، وہاں تجھ سے نمٹا جائے گا۔''

اُس نے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''چل ہمارے ساتھ۔''

وہ جھٹکا کھا کر شمبھو کے پاس آ کر بولا۔ ''دادا! مجھے بچاؤ میں ناگ پارا نہیں جاؤں گا۔''

وہ بولا۔ ''مجھے کون بچا رہا ہے کہ میں تجھے بچاؤں گا؟ چپ چاپ یہاں سے چل۔''

وہ سب دفتر سے باہر آئے۔ محبوب کی بگھی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ شمبھو نے ملازم سے کہا۔ ''مالکن سے جا کے بول، ناگ پارا جانے کے لئے تیار رہے۔ وہ بچوں کو لانے جائے گی۔ ہم ابھی اُسے گھر سے لے جائیں گے۔''

محبوب نے منصور کو حکم دیا۔ ''تم شمبھو کے ساتھ آگے بیٹھ کر بگھی چلاؤ۔ ہم پیچھے بیٹھیں گے۔''

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ محبوب اور بنواری لال پیچھے بیٹھ گئے۔ بگھی ایک سمت چل پڑی۔ وہ دونوں راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ پیچھے محبوب کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔

رام پور سے کوسوں دُور ویرانے میں دو چار کچے مکانات تھے۔ وہاں ایک مکان میں شمبھو کے دو پالتو بدمعاش اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ پارو کو وہیں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔

اس وقت ایک بدمعاش کہیں کام سے گیا تھا۔ دوسرے نے دادا کو گن پوائنٹ

پر آتے دیکھا تو بھاگ کر مکان کے اندر جانا چاہا۔ وہ وہاں سے ہتھیار لانا چاہتا تھا۔ شمبھو نے آواز دی۔ ''رُک جا...... جھگڑا کرنے کا نہیں ہے۔ چھوکری کو باہر لے آ۔''

بڑھیا دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ بدلتے ہوئے حالات کو بھانپ گئی تھی۔ اُس نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''میں لاتی ہوں۔''

محبوب نے شمبھو سے کہا۔ ''تم اپنے گرگوں کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کرو اور ہاتھ اُٹھا کر چپ چاپ کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ بولا۔ ''ایسا کیوں کر رہے ہو؟ مجھے یہاں چھوڑ کر پارو کو لے جاؤ گے تو میری دھرم پتنی تمہارے ساتھ بچوں کو لانے نہیں جائے گی۔''

اس نے کہا۔ ''زیادہ نہ بولو۔ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔''

وہ منصور اور اپنے پالتو غنڈے کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

محبوب نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے آ رہی تھی۔ آفات اور صدمات نے اُسے اُجاڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ صحرا میں گرد آلود پھول کی طرح کھلی سی لگ رہی تھی۔

بڑھیا نے کمرے میں آ کر اُس سے کہا تھا۔ ''باہر چل۔ تیرا کوئی آدمی طمنچہ لے کر آیا ہے۔''

وہ بے یارومددگار، زندگی سے مایوس، فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اُس نے بڑھیا کی بات سن کر بے یقینی سے پوچھا۔ ''میرا کون آدمی ہے؟...... کون آیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''باہر چل کے دیکھ لے۔''

وہ فرش سے سر اُٹھا کر سر جھکائے دروازے پر آئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس ویرانے میں اُسے لینے آیا ہے اور اُسے رہائی ملنے والی ہے۔

اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ اُس کا دیوانہ آیا تھا۔ وہ شدید حیرانی سے اور مسرتوں کی تند آندھی سے لرز گئی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔

محبوب اُس کی طرف دو قدم بڑھا۔ وہ بھی ڈگمگاتی ہوئی دو قدم آگے آئی، پھر

رُک کر زمین پر دوزانو ہو گئی۔ چادر کا کونا منہ پر رکھ کر سسکنے لگی۔

محبوب نے جھک کر پوچھا۔ ’’پارو! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کسی سے نہ ڈرو۔ فوراً بتاؤ، تم پر کیسے کیسے ظلم کئے گئے ہیں؟‘‘

وہ محبوب کو دیکھ کر رو رہی تھی۔ خوشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بنواری کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اُس نے کہا۔ ’’بیٹی! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان بدمعاشوں سے نہ ڈرو۔ تم پر جو بیتی ہے، وہ بتاؤ۔‘‘

پارو نے چادر سے منہ ڈھانپ کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’میں ٹھیک ہوں۔‘‘

بڑھیا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ’’یہ نہ سمجھو، کسی نے اس کی عجت لُوٹی ہے۔ میں نے کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیا۔ کیونکہ یہ گر بھوتی ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘

بنواری لال نے چونک کر پارو کی طرف دیکھا۔ پھر بڑھیا سے پوچھا۔ ’’کیا بکواس کر رہی ہو؟ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ یہ کل رات دُلہن بننے والی تھی۔‘‘

محبوب نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’بابو جی! یہ درست کہہ رہی ہے۔‘‘

بنواری نے شدید حیرانی سے محبوب کو دیکھا۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے معاف کر دیں، بابو جی! آپ کے سامنے اپنی پارو کا سر جھکانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے یہ بات چھپا رہا تھا۔‘‘

وہ غصے سے بولا۔ ’’تمہیں شرم آنی چاہئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم شادی سے پہلے اتنا بڑا پاپ کرو گے۔‘‘

پارو نے فوراً ہی منہ چھپاتے ہوئے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’یہ پاپی نہیں ہیں، یہ فرشتہ ہیں۔ مجھے بدنامی سے بچانے کے لئے کسی اور کا پاپ اپنے سر لے رہے ہیں۔ یا اللہ! یہ مجھے دشمنوں سے چھڑانے آئے ہیں۔ میں ان کے لئے کیا کروں؟‘‘

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ منصور دیوار کی طرف منہ کئے ہاتھ اُٹھائے شمبھو کے ساتھ کھڑا تھا۔ پارو کی باتیں سن کر اس خوف سے لرز رہا تھا کہ

محبوب غصے میں آ کر اس کی پٹائی نہ شروع کر دے۔

ہونا تو یہی تھا۔ اور یہی ہوا۔ محبوب نے آ کر ریوالور کے دستے سے اُس کی پیٹھ پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ تکلیف سے چیختا ہوا بھاگنا چاہتا تھا، مگر ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی۔ وہ آگے کو جھکتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

محبوب نے اُسے ٹھوکریں مارتے ہوئے کہا۔ ’’بابو جی! یہ کمینہ شیطان ہے۔ اس نے میری پارو کو برباد کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

وہ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ پارو کی بے آبروئی اور ذلت کا احساس ایسا حاوی ہوا تھا کہ ٹریگر پر رکھی ہوئی اُنگلی بھاری پڑ گئی اور گولی چل گئی۔ بنواری نے اسی لمحے میں اس کا ہاتھ اوپر کو اُٹھا دیا۔ ہوائی فائر کی آواز، ویرانے میں دُور تک گونجتی چلی گئی۔ اس فائر نے شمبھو اور اس کے پالتو بدمعاش کو خوف زدہ کر دیا تھا۔

پارو دوڑتی ہوئی آ کر محبوب کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اُس کے پاؤں پر سر مارتے ہوئے گڑگڑانے لگی۔ ’’میں آپ کو قسم دیتی ہوں، اپنی قسم دیتی ہوں....... اس کتے کو نہ ماریں۔ آپ قاتل ہتیارے بنیں گے، آپ کو سزا ہو گی تو میں کہاں جاؤں گی؟‘‘

وہ بول رہی تھی، اپنی اور اس کی بہتری کے لئے۔ آئندہ اچھی ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے بول رہی تھی۔ محبوب علی متاثر ہو رہا تھا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی قسم دے رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پیار ہی پیار کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ یہ سوچ کر سحر طاری ہو رہا تھا کہ وہ اسے اپنے لئے ضروری سمجھ رہی ہے۔

ایسے ہی وقت منصور وہاں سے اُٹھ کر بھاگنے لگا۔ محبوب نے للکارا۔ ’’رُک جا......نہیں تو گولی مار دوں گا۔‘‘

مگر ریوالور والا ہاتھ نیچے تھا۔ پیار کی قسم کے آگے جھکا ہوا تھا۔ وہ بار بار للکار رہا تھا، مگر بھاگنے والے کے بھاگ کھل گئے تھے۔ پارو نے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ پیار بھی کیا ہوتا ہے؟ بھری بندوق کو خالی کر دیتا ہے۔

محبوب نے پہلی بار اسے ہاتھ لگایا۔ جھک کر اس کے بازوؤں کو تھام کر بولا۔ ’’اُٹھو......گھر چلو۔‘‘

اُس نے اُٹھتے ہوئے پہلی بار محبوب کو نظر بھر کے دیکھا۔ وہ گھر چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اپنا گھر تو رہا نہیں تھا، اب تو پیا کے گھر ہی جانا تھا۔

محبوب نے شمبھو سے کہا۔ ”بگھی میں آ کر بیٹھو اور اپنے گھر چلو۔ تمہاری پتنی ہمارے ساتھ جائے گی۔“

وہ بگھی میں سامنے والی سیٹ پر آ گیا۔ اپنے پالتو بدمعاش سے بولا۔ ”تم ہمارے پیچھے نہ آؤ۔ میرا ان سے معاملہ ہو گیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں کوئی جھگڑا نہیں پھیلا رہا ہوں۔“

محبوب پارو کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بنواری نے اگلی سیٹ پر آ کر گھوڑے کی لگام سنبھال لی۔ اس طرح وہ قافلہ وہاں سے ناگ پارا کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ بگھی ناگ پارا میں داخل ہوئی تو شور اُٹھا۔

”پارو آ گئی........ پارو آ گئی........“

وہاں اُس کے اپنے مارے گئے تھے۔ زندہ جلا دیئے گئے تھے۔ یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اغوا کی جانے والی بھی زندہ سلامت واپس آئے گی۔ اب وہ نظر آئی تو جیسے چمتکار ہو گیا۔

مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب ہی بگھی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اُسے اچھی طرح قریب سے دیکھنے کے لئے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ بنواری نے اپنے بیٹے سے کہا۔

”کشوری! ابھی پنچوں کو اور تمام بزرگوں کو پیپل کی چھیّاں میں بلاؤ۔ ہم ان سب کی موجودگی میں شمبھو کے بچوں کو واپس کریں گے۔“

پارو کو دیکھ کر سب ہی خوش ہو رہے تھے۔ پچھلی رات جو دل ہلا دینے والی واردات ہوئی تھی اور جن صدمات سے وہ دوچار ہو رہے تھے، وہ صدمات پارو کی واپسی سے کچھ دھیمے پڑنے لگے۔

پیپل کی چھیّاں میں پورا ناگ پارا اُمڈ آیا تھا۔ رادھیکا اور راج کمار کو وہاں لایا گیا تھا۔ تمام لوگ شمبھو کی پتنی کے متعلق پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہے؟ اور ان دو بچوں کا معاملہ کیا ہے؟

عورتیں پارو کے قریب آنا چاہتی تھیں۔ ان سب کو فی الحال روکا جا رہا تھا۔ لیکن اس کی سہیلیاں تمام رکاوٹیں توڑ کر چلی آئی تھیں۔ اس سے لپٹ لپٹ کر رو رہی

تھیں۔ ظالموں کو کوس رہی تھیں۔ لوگوں سے پوچھ رہی تھیں کہ آئندہ جوان لڑکیوں
کی عزتیں محفوظ رہیں گی یا نہیں؟
وہ بڑا ہی دل گداز منظر تھا۔ کتنے ہی لوگ متاثر ہو رہے تھے۔ وہ جو کبھی روتے
نہیں تھے، وہ بھی رو رہے تھے۔ بنواری نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔
''میری ماؤ! بہنو! اور بھائیو........! کل رات ایک گھر کو، ایک پورے پریوار کو
مٹی اور کھون میں ملا دیا گیا۔ ہم نے معلوم کیا ہے، شمبھو دادا کے بلوائیوں نے شہر
سے آ کر ایسی شیطانی حرکتیں کی ہیں۔''
یہ سن کر سب لوگ شمبھو کے خلاف بولنے اور نعرے لگانے لگے۔ مطالبہ کرنے
لگے کہ اُسے پولیس کے حوالے کیا جائے، اُسے مار ڈالا جائے، اُسے بھی پارو کی
پھوپھی اور ماں کی طرح زندہ جلا دیا جائے۔
بنواری نے کہا۔ ''ہم سب انسان ہیں۔ ان کی طرح شیطان اور ہتیارے نہیں
ہیں۔ ہم چیونٹی بھی نہیں مارتے۔ جوش میں آ کر انہیں مارنے کی باتیں نہ کرو۔''
پھر سب ہی مطالبہ کرنے لگے کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔
بنواری نے کہا۔ ''ہمارے دیس میں جگہ جگہ ہندو مسلمان لڑ رہے ہیں، ایک دوسرے
کو کاٹ رہے ہیں، گھروں کو جلا رہے ہیں، عورتوں کو اُٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ مگر
پولیس والے کسی کو پکڑنے نہیں آتے، کوئی کانونی کارروائی نہیں ہوتی۔ انگریج سرکار
یہاں سے جانے جانے کو ہے، اس لئے چپ چاپ تماشا دیکھتی رہتی ہے۔''
محبوب نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔ ''آپ سب دیکھ رہے ہیں، پچھلی رات
قیامت برپا ہوگئی۔ بلوائی شہر سے ڈاکو بن کر آئے اور ایک مسلمان کے گھر کو جلا کر
پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار کر چلے گئے۔ ہم پارو کو ان کی قید سے چھڑا کر
نہ لاتے تو ہمیں پتہ ہی نہ چلتا کہ یہ کہاں جا کر مر مٹ گئی ہے؟''
پارو سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ سب اُسے دیکھ رہے تھے۔ محبوب نے کہا۔
''ہمارے دیس میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ سب نے دیکھا تھا، کوتوال
تھوڑی دیر کے لئے سپاہیوں کے ساتھ آیا تھا، پھر یہاں سے جانے کے بعد اب
تک واپس نہیں آیا۔ اگر آئے گا، تب بھی شمبھو دادا جیسے بڑے بدمعاش کو گرفتار نہیں کر

سکے گا۔''
بنواری نے کہا۔ ''یہ اپنے اپنے دماغ سے سمجھنے کی بات ہے کہ شمبھو دادا نے
کیول ایک مسلم گھرانے کو مارا اور جلایا ہے۔ وہ کسی ہندو پریوار سے بھی بدمعاشی کر
سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔''
محبوب نے کہا۔ ''اور اس نے جو کیا ہے، اس کے نتیجے میں وہ مسلمانوں کو غصہ
دلانا چاہتا ہے۔ اور اگر ہم مسلمان عقل سے کام نہیں لیں گے، طیش میں آ کر اپنے
ناگ پارا کے ہندو بھائیوں سے لڑ پڑیں گے تو اس بدمعاش دادا کا مقصد پورا ہو
جائے گا۔ وہ یہاں بھی ہندو مسلم فساد برپا کرا دے گا۔''
انہوں نے منگو لوہار کو پنچوں کے اونچے چبوترے پر بلایا، پھر کہا۔ ''اس کے
لوہے کا کڑا گھاٹ سے کسی نے چرایا تھا۔ اس بات کے کئی بڑے بوڑھے گواہ ہیں۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کڑا کس نے چرایا تھا؟ اور کیوں چرایا تھا؟''
منگو لوہار نے کہا۔ ''سیدھی سی بات سمجھ میں آتی ہے، میرے کو پھنسانے کے
لئے ایسا کیا گیا تھا۔ اور میں چھاتی ٹھونک کے بولتا ہوں منصور نے اسے چرا کر شمبھو
دادا کے پاس پہنچایا تھا۔''
منصور کی ماں نے عورتوں کے درمیان سے اُٹھ کر کہا۔ ''اے خبردار! میرے
بیٹے کو جھوٹا الزام نہ دینا۔ تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ اس نے تیرا کڑا چرایا تھا؟''
مقبول بکرے والے نے کہا۔ ''میرا بیٹا بے وقوف ہے، نکما ہے، مگر اتنا چالاک
نہیں ہے کہ لڑائی لگانے کے لئے تمہارا کڑا سلطانی بیگم کے آنگن میں لے جا کر
پھینکے گا۔''
محبوب نے کہا۔
''اس نے خود آنگن میں نہیں پھینکا تھا۔ اس کڑے کو شمبھو کے پاس پہنچایا تھا ہم
سب چشم دید گواہ ہیں کہ وہ اس غنڈے دادا کا تابعدار بن گیا ہے۔''
بنواری نے کہا۔ ''ہم نے اسے شمبھو کے ساتھ دیکھا ہے۔ ابھی اسے پکڑ کر
یہاں لانا چاہتے تھے۔ مگر وہ بھگوڑا ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔''
ناگ پارا کے سیدھے سادے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے درمیان

فرقہ وارانہ فسادات پھیلانے کے لئے پیچیدہ سازش کی جائے گی۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ ایسی سیاسی سازش کے پیچھے صرف ہندو نہیں تھے، ایک مسلمان بھی منافق کا کردار ادا کر رہا تھا۔

وہاں سب ہی قائل ہو کر کہہ رہے تھے کہ منصور بے وقوف اور پاگل نہیں تھا۔ اس کا جھوٹا پاگل پن ثابت ہونے کے بعد وہ بستی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اور اب ناگ پارا کے دو سب سے ہر دل عزیز افراد بنواری اور محبوب اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ وہ منافق اس دادا کی جوتیوں میں جا کر بیٹھ گیا ہے۔

یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد سب ہی منصور کو لعن طعن کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اسے کبھی ناگ پارا میں قدم رکھنے نہیں دیں گے۔

بنواری لال نے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”صرف ایک مسلمان کو برا سمجھ کے ایسا نہ کہو۔ یہ قسم کھاؤ کہ شمبھو دادا کو کبھی اِدھر نہیں آنے دو گے۔ جو مسلمان، جو ہندو سیاسی جھنڈا لے کر ادھر آئے گا، ہم سب مل کر ان کو واپس بھگا دیں گے۔“

سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔ ”ہم سب مل کر انہیں بھگا دیں گے۔ یہاں کسی کی سیاست نہیں چلنے دیں گے۔“

ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں کہ ہم ناگ پارا کے ہندو مسلم پہلے بھی بھائی بھائی تھے، آئندہ بھی ایک دوسرے کے سر پر سایہ بن کر رہیں گے۔

وہ بڑے جوش جذبے اور محبت سے کہہ رہے تھے کہ ہم پنارو کے جلے ہوئے گھر کو پھر کھڑا کر دیں گے اور وہاں ایک یادگار قائم کریں گے، آئندہ نسل کو بتائیں گے کہ ایک مسلم گھرانے کی قربانیوں نے ناگ پارا کے تمام گھروں کو جلنے اور تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ یہاں دین دھرم کی آڑ میں نہ کبھی جھگڑا ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔

***

پیپل کی چھیّاں میں بڑی دیر تک فضا گرم رہی۔ پیار و محبت، امن و آشتی کے نعرے گونجتے رہے۔ پھر محبوب نے کہا۔ ”آپ پوچھ رہے تھے، یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ عورت اور دو بچے کون ہیں؟ مجھے اُمید ہے، حقیقت معلوم ہونے پر یہاں

کوئی ان سے دشمنی نہیں کرے گا۔“

تمام لوگوں کی نظریں محبوب پر جم گئیں۔ اس نے کہا۔ ”یہ خاتون شمبھو بدمعاش کی دھرم پتنی ہے۔“

سب نے چونک کر اُسے غصے سے دیکھا۔ بنواری نے کہا۔ ”اور یہ دونوں اس بدمعاش کے بچے ہیں۔ محبوب نے بڑی چالاکی اور بہادری سے ان بچوں کو شمبھو سے چھین کر اسے مجبور کر دیا، تب اس بدمعاش نے پارو کو ہمارے حوالے کیا ہے۔ میرا بیٹا شیر کے منہ سے نوالہ چھین کر لایا ہے۔ اس کی جوان مردی پر تالیاں بجاؤ۔“

وہ سب تالیاں بجاتے ہوئے نعرے لگانے لگے۔ ”محبوب علی زندہ باد........ جے ہو محبوب علی کی........ جے ہو........“

جو بیٹھے ہوئے تھے، وہ بھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تالیوں کے شور سے پورا ناگ پارا گونج رہا تھا۔ ان تالیوں کی گونج سے زیادہ پارو کا دل دھڑک دھڑک کر چیخ رہا تھا۔ ”میرا محبوب جیوے........ میری آبرو کا رکھوالا ہزاروں سال جیوے۔ اگر یہ جان لڑا کر مجھ تک نہ پہنچتا تو میری عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہتی۔ آبرو سے بھی جاتی، جان سے بھی جاتی۔“

پھر شور ہوا کہ کوتوال سپاہیوں کے ساتھ آیا ہے۔ سب نے ایک طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی بھیڑ ایک طرف چھٹنے لگی۔ کوتوال کا تانگہ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آ رہا تھا۔ تانگے کے دائیں بائیں سپاہی بندوق لئے چل رہے تھے۔ تالیاں بجانے اور نعرے لگانے والے جذبات سرد پڑ گئے۔ بندوق اور وردی کے سامنے سب کو چپ لگ گئی تھی۔

تانگہ اونچے چبوترے کے سامنے آ کر رُک گیا۔ کوتوال نے کہا۔ ”محبوب علی! مجھ کو شمبھو دادا نے یہاں بھیجا ہے۔ ہمارے اوپر والوں نے حکم دیا ہے کہ میں بندوق والے سپاہی لے جاؤں اور دادا کے بیوی بچوں کو واپس لے آؤں۔“

بنواری نے پوچھا۔ ”کیا اُس نے محبوب کے برخلاف کیس کیا ہے؟“

کوتوال نے کہا۔ ”وہ ایسا کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے سمجھا دیا ہے کہ محبوب پر کیس کرنے سے ناگ پارا کے تمام لوگ عدالت میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی جھوٹا

مقدمہ نہیں چل سکے گا۔"

پھر وہ محبوب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ تم اس کے بچوں کو طمنچے کے جور پر لے گئے ہو۔ مگر میں تم کو ہتھکڑی نہیں لگاؤں گا۔ اس کے بیوی بچوں کو واپس لے جاؤں گا۔"

بنواری نے کہا۔ "ابھی ہم بڑی محبت اور شرافت سے انہیں واپس کرنے والے تھے۔ اب نہیں کریں گے۔ ہم نہیں جانتے، اس کمینے نے محبوب کے خلاف کیسی رپورٹ درج کرائی ہے؟"

محبوب نے کہا۔ "تم یہ بندوق والے دس سپاہی لائے ہو، یہ کتنوں پر گولیاں چلائیں گے؟ ناگ پارا کے لوگ پچھلی رات بہت گہرا زخم کھا چکے ہیں۔ اب اس بلوا کرانے والے کی کوئی چال یہاں چلنے نہیں دیں گے۔"

ادھر محبوب بول رہا تھا، اُدھر لوگ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے تمام سپاہیوں سے آ کر لگ گئے تھے۔ چاروں اطراف سے ایسا دباؤ تھا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بندوق اُٹھا کر کسی کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

کوتوال نے پریشان ہو کر کہا۔ "محبوب! ان سے کہو، دُور ہٹ جائیں۔"

بنواری نے پوچھا۔ "کیا گولیاں کھانے کے لئے دُور نشانے پر چلے جائیں؟ ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، یہ سیاسی نیتا امن اور شانتی نہیں چاہتے۔ سپاہیوں سے بولو، بندوق کھالی کر کے آگے آئیں اور تمام ہتھیار یہاں چبوترے پر رکھ دیں۔"

کوتوال نے کہا۔ "ٹھیک ہے، یہ ابھی ہتھیار ڈالیں گے۔ مگر میں پہلے محبوب سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

محبوب چبوترے سے اُتر کر اُس کے پاس آیا۔ وہ دونوں لوگوں کی بھیڑ سے دُور ایک درخت کے سائے میں آ کر رُک گئے۔ کوتوال نے کہا۔ "تم پر کوئی کیس نہیں ہوگا۔ میں بچنے کا راستہ بتاؤں گا۔ یہ تو تم سب جانتے ہو، میرے تھانے میں جو سپاہی ہوتے ہیں، ان کے پاس لاٹھیاں ہوتی ہیں۔ یہ رائفل والے، راج دھانی کے ریزرو سپاہی ہیں۔ ایمرجنسی کے لئے رام پور میں رہتے ہیں۔ ان سے ہتھیار چھینو گے تو بڑے لمبے مقدمے میں پھنس جاؤ گے۔"

"اگر میں جوابی کارروائی نہیں کروں گا، تب بھی پھنسوں گا۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں جو ہوں۔ چنتا کیوں کرتے ہو؟ میں ان سے نمٹ لوں گا۔ تم میرے مطلب کی بات کرو۔"

محبوب نے کہا۔ "میں اپنے وعدے سے نہیں پھرتا۔ میں نے کہا تھا، پارو آج ہی واپس مل جائے گی تو تمہیں پچاس ہزار روپے دوں گا۔ ابھی یہ تمام معاملات نمٹاؤ، میں آج ہی دوں گا۔"

وہ بولا۔ "تو پھر سنو۔ تم سے اتنی لمبی رقم لینے کے لئے میں نے شمبھو دادا کی ایف آئی آر نہیں لکھی ہے۔ بلکہ اس سے پکے کاغذ پر لکھوایا ہے کہ نہ اُس نے پارو کو ناگ پارا سے اُٹھوایا ہے، نہ تم اس کے بچوں کو اس سے چھین کر لے گئے ہو۔"

اس نے وردی کے اندر سے ایک کورٹ پیپر نکال کر پیش کیا۔ محبوب نے اسے کھول کر پڑھا۔ وہ ایسی پکی سند تھی کہ شمبھو کبھی اس پر بچوں کے اغوا کا الزام عائد نہیں کر سکتا تھا۔ محبوب نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے بہت بڑی رقم لے رہے ہو۔ مگر واقعی کام بھی خوب کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے، اس کے بیوی بچوں کو وہاں پہنچا کر جب بھی آؤ گے، میں تمہاری جیبیں نوٹوں سے بھر دوں گا۔"

وہ دونوں چبوترے کے پاس آ گئے۔ محبوب نے وہ پکا کاغذ بنواری کو دکھایا۔ اُس نے اُسے پڑھنے کے بعد کہا۔ "ہاں، یہ پکا کام ہوا ہے۔ اس کے بیوی بچوں کو جانے دو۔"

ادھیکا بڑی دیر سے چپ بیٹھی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ماں آئی ہے تو راج کمار کو لے جائے گی، اسے محبوب کے پاس چھوڑ دے گی۔ اب اُسے بھی چلنے کو کہا گیا تو وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ محبوب کے پاس آ کر بولی۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے پتی کے ساتھ رہوں گی۔"

پارو نے چونک کر رادھیکا کو دیکھا۔ وہ اس کے محبوب پر قبضہ جمانے والی بات کر رہی تھی۔ اسے اپنا پتی کہہ رہی تھی۔ بنواری نے مجمع پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کی باتیں سن کر آپ حیران ہو رہے ہیں۔ پہلے میں بھی حیران ہوا تھا کہ محبوب نے ابھی شادی نہیں کی، پھر اس کی پتنی کہاں سے آ گئی؟"

پھر وہ اپنی کنپٹی پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس بے چاری کے ساتھ دماغی سمسّیا ہے۔ ہم نہیں جانتے، یہ ایسی کیوں ہے؟ اس کے ماں باپ جانتے ہیں۔''

پھر وہ رادھیکا کے پاس آ کر بولا۔ ''بیٹی! میں اپنے گھر میں تمہارا وِواہ کرنا چاہتا تھا، مگر تمہارے باپ نے کہا ہے کہ وہ اپنے گھر میں لگن منڈپ سجا رہا ہے۔ وہ باپ ہے، وہی تمہارا کنیادان کرے گا۔''

رادھیکا نے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا میرا وِواہ وہاں ہوگا؟''

وہ ماں اپنے بیٹے کو لے جانے آئی تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ رادھیکا کو نہیں لے جائے گی تو بیٹے کو روک لیا جائے گا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں، گھر چلو۔ وہاں تمہارا کنیادان ہوگا۔''

رادھیکا نے محبوب سے پوچھا۔ ''تم برات لے کر کب آؤ گے؟''

اُس نے کہا۔ ''تم جاؤ، میں کل آ جاؤں گا۔''

''کل نہیں، تم کو آج آنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، آج ہی آؤں گا۔ ابھی ماں اور راج کمار کے ساتھ جاؤ۔''

وہ راضی خوشی وہاں سے جانے لگی۔ ماں اور بھائی کے ساتھ کوتوال کے تانگے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کوتوال نے کہا۔ ''محبوب! میں ابھی دو گھنٹے میں واپس آؤں گا۔ تم کہاں ملو گے؟''

''میں ناگ پارا میں کہیں بھی ملوں گا۔ پھر تمہیں حویلی میں لے جا کر مٹھائی کھلاؤں گا۔''

وہ خوش ہو کے بولا۔ ''سمجھ گیا........ بس ابھی آ رہا ہوں۔''

وہ شمبھو کے بیوی بچوں کو لے کر سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ بے شمار عورتیں پارو کے پاس آ گئیں۔ جیسا کہ دستور ہے، وہ سب ہی اُس کے سامنے سلطانی، بلقیس اور بنّے میاں کو یاد کر کے رونے لگیں، اُسے دُعائیں دینے اور صبر کی تلقین کرنے لگیں۔ پارو کے لئے یہ ناقابلِ برداشت صدمات تھے۔ پھر بھی برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

یہ ماتمی سلسلہ بڑی دیر تک رہا۔ اس کی پڑوسن نے کہا۔ ''میرے گھر چلو۔ دیکھو

تو سہی، کیسی اُجڑی اُجڑی سی لگ رہی ہو۔ غسل کر کے لباس تبدیل کرو گی تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گی۔''

وہ ان عورتوں کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے آئی۔ مٹی کی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں۔ آنگن دُور سے دکھائی دیتا تھا۔ پکی اینٹوں کے دو کمرے رہ گئے تھے، باقی سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ وہ ماں کو، ماموں اور پھوپھی کو پکار پکار کر چیخیں مار کر رونے لگی۔ بے اختیار آنگن میں جانا چاہتی تھی، مگر عورتوں نے اسے پکڑ لیا۔ اسے پڑوسن کے گھر میں لے آئیں۔

جب غم کی آندھی چلتی ہے تو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ ابھی ایک غم اور رہ گیا تھا۔ ناگ پارا کے چند نوجوان تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے شہر کے ہسپتال لے گئے تھے۔ اب انہیں واپس لے آئے تھے۔ محبوب ان کی آخری رسومات ادا کرنے کے لئے انہیں حویلی میں لے گیا تھا۔

پارو نے تڑپ کر کہا۔ ''میں اماں کو دیکھوں گی۔ ماموں کے پاس جاؤں گی۔ ہائے، پھوپھی اماں اپنا گھر چھوڑ کر مجھے دُلہن بنانے آئی تھیں۔ کون جانتا تھا کہ موت اُنہیں یہاں لے آئی ہے۔''

محبوب نے آ کر کہا۔ ''پارو! صبر کرو۔ ان کا آخری دیدار نہ کرو۔''

اُس نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں نہ کروں؟ جس نے مجھے پیدا کیا ہے، اس ماں کو آخری بار کیوں نہ دیکھوں؟''

وہ بولا۔ ''میں تمہارے دلی جذبات کو سمجھتا ہوں۔ مگر تمہاری بہتری کے لئے سمجھا رہا ہوں۔ وہ ایسی حالت میں ہیں کہ انہیں دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ میری بات مان لو۔''

کئی مرد اور عورتیں بھی سمجھا رہی تھیں۔ مگر وہ بار بار گھر سے نکل کر حویلی کی طرف جانا چاہتی تھی۔ محبوب نے پہلی بار سخت لہجے میں کہا۔ ''بس کرو........ تمہاری یہ ضد پوری نہیں کی جائے گی۔ میں نہ تو حویلی میں تمہیں آنے دوں گا، نہ کسی کا دیدار کرنے دوں گا۔''

وہ ہکّا بکّا سی رہ گئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا عاشق دیوانہ یوں تمام

لوگوں کے سامنے اُسے ڈانٹے گا۔ وہ بے بسی سے روتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔ محبوب کو احساس ہوا کہ سخت روّیہ اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر کیا کرتا؟ وہ ضد سے باز نہیں آ رہی تھی۔ عورت جب ٹیڑھی ہو جائے تو ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کے بغیر سیدھی نہیں ہوتی۔

پارو کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی 'یہ مرد کیسے ہوتے ہیں؟ خوانخواہ عورتوں پر رعب جماتے ہیں۔ یہ محبوب تو شوہر بننے سے پہلے فرعون بن رہے ہیں۔ میرے جائز حق سے، اماں کے آخری دیدار سے مجھے روک رہے ہیں۔'

ایک خاتون نے کہا۔ ''میں نے وہ جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں۔ دیکھتے ہی چکرا کر گر پڑی تھی۔ بے ہوش ہو گئی تھی بے شک وہ تمہاری اماں ہیں، پھوپھی ہیں، مگر تمہیں دیکھنا نہیں چاہئے۔ محبوب ٹھیک کہتا ہے، وہ تمہاری بھلائی چاہتا ہے۔ صبر کرو۔''

''بھلائی چاہتا ہے۔'' ان الفاظ نے سمجھایا کہ واقعی وہ دیوانہ اُس کا خیر خواہ ہے۔ جنونی ہے۔ شیطانوں کے جہنم میں گھس کر اُسے داغ دار ہونے سے پہلے نکال لایا ہے۔

ابھی اُسے غصہ آ رہا تھا، ابھی ٹھنڈی ہو گئی۔ پیار کے پہلو سے سوچنے لگی تو غصہ تحلیل ہو گیا۔ خیالات بدل گئے۔ وہ نگاہوں کے سامنے بولتا ہوا، ڈانٹتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈانٹنے میں بڑی اپنائیت تھی۔ گویا اُسے سر سے پاؤں تک اپنی ملکیت سمجھ رہا تھا۔

اُسے پہلی بار معلوم ہو رہا تھا کہ اپنے مرد کا سخت روّیہ بھی اچھا لگتا ہے۔ اور کیوں نہ لگے۔ جب مرد ہے تو سخت ضرور ہو گا۔ اس کے پیار کی نرمی اور مزاج کی گرمی دونوں ہی اچھی لگتی ہیں۔

اس رات تین لاشوں کی تدفین ہوئی۔ کتنی ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ جو نہیں رو رہے تھے، وہ آہیں بھر رہے تھے، افسوس کر رہے تھے۔ ایک رات دیوالی سے زیادہ دیے جلائے گئے تھے۔ دوسری رات اندھیرا تھا۔ صرف دل جل رہے تھے۔

دوسرے دن محبوب نے بنواری سے کہا۔ ''پارو نے ایک رات پڑوسن کے گھر میں گزاری ہے۔ اسے اب میرے گھر آ جانا چاہئے۔''

اُس نے کہا۔ ''تمہارے گھر جانے کے لئے نکاح ضروری ہے۔ اور ابھی وہ بڑے دُکھ جھیل رہی ہے۔ سارا ناگ پارا دُکھی ہے۔ ایسے میں شادی رچانا مناسب نہیں ہے۔''

''میں کوئی دھوم دھام نہیں کروں گا۔ بڑی سادگی سے نکاح پڑھوا کر حویلی میں لے جاؤں گا۔''

وہ دونوں پارو کے پاس آئے۔ بوڑھی عورتوں کو مردوں کو بلایا، پھر بنواری نے کہا۔ ''محبوب سادگی سے نکاح پڑھوا کر پارو کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''پارو آج نہیں تو کل محبوب کے گھر ہی جائے گی۔ لیکن چالیسواں ہو جائے تو اچھا ہے۔''

ایک خاتون نے کہا۔ ''ایسی جلدی بھی کیا ہے، محبوب میاں!........اس کے رہنے سہنے کی فکر نہ کریں۔ ہم اس کے سرپرست بن کر رہیں گے۔''

کئی عورتوں نے کہا کہ وہ پارو کو اپنے گھروں میں رکھیں گی۔ محبوب نے انکار میں سر ہلایا، پھر کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میری شریکِ حیات بستی کے سارے گھروں میں دانا دُنکا چگتی پھرے۔ میں جان جوکھم میں ڈال کر اسے واپس لایا ہوں۔ اس لئے یہ آج سے میری حویلی میں رہے گی۔ آج ہی نکاح پڑھوا کر اسے لے جاؤں گا۔''

سب ہی اس بات کے قائل تھے کہ وہ پارو کی خاطر رام پور کے بہت بڑے بدمعاش سے ٹکرا رہا ہے۔ اس نے جواں مردی دکھائی ہے۔ اس کا دیوانہ ہے۔ لہٰذا کسی نے زیادہ بحث نہیں کی۔ محبوب کی مرضی کے مطابق نکاح طے کیا کہ شام کو نکاح پڑھایا جائے گا، پھر وہ پارو کو اپنی حویلی میں لے جائے گا۔

یہ بات پورے ناگ پارا میں پھیل گئی کہ شام کو پارو اور محبوب کی شادی تو نہیں ہے، خانہ آبادی ہے۔ کیونکہ شادی کا مطلب ہے خوشی اور خوشیاں نہیں منائی جائیں

گی، ڈھولک پر سہاگ کے گیت نہیں گائے جائیں گے۔ مگر وہ سہاگن بن جائے گی۔

پارو گم سم سی تھی۔ اسے محبوب کے گھر جانا اچھا لگ رہا تھا۔ مگر پیچھے اُجڑا ہوا گھر اور بچھڑے ہوئے لوگ یاد آ رہے تھے، اُسے تڑپا رہے تھے۔ پہیلیاں بجھوانے والی اور ناچنے گانے والی سہیلیوں کو بھی چپ لگ گئی تھی۔

محبوب کے اندر مسرتوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پارو ایک طویل انتظار کے بعد اس سے راضی ہوئی تھی اور اس نے اپنے حُسنِ سلوک سے اور جواں مردی سے اپنی طرف اُسے مائل کیا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ ابھی وہ صدمات سے نڈھال ہوگی اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شریکِ حیات بن کر آئے گی تو بڑی محبتوں سے اس کے صدمات کم کرتا رہے گا۔

شام کو بنواری کے وسیع و عریض مکان کے صحن میں نکاح خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ چند بزرگ خواتین و حضرات کو مدعو کیا گیا تھا، لیکن بے شمار مرد، عورتیں اور بچے بھی وہاں چلے آئے تھے۔ مکان کے اندر اور باہر اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔

صحن میں سفید چادریں بچھائی گئی تھیں۔ وہاں پیش امام کے ساتھ محبوب، بنواری لال اور کئی مسلمان بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نکاح خوانی ہونے والی تھی۔ مگر نہ ہو سکی۔ اچانک ہی مقبول بکرے والے نے آ کر کہا۔ ''ابھی نکاح نہ پڑھاؤ۔ میں آپ حضرات کے سامنے محبوب سے ایک سوال کر رہا ہوں۔''

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے پوچھا۔ ''میرے بیٹے سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟ وہ دارُو نہیں پیتا تھا، تم اور تمہارے پہلوان زبردستی اُسے پوری بوتل پلاتے رہے۔ سب کے سامنے جواب دو۔ منصور سے ایسی دشمنی کیوں کرتے آ رہے ہو؟''

محبوب نے کہا۔ ''جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے دشمنی کرتا رہا ہوں تو اس کی وجہ بھی تمہیں معلوم ہوئی ہوگی؟''

''ہاں۔ پیپل کی چھیاں میں سب لوگوں کے سامنے کہا گیا کہ میرا بیٹا، شمبھو دادا کا چیلا بن گیا ہے۔ تب میں حقیقت معلوم کرنے شہر گیا تھا۔ ہاں منصور نے اور دادا

نے بتایا کہ منصور، پارو کو چاہتا تھا۔ تم اُسے راستے سے ہٹانے کے لئے میرے بھی دشمن بن گئے۔''

''میں نے تم سے کیا دشمنی کی ہے؟''

''یہی کہ منصور کو زبردستی دارُو پلاتے رہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔ پھر تم باڑے کا گیٹ کھول کر میرے جانوروں کو بھگا دیتے تھے۔ تم نے مجھے لگ بھگ پچاس ہزار روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔''

بنواری نے کہا۔ ''تمہارا بیٹا دارُو پیتا ہے۔ تمہارے جانور بھاگ جاتے ہیں اور تم محبوب کو جھوٹا الزام دینے آئے ہو۔''

''میں جھوٹا الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ یہ میرے بیٹے کا رقیب ہے۔ اس کا جانی دشمن ہے۔ یقین نہ ہو تو پارو سے پوچھو۔ وہ میرے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ آج سے پہلے راتوں کو چھپ چھپ کر اس سے ملتی رہتی تھی۔''

محبوب نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''چاچا! زبان کو لگام دو۔ پارو بے حیا نہیں ہے۔ وہ کسی سے چھپ کر نہیں ملتی تھی۔ کیوں ایک شریف زادی کو بدنام کرنے آئے ہو؟''

مقبول نے حقارت سے کہا۔ ''اونہہ، بڑی شریف زادی ہے۔ پہلے منصور کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی، پھر حویلی کی مہارانی بننے کے لئے تمہیں پھانس لیا ہے۔''

محبوب نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ اس نے کسی کے ساتھ منہ کالا نہیں کیا ہے۔ اسے بدنام کرو گے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے مقبول کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کی پٹائی کرنا چاہتا تھا۔ تمام لوگ بیچ بچاؤ کے لئے آ گئے۔ بنواری نے کہا۔

''محبوب! غصہ نہ کرو۔ ہوش میں آؤ...... یہ پارو پر کیچڑ اُچھالنے آیا ہے، میں اس کا منہ بند کرتا ہوں۔''

مقبول نے غصے سے کہا۔ ''اس نے میرا گریبان پکڑا ہے۔ تم میرا منہ بند کرنا چاہتے ہو۔ آؤ مجھے مار ڈالو۔ مگر مرنے سے پہلے سب کو بتا کر جاؤں گا۔ ہاں، سب کو بتا کر جاؤں گا۔''

اس نے تمام حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سنو میرے بزرگو!....... میرے بھائیو!....... پارو، کنواری ماں بننے والی ہے۔''

وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر، چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''پارو، کنواری ماں بننے والی ہے....... پارو، کنواری ماں بننے والی ہے۔''

یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ سب لوگ حیرانی اور بے یقینی سے سن رہے تھے۔ کبھی اس کو اور کبھی محبوب کو دیکھ رہے تھے۔ محبوب کے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ وہ درمیان میں کھڑے ہوئے لوگوں کو دھکا مارتا ہوا مقبول کے پاس آیا، پھر اسے گھونسوں اور لاتوں سے مارنے لگا۔ وہ نیچے گر گیا تھا۔ مار کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''مار ڈالو....... مجھے مار ڈالو....... مگر یہ نکاح جائز نہیں ہے۔ حاملہ عورت سے نکاح نہیں ہوتا۔ یہ ہم سب کو دھوکا دے کر پارو کو بیوی نہیں، رکھیل بنا کر لے جا رہا ہے۔''

کتنے ہی لوگ محبوب کو چاروں طرف سے گھیر کر اسے پکڑ کر قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مقبول زہر اُگلنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''تم لوگوں نے کہا ہے، میرے بیٹے کو ناگ پارا میں قدم نہیں رکھنے دو گے۔ وہ شمبھو دادا کا غلام بن گیا ہے۔ اسے الزام دے رہے ہو کہ اس نے پارو کے گھر میں واردات کروائی ہے۔ یہ جھوٹا الزام ہے۔ مگر میں جو الزام لگا رہا ہوں، وہ سچ ہے۔ ابھی دائی ماں کو بلا کر اس کا پیٹ دکھاؤ۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ اسے دو مہینے کا حمل ہے۔''

یہ آخری بات تھی، جسے سنتے ہی محبوب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اب اسے مارنے پیٹنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ منہ بند کرنے سے پہلے ہی وہ زہر اُگل چکا تھا۔

اس وسیع و عریض صحن میں یک لخت خاموشی چھا گئی تھی۔ سب محبوب کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں پوچھ رہی تھیں، کیا کسی دائی ماں کو بلایا جائے؟

اُس نے بڑے دُکھ سے ایک گہری سانس کھینچی، پھر ایک آہ کے ساتھ سانس چھوڑی۔ ''آہ!....... اس بے چاری کی عزت رکھنے کے لئے میں نے کیا نہیں کیا....... میں بچے کو اپنا نام دینے والا تھا۔ مجازی خدا بن کر اس کے سر پر دُلہن کا

گھونگھٹ رکھنے والا تھا۔ مگر محبت سے کی جانے والی نیکی خاک میں مل رہی ہے۔ میں کیا کروں؟....... اس کی عزت کیسے رکھوں؟''

کام کیا نکلے کسی تدبیر سے
آدمی مجبور ہے تقدیر سے

وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ بنواری نے کہا۔ ''ہمارے ناگ پارا کی بہنیں اور بیٹیاں بدچلن نہیں ہیں۔ اور پارو کو آپ سب جانتے ہیں۔ ایک تو یہ دُکھوں کی ماری ہے، اوپر سے بدچلن ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ بے شک، وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کے ساتھ جو جبر دستی کی گئی تھی۔ سلطانی بیگم نے بدنامی کے ڈر سے اس پاپی کا نام کسی کے سامنے نہیں لیا۔ میں بتاتا ہوں، وہ پاپی ہے، منصور.......''

مقبول بکرے والے نے کہا۔ ''میرے بیٹے نے پارو سے زبردستی نہیں کی تھی۔''

ایک شخص نے اس کے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ ''چپ چاپ بیٹھے رہو۔''

بنواری نے کہا۔ ''یہ شہر گیا تھا۔ وہاں اس کے بیٹے اور شمبھو دادا نے اسے خوب سِکھا پڑھا کر بھیجا ہے اور یہ یہاں آ کر پارو پر کیچڑ اُچھال رہا ہے۔ اپنے بدمعاش بیٹے کو معصوم کہہ رہا ہے۔ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ کر یہاں لڑائی جھگڑے کے راستے نکال رہا ہے۔''

مقبول نے کہا۔ ''میرے خلاف جتنا بولنا ہے، بولو۔ مگر سن لو، محبوب! تم پارو کو اپنی دُلہن نہیں بنا سکو گے۔''

کچھ لوگوں نے اسے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''تم شیطان کے منہ سے بول رہے ہو۔ نکلو یہاں سے....... باہر جا کر پارو کو بے شرم، بدچلن کہو گے تو ہم بچوں کو تمہارے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر تم جہاں دکھائی دو گے، وہ تمہیں پتھر ماریں گے۔''

اُسے بنواری کے مکان سے نکال دیا گیا۔ مقبول بکرے والے کو اولاد سے زیادہ بکروں سے محبت تھی۔ شمبھو نے اُسے فی بکرا چالیس روپے کے حساب سے پچاس بکروں کے دو ہزار روپے دیئے تھے۔ وہ نہال ہو گیا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ جسے بدمعاش دادا کہا جاتا تھا، اس نے نقصان پورا کیا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ ''منصور کو ناگ پارا میں آنے جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ تم اُلٹا اِلزام محبوب پر لگاؤ۔ پارو کو بدنام کرو۔ وہاں جیادہ سے جیادہ اپنے حمایتی پیدا کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

وہ اچھی طرح مار کھانے کے بعد بھی دشمنی سے باز نہیں آ رہا تھا۔ بنواری کے گھر سے نکالے جانے کے بعد بستی کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اونچی آواز میں بولتا جا رہا تھا۔

''پارو ماں بننے والی ہے۔ محبوب اور بنواری لال اُس کا پاپ چھپا رہے ہیں۔ مگر یہ نہیں چھپے گا۔ پہلے پیٹ نکلے گا، پھر بچہ ہوگا تو پورا ناگ پارا دیکھے گا۔''

عورتیں گھروں سے نکل کر پوچھ رہی تھیں۔ تجسس میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ یہ سب جانتی تھیں کہ پارو ابھی دُلہن بن کر محبوب کی حویلی میں جانے والی ہے۔ ایسے وقت وہ بکرے والا اُسے کنواری ماں کہہ رہا تھا۔

یہ عورتوں کے لئے بڑی دل چسپ اور چونکا دینے والی بات تھی۔ ہر گلی، ہر گھر کی عورتیں اسے روک کر پوچھ رہی تھیں۔ ''اس بے چاری بدنصیب کو بدنام کر رہے ہو یا سچ بول رہے ہو؟''

وہ کہتا جا رہا تھا۔ ''میں کچھ نہیں بول رہا ہوں۔ پارو کا پیٹ بول رہا ہے۔ نکاح جائز نہیں ہوگا۔ محبوب اسے بیوی بنا کر نہیں، داشتہ بنا کر لے جا رہا ہے۔''

اس بدنصیب کو بدنامی سے بچانے کی حتیٰ الامکان کوششیں کی گئی تھیں، لیکن جو ہونی تھی، وہ ہو رہی تھی۔ جہاں پیدا ہوئی تھی اور نیک نامی سے رہتی آئی تھی، وہاں دیکھتے ہی دیکھتے بدنام ہوتی چلی جا رہی تھی۔

پیش امام اور دوسرے مسلمان بزرگوں نے کہہ دیا۔ ''محبوب علی! یہ نکاح نہیں ہوگا۔ انتظار کرو۔ اُسے زچگی سے فارغ ہونے دو۔''

ایک کمرے میں پارو اپنی سہیلیوں کے ساتھ تھی۔ پچھلے دو دن سے پے در پے اُس پر مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں۔ مقدر کے حملے بڑے اعصاب شکن تھے اور یہ آخری حملہ تو جان لیوا تھا۔ اُسے کنواری ماں کہا جا رہا تھا۔

وہ بہت رو چکی تھی۔ آسمان بھی ایک وقت ساون بھادوں کے آنسوؤں سے خالی ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی خشک ہوگئی تھیں، اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ یہ خیال کچوکے لگا رہا تھا کہ ناگ پارا کی سب ہی عورتیں اور مرد اسے ننگی آنکھوں سے دیکھیں گے، ننگے دماغ سے سوچیں گے کہ شادی سے پہلے بے لباس ہوگئی تھی۔

بڑے شرم کی بات تھی۔ اس کی سہیلیاں اس سے ہمدردی کرنا چاہتی تھی، اس سے بول رہی تھیں۔ مگر اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی توہین اور ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ مر جانا چاہتی تھی۔

محبوب نے صحن میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔ ''میں پارو کو ایک لاوارث کی طرح تیرے میرے گھروں میں رہنے نہیں دوں گا۔ ہمارا نکاح نہیں ہوگا، نہ ہو۔ مگر وہ میری حویلی میں رہے گی۔''

پیش امام نے کہا۔ ''وہ کسی رشتے کے بغیر تمہارے گھر میں رہے گی تو اور بدنام ہوگی۔ تم دونوں گناہ گار کہلاؤ گے۔''

اس نے کہا۔ ''وہ اب بھی بدنام ہو رہی ہے۔ جو اس کی حیا کو اور میری شرافت کو سمجھیں گے، وہ ہمارے خلاف کبھی کچھ نہیں بولیں گے۔ اور جو دشمن ہیں، وہ آج بھی کیچڑ اچھال رہے ہیں، کل بھی اچھالیں گے۔''

بنواری نے کہا۔ ”یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ منصور نے کیول پارہ کی عزت ہی نہیں لوٹی، اس کے گھر کو، اس کے پورے پریوار کو مٹی میں ملا دیا۔ اب وہ شمبھو جیسے بدمعاش کا چیلا بن گیا ہے۔ آگے چل کر پارو کے ساتھ اور بدمعاشی کرنا چاہے گا۔ ایسے وقت محبوب ہی اُس کی رکھشا کر سکتا ہے۔“

ایک بزرگ نے کہا۔ ”بے شک، پارو کے ساتھ بہت برا ہوتا آ رہا ہے۔ آئندہ نہ جانے اس کے ساتھ اور کیا ہوگا۔ پارو کو محبوب کی پناہ میں ہی رہنا چاہئے۔“

اور تمام بزرگوں کی حمایت حاصل کر کے پارو سے بولا۔ ”آؤ، میرے ساتھ حویلی چلو۔“

وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں اور ایسے بدترین حالات میں وہی ایک مضبوط سہارا تھا۔ وہ ایک بڑی سی چادر لپیٹ کر اس کے ساتھ باہر آئی۔ اس نے پہلے کبھی پردہ نہیں کیا تھا، اب بدنامی نے منہ چھپانے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ بگھی میں اس کے ساتھ سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے چادر کو گھونگھٹ بنا کر چہرے کو چھپا لیا تھا۔ مکان کے باہر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ ایک نوجوان نے محبوب سے کہا۔ ”دُلہن مبارک ہو۔“

دوسرے نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے، نکاح نہیں ہوا۔ ابھی مبارکباد نہ دو۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”وہ مقبول بکرے والا کہہ رہا تھا کہ نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر تو یہ دُلہن نہ ہوئی، پھر یہ اس کے ساتھ کیوں جا رہی ہیں؟“

محبوب نے گھوڑے کو لگام کا اشارہ دیا۔ وہ چل پڑا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ ان سے فوراً پیچھا چھڑانا چاہئے۔ اس نے گھوڑے کو چابک رسید کی تو وہ فوراً ہی رفتار پکڑنے لگا۔ ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ ”جب بن بیاہی جا رہی ہو تو منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟“

دوسری نے کہا۔ ”نئی نئی بدنامی ہے۔ جب جھیل لے گی تو چادر ہٹ جائے گی۔“

محبوب نے دوسری، تیسری چابک رسید کی۔ گھوڑا اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے دور ہونے لگا۔ آگے کئی عورتوں اور مردوں نے دُور ہی سے دیکھ

کر ہاتھ کا اشارہ کیا اور پوچھا۔ ”کیا شادی ہو گئی؟“

کسی نے پوچھا۔ ”محبوب علی! کیا یہ تمہارے ساتھ پارو بیٹھی ہے؟“

محبوب نہ رُک رہا تھا، نہ کسی کو جواب دے رہا تھا۔ بڑی تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ گھوڑا بہت تیز رفتار ہوتا ہے، اپنے سوار کو مصائب سے دور لے جاتا ہے۔ پھر بھی بدنامی سے زیادہ تیز رفتار نہیں ہوتی۔ بدنامی تو پلک جھپکتے ہی ناگ پارا میں پھیل گئی تھی اور آگے کہاں تک پھیلے گی، وہ نہیں جانتے تھے۔

حویلی بستی والوں سے ذرا ہٹ کر تھی۔ وہ بولنے والوں سے دُور نکل آئے۔ محبوب نے بگھی کی رفتار دھیمی کر دی۔ گھوڑا آرام سے دُلکی چال چلنے لگا۔ کھلی فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بڑی تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر پارو کو دیکھا، پھر کہا۔ ”چادر ہٹا لو، آرام سے بیٹھو۔“

وہ چادر ہٹا کر تازہ ہوا میں سکون سے سانسیں لینے لگی۔ محبوب نے اسے نظر بھر کر دیکھا، پھر کہا۔ ”ہم گردش میں ہیں۔ ایک مصیبت سے نکلتے ہیں، دوسری میں پھنس جاتے ہیں۔ حوصلہ رکھو۔“

وہ کچھ نہ بولی، ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں کبھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ ابھی ہمارا نکاح نہیں پڑھایا گیا۔ تم محلے پڑوس کے اور بستی والوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ تم کسی کی محتاج رہو۔“

”آپ بہت اچھے ہیں۔ مجھے سہارا دے رہے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”محبت کرنے والے صرف محبت کرتے ہیں، احسان نہیں کرتے۔ تمہارے دل میں میرے لئے پیار ہوگا تو تم میری محبت اور دیوانگی کو احسان نہیں کہو گی۔ مجھے اپنی جان سمجھو گی۔“

”آپ کے سوا میرا کون ہے؟ آپ ہی میری جان ہیں، ایمان ہیں، میرے سر کا آنچل ہیں۔“

اُس کا ہاتھ گدی پر تھا۔ اس پر محبوب کا ہاتھ آ گیا۔ بس ایک ہاتھ آیا تھا۔ پارو

کو لگ رہا تھا، وہ پورے کا پورا اُس کے وجود پر چھا گیا ہے۔ کیسا سخت، کھردرا، بھاری بھرکم پتھر تھا۔ پھول پر آ پڑا تھا۔ رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد......اُس کے دودھیا رخسار تمتما رہے تھے۔

وہ حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ایک ملازم نے آ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ محبوب علی نے کہا۔ ''عبدل! اپنی گھر والی سے بولو، مالکن کی خدمت کے لئے چار چھ عورتیں ابھی لے آئے۔ یہاں دن رات خدمت کرنے والیوں کی ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔''

وہ بولا۔ ''مالک! ابھی گھوڑا کھول کر جاتا ہوں۔''

محبوب بگھی کے سامنے سے گھوم کر پارو کے سامنے آیا، پھر بولا۔ ''نکاح ہو جاتا تو تمہیں بازوؤں میں اُٹھا کر حویلی کے اندر لے جاتا۔ وائے حسرت!......تمہیں اپنے گھر لانے کا خواب پورا تو ہو رہا ہے، مگر تعبیر ادھوری ہے۔''

اس نے سہارا دے کر اسے بگھی سے اُتارا۔ یوں اُسے چھونے اور پکڑنے کی حسرت نکل رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندر آیا۔ اگرچہ پوری حویلی صرف پارو کے لئے ہی تھی مگر ابھی اس کی خواب گاہ کے لئے کوئی کمرا مقرر نہیں ہوا تھا۔ مقرر ہو جاتا تو وہاں سیج کو پھولوں سے سجانے کا وقت جانے کتنی مدت کے بعد آنے والا تھا۔

وہ اُسے اپنی خواب گاہ میں لایا۔ کشوری لال نے اس کمرے کو دُلہن کی طرح سجایا تھا۔ وہاں آتے ہی دونوں کی آنکھوں میں خواب بھر گئے۔ وہ کمرا دُلہن کے نام ہونے والا تھا۔ نہ ہو سکا۔

تقدیر کے تماشے عجب ہوتے ہیں۔ وہاں دُولہا بھی تھا، دُلہن بھی تھی اور سہاگ کی سیج بھی۔ مگر اُن کے ارمان دل میں ہی رہنے والے تھے۔

سیج پر بکھری ہوئی پھولوں کی پتیوں سے دُلہن کا پسینہ مہکنے والا تھا، بہکنے والا تھا اور بہکانے والا تھا۔ مگر ارمانوں کی قبر پر بکھری ہوئی سرخ پتیاں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں، دلوں کو سلگا رہی تھیں اور بدن کے گھر کو آگ لگا رہی تھیں۔

پارو پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر آہستہ آہستہ بیٹھ گئی۔ محبوب سر جھکا کر کمرے سے

باہر آ گیا۔

❀✪❀

ناگ پنچمی کا تہوار تھا۔ سانپوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ ناگ پارا سے ملحقہ جنگل میں ایک چھوٹا سا پہاڑی ٹیلہ تھا، وہاں ایک غار میں یوں تو کئی چھوٹے بڑے سانپ تھے، مگر اہمیت ایک ناگ سانپ کی تھی۔ خاص طور پر اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ اسی ناگ دیوتا کے نام سے اس بستی کو ناگ پارا کہا جاتا تھا۔

وہ ناگ اکثر اس بستی میں آتا تھا۔ تمام ہندو دُور ہی دُور سے ہاتھ جوڑتے تھے اور اس سے رحم کی بھیک مانگتے تھے۔ ''ہے ناگ دیوتا! ہم پر دیا کرو۔ جو پاپی ہیں، ان کو لے جاؤ۔ ہمیں چھوڑ دو۔''

اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ناگ دیوتا، نیک ور دھارمک لوگوں کو کبھی نہیں ڈستے۔ پاپیوں کا سروناس (تباہ و ہلاک) کر دیتے ہیں۔

وہ ناگ اِدھر اُدھر گلیوں سے گزرتا تھا۔ ایسے وقت لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہوتی تھیں۔ وہ ناگ کو مارتے نہیں تھے، اُسے اپنی طرف آنے سے روکتے تھے۔ اس طرح وہ اپنا رُخ بدل کر دوسری سمت چلا جاتا تھا۔

اُس روز عجب تماشا ہوتا تھا۔ مسلمان اپنے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند رکھتے تھے۔ باقی گھروں کے کھلے ہوئے دروازوں پر دودھ سے بھرے ہوئے برتن رکھے جاتے تھے، تاکہ وہ دودھ پی کر، شکم سیر ہو کر واپس چلا جائے۔

اگر یہی ہوتا تھا۔ وہ دودھ پی کر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے انداز میں بھٹکتا ہوا جنگل کی طرف چلا جاتا تھا۔ اگر کسی پر پاپ کرنے کا، چوری، دھوکے بازی اور بے ایمانی کا الزام ہوتا تو پنڈتوں اور پجاریوں اور پنچوں کا فیصلہ ہوتا کہ اس ملزم کو ایسی جگہ بٹھا دیا جائے، جہاں سے ناگ دیوتا گزرتا ہے۔

ایسی سزا گویا سزائے موت ہوتی تھی۔ اگر وہ ناگ اسے نہ ڈستا، اس کے پاس سے گزر جاتا تو سب ہی اُسے نئی زندگی کی مبارک باد دیتے تھے، اس کی عزت کرتے تھے اور اُسے پھولوں کی مالا پہناتے تھے۔

پچھلے دس برسوں میں اس ناگ نے دوملزموں کو ڈس لیا تھا اور دو ایسے تھے، جو بچ نکلے تھے۔ ایک پجاری پر بلات کار کا الزام تھا۔ اُس نے ایک کم سن بچی سے زیادتی کی تھی، جس کے نتیجے میں وہ مرگئی تھی۔ پجاری کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا، لہٰذا اُسے ناگ دیوتا کے گزرنے والے راستے پر بٹھا دیا گیا تھا۔

ایسے وقت یہ تجسس پیدا ہوتا ہے کہ ناگ دیوتا اسے سزا دے گا، اُسے ڈسے گا یا چھوڑ دے گا؟ ایسا پُرتجسس تماشا دیکھنے کے لئے وہاں لوگوں کو بھیڑ لگانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ کیونکہ ناگ بھیڑ دیکھ کر کترا جاتا تھا۔ ملزم کی طرف نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے بہت دُور سے چھپ کر اور چھتوں پر چڑھ کر پجاری کی موت کا تماشا دیکھنا چاہا تھا۔

وہ بڑا ہی دم بہ خود کر دینے والا منظر تھا۔ ناگ بل کھاتا ہوا پجاری کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مرنے سے پہلے ہی جان نکلی جا رہی تھی۔ ناگ کنڈلی مار کر، پھن کاڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ڈسنے سے پہلے جانے کیوں اُسے تک رہا تھا۔ ان لمحات میں ایسی دہشت طاری ہوئی تھی کہ پجاری کی دھوتی بھیگ گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سجدے میں گر کر، چیخ چیخ کر بولنے لگا تھا۔ ”ہے دیوتا!........ شیو شنکر کے گلے کی مالا!........ مجھے شما کر دو........ بس، ایک بار شما کر دو۔“

تھوڑی دیر بعد ہی ناگ نے کنڈلی چھوڑ دی۔ اس سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ سانپ اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے۔ کسی کو بھی ڈستا ضرور ہے۔ پتہ نہیں، اس نے پجاری کو کیوں چھوڑ دیا تھا؟ شاید اس لئے کہ تھوڑی دیر پہلے وہ ایک دروازے سے پیٹ بھر کر دودھ پی کر آیا تھا۔

لوگ چھتوں سے اُتر کر آ گئے، اُسے نیا جیون پانے کی مبارک باد دینے لگے۔ لیکن بیش تر افراد چپ تھے۔ انہیں یقین کی حد تک شبہ تھا کہ پجاری نے پاپ کیا ہے۔ بلات کار بھی کیا ہے اور کم سن بچی کی ہتیا بھی کی ہے۔

اتنے یقین کے باوجود انہیں اپنے ناگ دیوتا سے شکایت نہیں تھی۔ ان کا عقیدہ کہہ رہا تھا کہ پجاری کو معاف کر دینے میں دیوتا کی کوئی مصلحت ہوگی۔ جہاں عقیدہ

پتھر کی لکیر بن جاتا ہے، وہاں خود کو سمجھانے اور اپنے دھرم پر قائم رہنے کی خاطر کئی پہلو نکل آتے ہیں۔

چھ برس پہلے ایک بیوہ پر بدچلنی کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ قسمیں کھا کر اس الزام سے انکار کر رہی تھی۔ اُسے جنگل میں لے جا کر ناگ دیوتا کے بل کے سامنے کچھ فاصلے پر بٹھا دیا گیا تھا۔

مگر وہ جان دینے کے لئے وہاں بیٹھ نہ سکی۔ ناگ بل سے باہر آیا تو اُسے دیکھتے ہی چیختی چلاتی ہوئی جنگل میں بھاگتی چلی گئی۔ کچھ لوگ اُس کے پیچھے گئے لیکن وہ گھنے جنگل میں جا کر گم ہوئی تھی۔ تقریباً دو برس بعد معلوم ہوا، وہ رام پور کے ایک کروڑ پتی سیٹھ کی رکھیل بن کر عیش و آرام سے زندگی گزار رہی ہے۔

بہر حال، شمبھو دادا، منصور اور مقبول بکرے والے کی سازشوں کے مطابق یہ بات پھیلائی گئی تھی کہ پارو نے اپنے حُسن و شباب سے، اپنی اداؤں سے منصور کو پھانس لیا تھا اور چھپ چھپ کر اُس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہتی تھی۔

منصور کی پارسائی یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ گناہ گار بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ پارو کو گناہوں سے باز رکھنے کے لئے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس بدچلن نے شادی کرنے کے لئے محبوب کو پھانس لیا اور منصور کو ٹھکرا دیا۔

منصور کی ماں کلثوم کہتی پھرتی تھی کہ پارو کے پیٹ میں میرے منصور کا بچہ ہے۔ وہ محبوب سے شادی نہیں کرے گی تو میں اسے بہو بنالوں گی۔

مقبول بکرے والے نے کلثوم کو سمجھایا تھا۔ ”محبوب پارو کا دیوانہ ہے۔ وہ نکاح کے بغیر اسے گھر لے گیا ہے۔ وہ اسے ہمارے حوالے نہیں کرے گا اور ہم پھوٹی ہوئی ہانڈی کو کبھی گھر نہیں لائیں گے، صرف اسے بہو بنانے کی باتیں کریں گے۔“

کلثوم نے کہا۔ ”میں سمجھ گئی۔ ہم پارو کو مصیبت کی ماری کہیں گے، اسے گلے لگانے کی باتیں کریں گے۔ مگر وہ تو فاحشہ بن گئی ہے۔ منصور کو چھوڑ کر محبوب کی داشتہ بن کر رہنے لگی ہے۔“

اس بکرے والے کے پچاس جانوروں کا نقصان پورا ہو گیا تھا۔

شمبھو اُسے رام پور میں مویشی منڈی کا صدر بنانے والا تھا۔

اُسے اِنکم ٹیکس کی ادائیگی سے بچانے والا تھا۔

اس لئے وہ دل کھول کر پارو اور محبوب کے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ محبوب نے ناگ پارا کے بزرگوں اور پنچوں کو بتا دیا تھا کہ منصور نے ایک رات خنجر کی نوک پر کس طرح پارو پر ظلم کیا تھا۔ وہ پارو کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی بھرپور کوششیں کر رہا تھا۔

کچھ لوگ اُسے سچا اور صاف گو کہہ رہے تھے، باقی لوگ کہہ رہے تھے۔ ''وہ منصور کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اور منصور کے ماں باپ اسے اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں، اسے عزت آبرو سے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں تو تم اسے چھوڑ دو۔ تم نے کسی رشتے کے بغیر اسے حویلی میں کیوں رکھا ہے؟''

یہ بھی کہا گیا۔ ''اسے اپنے گھر میں رکھ کر اور بدنام نہ کرو۔ وہ تمہاری رکھیل کہلا رہی ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''افسوس! جو شیطان ہے، اسے انسان سمجھ رہے ہو۔ میں پارو کو مظلوم کہہ رہا ہوں، مگر کوئی یقین نہیں کر رہا ہے۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ......''

ایک نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یقین دلانا آسان ہے۔ پارو کی بدچلنی یا پارسائی کا فیصلہ ہم نہیں کریں گے، ناگ دیوتا کریں گے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہاں۔ آخری فیصلہ وہیں ہو سکتا ہے۔ پارو کو ناگ دیوتا کے استھان پر لے جا کر بٹھاؤ۔ وہ زندہ واپس آئے گی تو سب ہی مان لیں گے کہ وہ مجبور اور مظلوم تھی۔ بدمعاش اور ظالم منصور ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''ایک مسلمان کو یہ مشورہ نہ دو۔ تم لوگ ناگ دیوتا کی پوجا کرتے ہو، ہم نہیں کرتے۔ ہمارا خدا ایک ہے اور وہی ظالموں کو ان کے برے انجام تک پہنچاتا ہے۔ میں پارو کے حق میں حق بات بولتا رہوں گا۔ آپ حضرات یقین نہ کریں، مگر جو سچ ہے، وہ روزِ روشن کی طرح ایک دن سامنے ضرور آئے گا۔''

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جا رہا تھا۔ بدنام رفتہ رفتہ مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی توہین اور ذلت کی بات یہ تھی کہ وہ کنواری ماں بننے والی تھی۔ اس پر دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ عزت اور شرافت سے مقبول بکرے والے کی بہو نہیں بن رہی

ہے، محبوب کی گود میں جا کر بیٹھ گئی ہے۔

وہ حویلی میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ناگ پارا جا کر محلے پڑوس والیوں اور اپنی سہیلیوں سے نہیں ملتی تھی۔ یہ کھلی حقیقت سب کے سامنے تھی کہ وہ نکاح کے بغیر ایک نامحرم کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کی پارسائی مشکوک ہو چکی تھی۔

اُسے داشتہ سمجھا جا رہا تھا۔ لہٰذا بچپن کی سہیلیاں بھی اُس سے ملنے نہیں آتی تھیں۔ بنواری لال جیسے چند بزرگوں کو محبوب کی شرافت اور پارسائی کا یقین تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس نے پارو کے تحفظ اور سلامتی کی خاطر اسے پناہ دی ہے۔ وہ تنہا مصیبت میں گھری ہوئی لڑکی کی خاطر اپنی نیک نامی کو داؤ پہ لگا رہا ہے۔ اس بے چارے کو بدنام نہ کرو۔

اور مخالفین کہتے تھے۔ ''اگر وہ نیک اور شریف انسان ہے، کوئی پاپ نہیں کر رہا ہے تو پھر پارو کو مقبول بکرے والے کی بہو بننے پر راضی کیوں نہیں کر رہا؟''

محبوب لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے عاجز آ گیا تھا۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ منصور ظالم اور بدکار ہے اور اس نے پارو کے پورے خاندان کو تباہ کیا ہے۔ بعض اوقات حالات ایسے عجیب سے ہو جاتے ہیں کہ ظالم، مظلوم دکھائی دیتا ہے اور جو واقعی مظلوم ہوتا ہے، اسے لوگ پتھر مارنے لگتے ہیں۔

❀✪❀

مقبول بکرے والا، مویشیوں کے باڑے میں سوتا تھا اور جھنجلاتا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں آرام سے سونے کی عادت تھی۔ منصور شہر سے واپس نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لئے کہہ دیا گیا تھا کہ اسے ناگ پارا میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اگرچہ کئی لوگ اب اسے بے قصور اور پارسا سمجھنے لگے تھے، اس کی واپسی کا راستہ ہموار ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ محبوب سے خوف زدہ تھا۔

وہ آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ اس نے شمبھو دادا جیسے بدمعاش کو کیسے زیر کیا تھا۔ اس کے بیٹے کو چھین کر، اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر اپنے اشاروں پر نچاتا رہا تھا۔

صرف اتنا ہی نہیں، اس نے پارو کے سامنے منصور کی پٹائی کی تھی اور دادا کہلانے والا زبردست بدمعاش منہ دیکھتا رہا تھا۔ بعد میں اس سے نجات پانے کے

بعد دادا نے قسم کھائی تھی کہ محبوب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

منصور کو اسی شبھ گھڑی کا انتظار تھا کہ رقیب مرے گا تو وہ ناگ پارا واپس جائے گا۔ دادا نے مقبول بکرے والے سے کہا تھا۔ ''چنتا نہ کرو۔ محبوب کسی نہ کسی کام سے رام پور آتا ہی رہتا ہے۔ اس بار آئے گا تو اس کی لاش یہاں سے جائے گی۔ اس کے بعد منصور پھر سے تمہارا دوسرا بازو بن کر ناگ پارا میں رہے گا۔''

موت یا مصیبتیں، رام پور میں محبوب کا انتظار کر رہی تھیں اور وہ حویلی چھوڑ کر اُدھر نہیں جا رہا تھا۔ کبھی دوسرے تیسرے دن ناگ پارا آ کر بنواری لال اور دوسرے حمایتی افراد سے ملاقات کرتا تھا، یا وہ لوگ اس سے ملنے کے لئے حویلی میں آ جاتے تھے۔ وہ پارو سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہتا تھا۔

ایک روز مقبول نے اپنی بیوی کلثوم سے کہا۔ ''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ وہ کم بخت نہ رام پور جا رہا ہے نہ اس کی میت اِدھر آ رہی ہے۔''

کلثوم نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ جلد ہی حرام موت مرے گا۔ پھر میرا منصور یہاں آ کر پہلے کی طرح آزادی سے رہ سکے گا۔''

''پتہ نہیں، کب ایسا ہوگا؟ میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔''

'آپ تو خوابوں میں بھی بکرے بکریوں کو دیکھتے رہتے ہیں اور نوٹ گنتے رہتے ہیں۔ کیا پھر نقصان اُٹھانے کا خواب دیکھا ہے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں۔ میرا ایک بازو کٹ گیا ہے۔''

کلثوم نے گھبرا کر اس کے دونوں بازوؤں کو دیکھا، پھر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں نے خواب میں دیکھا ہے، ایک ایک ہاتھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں، وہ کیسے ٹوٹ گیا تھا؟ میرے بدن سے الگ ہو کر زمین پر پڑا تھا اور میں زمین پر بیٹھ کر اُس ہاتھ کا ماتم کر رہا تھا۔''

وہ پریشان ہو کر منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہائے اللہ! یہ کیسا خواب ہے؟ ہاتھ کٹنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟''

وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرے دو بازو ہیں اور دو بیٹے ہیں۔ میری سمجھ

میں جو آ رہا ہے، اسے سمجھ کر گھبراہٹ طاری ہو رہی ہے۔ میں نے آج جمعے کی نماز میں دعا مانگی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے ساتھ برا نہیں ہوگا۔ اچھا ہی ہوگا۔''

کلثوم کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہم پارو کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''برا کیا کر رہے ہیں؟''

''ہمارا دشمن محبوب ہے۔ وہ ہمارے بیٹے کے پیچھے پڑا ہے اور ہم خوامخواہ پارو کو بدنام کر رہے ہیں۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔ پتہ نہیں، محبوب تلوار سے یا طمنچے سے کب مرے گا؟ ابھی تو پارو کی بدنامی اُسے مار رہی ہے۔ وہ روز تھوڑا تھوڑا کر کے مر رہا ہے۔''

''یہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہم محبوب سے انتقام لینے کے لئے پارو کو مظلوم نہیں کہہ رہے۔ اسے بدچلن ثابت کر رہے ہیں۔''

''وہ بدچلن ہے، بدکار ہے۔ اسی لئے بے حیائی سے اپنے یار کے ساتھ حویلی میں رہتی ہے۔''

''نہیں رہے گی تو کہاں جائے گی؟ اُس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، کوئی رشتہ دار نہیں ہے اور ہم اسے کبھی بہو نہیں بنائیں گے۔''

وہ ذرا چپ ہو کر بڑے جذبے سے بولی۔ ''اُس کے پیٹ میں ہمارا پوتا یا پوتی ہے۔''

مقبول نے اُسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سوچ یہ تھی کہ وہ ایک پوتی یا پوتے کے لئے ترس رہے تھے۔ سات برس پہلے بڑے بیٹے منظور کی شادی کرائی تھی۔ بہو چار برس تک ماں نہ بن سکی تو منظور نے باپ کے کہنے پر اسے طلاق دے دی، پھر دوسری شادی کر لی۔ اب یہ بہو پچھلے تین برس سے ٹرخا رہی تھی، ماں نہیں بن رہی تھی۔

اس کے برعکس منصور بیاہ رچائے بغیر باپ بن رہا تھا۔ سات برس کے بعد ایک پوتی یا پوتا گھر آ سکتا تھا۔ کلثوم نے پوچھا۔ ''کیا ہم منصور کے بچے کو حاصل نہیں کر سکتے؟''

''وہ اپنا بچہ ہمیں نہیں دے گی۔ تم مایوس کیوں ہوتی ہو؟ ہم جلد ہی منصور کی شادی کریں گے تو ہمارے گھر میں پوتے پوتیاں ہنستے کھیلتے دکھائی دیں گی۔''

کلثوم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''پتہ نہیں، یہ محبوب کب مرے گا اور ہمارا بیٹا کب یہاں آئے گا؟ ہم بڑی اُمیدیں لے کر یہ دوسری بہو لائے تھے، یہ بھی بانجھ نکلی۔''

''ہوسکتا ہے، منظور بانجھ ہو۔''

''میں نہیں مانتی۔ بڑا بیٹا بانجھ ہوتا تو چھوٹا بھی ہوتا۔ چھوٹا باپ بن رہا ہے۔ بڑا بھی ایک دن خوش خبری سنائے گا۔''

ایسے وقت مکان کے باہر شور سنائی دیا۔ کچھ لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے کچھ بول رہے تھے۔ مقبول چارپائی سے اُٹھ کر دروازہ کھول کر باہر آیا۔ لوگ اِدھر اُدھر تیزی سے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جوان نے کہا۔

''چاچا! دروازہ بند کرلو۔ ناگ دیوتا آئے ہیں۔''

اُس نے فوراً ہی اندر آ کر دروازہ بند کیا، پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ ناگ کبھی کبھی اُدھر آ نکلتا تھا۔ تمام ہندو بڑی عقیدت سے اُسے دودھ پلاتے تھے۔ جب تک وہ اپنے استھان تک واپس نہ جاتا، تب تک اس پر نظر رکھتے تھے۔ یہ کوشش کرتے تھے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو کر کسی کو ڈس نہ لے۔

اس وقت لوگوں کی بھاگ دوڑ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ پوری بستی میں یہ خوف طاری ہو گیا تھا کہ اسے ڈھونڈا نہ گیا تو وہ کسی نہ کسی کو ڈس لے گا۔ اس پر ہمیشہ نظر رکھی جاتی تھی۔ اس بار جانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا؟

مسلمانوں کے گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ جو ناگ دیوتا کے پجاری تھے، ان کے کھلے ہوئے دروازوں پر دودھ سے بھرے ہوئے برتن رکھے ہوئے تھے۔ وہ دیوتا ایسے ہی کسی گھر کے اندر چلا گیا تھا۔

پھر ایک عورت نے شور مچایا۔ ''دیوتا میرے گھر پدھارے ہیں۔ ہائے میری بچی!...... اسے بچاؤ...... اسے باہر نکالو...... ہے ناگ دیوتا! دیا کرو۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اسے جیون دان دو۔ میں اس کی جندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔''

لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا تم نے دیوتا کو اپنے گھر میں جاتے دیکھا ہے؟''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''دیکھا ہے، تب ہی ہاتھ جوڑ کر سب سے بنتی کر رہی ہوں۔ کوئی اندر جا کر بچی کو لے آئے۔''

کوئی اندر جانے کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں جا کر چھپا ہوا تھا؟ اُسے ڈھونڈنے سے پہلے ہی وہ کہیں سے نکل کر حملہ کر سکتا تھا۔ سب ہی کو اپنی جان پیاری تھی۔

وہ بچی ایک کمرے کے فرش پر سو رہی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد ماں کو نہ پا کر رونے لگی تھی۔ باہر ماں تڑپ رہی تھی۔ وہ تصور میں دیکھ رہی تھی کہ ناگ دیوتا، بچی کو ڈسنے سے پہلے کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

ایک جوان نے زمین پر لاٹھی مارتے ہوئے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں، بچی کو لے آؤں گا۔ ہے ناگ دیوتا! میں آ رہا ہوں...... آنے سے پہلے دیا کی بھیک مانگ رہا ہوں۔''

وہ زمین پر لاٹھی مارتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر رک گیا۔ وہ بچی خود ہی ننھے ننھے پیروں سے چلتی ہوئی دروازے پر آ گئی تھی۔ ماں نے دوڑ کر اُسے اُٹھا لیا، اُسے سینے سے لگا کر دروازے سے دُور ہو گئی۔ ماں کو بیٹی مل گئی، مگر پریشانی دُور نہ ہوئی۔ اُن کے دیوتا گھر کے اندر جانے کہاں جا کر چھپ گئے تھے، یا سو گئے تھے۔ باہر نہیں آ رہے تھے۔ لوگ مکان کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے۔ سانپ گزر جاتا ہے، لکیر رہ جاتی ہے۔ مگر وہاں کوئی لکیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ ناگ، پچھلے دروازے یا کھڑکی سے یا گندے پانی کی موری سے نکل کر جا چکا ہوگا۔ لیکن کسی نے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے یہی سمجھا جا رہا تھا کہ وہ مکان کے اندر کہیں چھپا ہوا ہے۔

منظور شہر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے جانوروں کا ڈھیر سارا چارا تانگے میں رکھ کر لایا تھا۔ باڑے کے سامنے تانگا روک کر چارے کے بنڈل اُتار رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اُس کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

کلثوم اور مقبول اس کی چیخ سن کر دوڑتے ہوئے مکان سے باہر آئے۔ تانگے والا خوف کے مارے نیچے نہیں اُتر رہا تھا۔ نیچے زمین پر منظور ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور منہ سے جھاگ اُگل رہا تھا...... اُس کی حالت دیکھتے ہی یہ سمجھ آ گیا کہ ناگ نے اُسے ڈس لیا ہے۔

ماں چھاتی پیٹتی ہوئی بیٹے کے پاس گر پڑی۔ باپ اُچھل کر تانگے پر چڑھتے ہوئے چیخنے لگا۔ ''دوڑو...... ہماری مدد کرو...... میرے بیٹے کو ناگ نے ڈس لیا ہے۔ وہ ادھر کہیں چھپا ہوا ہے...... اسے ڈھونڈو...... یہاں سے بھگاؤ۔ خدا کے لئے جلدی آؤ۔''

کتنے ہی لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ منظور ہمیشہ کے لئے ساکت ہو چکا تھا۔ لوگ اُسے ہلاک کرنے والے دشمن کو تلاش کرنے لگے، جو دیوتا کہلاتا تھا۔ اُسے مویشیوں کے باڑے میں ڈھونڈا جا رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ دیوتا...... شیوشنکر کے گلے کی مالا...... آرام سے ٹہلتے ہوئے اپنے استھان کی طرف چلے گئے ہیں۔

ناگ پارا میں بیس فی صد مسلمان تھے، باقی ہندو ناگ دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ انہیں اپنے دیوتا سے یہ شکایت نہیں تھی کہ اُس نے ایک بے گناہ کی جان کیوں لی ہے؟ دیوتا تو بھگوان کے نائب ہوتے ہیں۔ جو کرتے ہیں، منش کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں۔

ایسی بھلائی کی گئی تھی کہ ایک گھر کا چراغ بجھ گیا تھا۔ وہ بڑا بیٹا، مویشیوں کا پورا کاروبار سنبھالتا تھا۔ باپ کو آرام پہنچاتا تھا۔ اُس کا ایک ہی مضبوط بازو تھا۔ آہ......! باپ کے سینے سے درد بھری آہ نکلی۔ خواب سچا نکلا۔ اُس کا ایک بازو ٹوٹ چکا تھا۔

کئی برس بعد اس ناگ نے بستی کے ایک آدمی کی جان لی تھی۔ اب سے پہلے وہ دودھ پینے کے بعد واپس چلا جایا کرتا تھا۔

منظور کی موت نے سب ہی کو متاثر کیا تھا۔ وہ بہت ہی ملنسار اور بہت ہر دل عزیز تھا۔ اُس کی موت پر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ پورا ناگ پارا اُس

کی میّت کو کندھا دینے آیا تھا۔ محبوب علی بھی وہاں آیا۔ مقبول صدمے سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی چیخ پڑا۔ ''کیوں آیا ہے؟...... تُو یہاں کیوں آیا ہے؟...... دُور ہو جا، ہماری نظروں سے۔''

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر لوگوں سے بولا۔ ''اسے دھکے دے کر یہاں سے بھگاؤ۔ یہ ہماری بربادی کا تماشا دیکھنے آیا ہے۔''

محبوب نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''چاچا! میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اپنے ضمیر کی آواز پر آیا ہوں۔ آپ کے غم کو، آپ کے صدمات کو دل کی گہرائیوں سے سمجھ رہا ہوں۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔''

ایک شخص بولا۔ ''محبوب علی! جب یہ نہیں چاہتا کہ اس کے گھر آؤ، اس سے ہمدردی کرو تو پھر تمہیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''تم لوگوں کے درمیان جو دشمنی چل رہی ہے، اسے سب جانتے ہیں۔ سب یہی کہیں گے کہ تم دشمن کو روتے اور ماتم کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے آئے ہو۔''

ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ''چلے جاؤ...... یہاں سے چلے جاؤ۔''

محبوب نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''آپ حضرات چپ ہو جائیں۔ میں ابھی چلا جاؤں گا مگر جو کہنے آیا ہوں، وہ کہہ کر جاؤں گا۔''

وہ ذرا چپ ہوا، پھر بولا۔ ''بڑے بھائی کی میّت کو کاندھا دینے کے لئے چھوٹے بھائی کو آنا چاہئے تھا۔ چاچا، چاچی نے اسے میرے خوف سے نہیں بلایا۔ اور لوگو!...... ان کا خوف بے جا نہیں ہے۔ وہ میرا اور پارو کا بدترین دشمن ہے۔ وہ جب بھی نظر آئے گا، میں اُسے جان سے نہیں ماروں گا، اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بھکاری بنا دوں گا۔''

منگو لوہار نے بھیڑ سے نکل کر، سینہ تان کر کہا۔ ''اے علی! کیا تم اپنے آپ کو رستم پہلوان سمجھتے ہو؟''

محبوب نے لباس کے اندر سے ریوالور نکال کر ہوائی فائر کیا۔ منگو نے کہا۔ ”طمنچہ کیا دکھاتے ہو؟ مرد ہو تو پنجہ لڑاؤ۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہاں میت رکھی ہے۔ ورنہ ضرور پنجہ لڑاتا۔ بہتر ہے، مجھے اپنی بات کرنے دو۔ تم یہاں سے جاؤ۔“

اُس کی بات ختم ہونے تک منگو لوہار کے اطراف چار پہلوان آ گئے۔ اُسے چاروں کاندھوں سے جکڑ کر کاندھوں پر لاد کر وہاں سے لے جانے لگے۔ وہ اُن کی گرفت سے نکلنے کے لئے پورا زور لگا رہا تھا، مگر ان پہلوانوں کے آگے صفر ہو کر رہ گیا تھا۔

اُسے لے جانے والے پہلوان ہندو تھے۔ وہاں تعصب اور فرقہ واریت کی کوئی بات نہیں نکلی۔ سب چپ رہے۔ اس نے کہا۔ ”میں جھگڑا کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، منصور یہاں آئے اور اپنے ماں باپ کے غم میں شریک رہے۔ اور چاچا، چاچی اسے آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اپنی غلطیوں کو سمجھیں۔ یہ سوچیں کہ ایک کے بعد دوسرا بیٹا بھی نہ رہا تو پھر ان کے پاس کیا رہ جائے گا؟“

وہ چاروں طرف لوگوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں دھمکی دینے نہیں، سمجھانے آیا ہوں اور یہ کہنے آیا ہوں کہ منصور یہاں آ کر صرف سوئم تک رہ سکتا ہے۔ میں یہاں تین دن تک نہیں آؤں گا۔ میں یا میرے آدمی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ آپ سب جانتے ہیں، میں زبان کا دھنی ہوں۔ جو کہتا ہوں، وہی کرتا ہوں۔“

یہ باتیں سن کر سب ہی کہنے لگے۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ ایک بیٹے کا صدمہ کم کرنے کے لئے دوسرے بیٹے کو یہاں لانے کے لئے کہہ رہا ہے اور زبان دے رہا ہے کہ تین دن تک اس سے کوئی دشمنی نہیں کرے گا۔“

محبوب پلٹ کر وہاں سے جانے لگا۔ دو چار قدم چلنے کے بعد اس نے گھوم کر کلثوم اور مقبول کو دیکھا۔ پھر سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھنے کے بعد کہا۔ ”پارو کی آہیں آسمان تک جا رہی ہیں...... سلطانی خالہ، بلقیس پھوپھی اور بنّے ماموں کی روحیں دیکھ رہی ہیں...... گھر جلانے والے کا گھر جل رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شعلے دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔“

دُور تک خاموشی چھا گئی تھی۔ سب اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ منہ پھیر کر بگھی میں آ کر بیٹھ گیا۔ آدمی کو ساری عمر سمجھاؤ، وہ نہیں سمجھتا۔ گھوڑا ایک لگام کے اشارے کو سمجھ گیا۔ اپنے آقا کو حاسدوں سے دُور لے جانے لگا۔

❁✪❁

منظور کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ گھر سے قبرستان تک تمام مسلمان کلمۂ شہادت پڑھتے گئے تھے۔ ہندو دل ہی دل میں ”رام نام ست ہے“ کہتے رہے تھے۔ مگر وہ سب ہی دھیمی آواز میں محبوب کے متعلق بھی بولتے رہے تھے۔ اُس کی آخری باتوں نے اُنہیں متاثر کیا تھا۔

اُس نے کہا تھا۔ ”پارو کی آہیں آسمان تک جا رہی ہیں۔ سلطانی خالہ، بلقیس پھوپھی اور بنّے ماموں کی روحیں دیکھ رہی ہیں...... گھر جلانے والے کا گھر جل رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شعلے دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔“

پارو پر جیسی تباہی آئی تھی اور جس طرح وہ تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئی تھی، اسے دیکھ کر سب ہی اُسے مظلوم کہتے تھے۔ اُنہیں صرف یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ نکاح کے بغیر محبوب کے ساتھ رہنے لگی تھی۔

اس پر اعتراض کرنے والے یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس کا اپنا کوئی نہیں رہا ہے۔ اسے پیا کے ہی گھر جانا تھا۔ اس لئے وہ حالات سے مجبور ہو کر چلی گئی۔ پارو پر عائد کردہ یہ الزام کمزور تھا کہ وہ منصور سے چھپ چھپ کر ملتی تھی۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، یہ بات صاف طور سے سمجھ میں آتی تھی کہ منصور بھی چھپ کر اُس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ بھی گناہ گار تھا۔

اگر نفرت کی وجہ یہ تھی کہ وہ کنواری ماں بننے والی تھی تو منصور بھی قابلِ نفرت تھا۔ وہ کنوارا باپ بننے والا تھا۔

لوگ نادان نہیں تھے۔ مقبول جس طرح پارو پر کیچڑ اُچھالتا آ رہا تھا، اس طرح یہ قیاس آرائی کی جا رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے منصور کی طرح شمبھو دادا کی جوتیوں میں جا کر بیٹھ گیا ہے۔ جس بستی میں سب لوگ پیار و محبت سے رہتے تھے، وہاں وہ بکرے والا نفرت پھیلا رہا ہے۔

پارو اور محبوب کے، جس رفتار سے مخالفین پیدا ہوئے تھے، اسی رفتار سے اب حمایتی بھی پیدا ہو رہے تھے۔ قبرستان سے واپس آتے وقت بنواری لال اور پیش امام نے مقبول کو سمجھایا۔ ''ہم لوگ، ناگ پارا میں ہمیشہ امن و امان سے رہتے آئے ہیں۔ محبوب سے جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ اُس سے صلح کرلو۔''

وہ بولا۔ ''ہرگز نہیں........جھگڑا میں نہیں کرتا، وہ کرتا ہے۔''

بنواری نے کہا۔ ''شروع تو تم نے کیا۔ نکاح کے دن پارو کو کنواری ماں کہہ کر بدنام کیا۔''

''کیا میں نے غلط کہا تھا؟ وہ حویلی میں جا کر کب تک پیٹ چھپائے گی؟ بچہ ایک دن سب کے سامنے آئے گا۔''

''اگر تمہاری بیٹی کے ساتھ جیادتی کی جاتی تو تم اس کا حمل چھپاتے یا پارو کی طرح اُسے بدنام کرتے؟''

وہ بولا۔ ''خدا کا شکر ہے، میرے گھر میں بیٹی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر ہوتی اور اس کے ساتھ ایسا ہوتا تو میں اُس کا گلا دبا کر مار ڈالتا۔''

''واہ! کیسی احمقانہ بات کر رہے ہو۔ ظلم کوئی کرتا اور تم بیٹی کو مار ڈالتے؟''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں کسی کا گلا نہیں دبا رہا ہوں۔''

''بیٹی نہیں ہے، اس لئے بڑا بول رہے ہو۔ اچھی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔''

''اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھو۔ مجھے نہ سمجھاؤ۔''

''کیا یہ بھی نہ سمجھائیں کہ محبوب سے دوستی رکھو گے تو وہ منصور کو معاف کر دے گا، اُسے نقصان نہیں پہنچائے گا؟''

بنواری نے کہا۔ ''اب ایک ہی بیٹا رہ گیا ہے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ یہاں آ کر، تمہارے پاس رہے؟''

وہ سوچنے لگا۔ یہ چاہتا تھا کہ منصور یہاں آ جائے، تاکہ منظور کی ابدی جدائی کا صدمہ کم ہو۔ کلثوم کی حالت یہ تھی کہ وہ منظور کا ماتم کرتی تھی اور منصور کو پکارتی رہتی تھی۔ ممتا ایک سے محروم ہو کر دوسرے کو ڈھونڈ رہی تھی۔

لیکن مقبول سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔ شمھو اور اس کے بدمعاشوں کی حمایت سے مویشی منڈی کا صدر بن چکا تھا۔ پھر یہ یقین تھا کہ محبوب بہت جلد شمھو کے ہاتھوں جہنم میں جانے والا ہے۔

وہ پیش امام اور بنواری سے کترا کر دوسروں سے باتیں کرنے لگا۔ گھر پہنچا تو کلثوم پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ماں کو یہ صدمہ مار رہا تھا کہ ایک بیٹے کو موت لے گئی ہے، دوسرا بیٹا جیتے جی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ان سے ہونے والی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ گھر گورستان لگ رہا ہے۔

عورتوں نے مقبول کو سمجھایا کہ منصور کو بلا کر لاؤ۔ کلثوم کی حالت سنبھل جائے گی۔

اُس نے کہا۔ ''محبوب بہت مکار ہے۔ وہ مکاری سے منصور کو یہاں بلا رہا ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا رہ گیا ہے۔ وہ آئے گا تو وہ دشمن اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

کئی لوگ اُسے سمجھانے لگے۔ انہوں نے یہ ذمہ داری لی کہ منصور یہاں آئے گا تو وہ اُس کی حفاظت کریں گے اور محبوب کو اُس کے قریب نہیں آنے دیں گے۔

اور وہ ذمہ داری لینے والے جانتے تھے کہ محبوب، زبان کا پکا ہے۔ اگر منصور آئے گا تو وہ تین دن تک ادھر کا رخ نہیں کرے گا، اُسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔

جب سب ہی نے مجبور کیا تو وہ تانگے میں بیٹھ کر رام پور آیا، پھر سیدھا اپنے پیر و مرشد، شمھو دادا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آؤ مقبول! میرے کھبری نے بتایا ہے کہ تمہارے بیٹے کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ تم جوان بیٹے کا دُکھ اُٹھا رہے ہو۔''

وہ مقبول کو گلے لگاتے ہوئے بولا۔ ''میرے کو بولو، میں کس طرح تمہارا دُکھ دُور کروں؟ تمہارے لئے کیا کروں؟''

اُس نے کہا۔ ''آپ کی بڑی مہربانیاں ہیں۔ جب سے آپ نے مجھے یونین کا صدر بنایا ہے، مجھے بڑی عزت مل رہی ہے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اور مال بھی کما رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''جی ہاں۔ میں تو آپ کا تابعدار بن کر رہ گیا ہوں۔ ناگ پارا کے معزز بزرگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں محبوب سے صلح کرلوں۔ مگر میں انکار

کرتا آرہا ہوں۔"

"کبھی صلح نہ کرنا۔ اُس کی جندگانی اب جیادہ نہیں ہے۔ پتہ نہیں، وہ کتا اِدھر کیوں نہیں آرہا ہے۔ میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔ یہ کھجلی اُس کے کھُون سے مٹے گی۔"

"میری گھر والی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ وہ بڑے بیٹے سے محروم ہونے کے بعد چھوٹے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ وہاں سب ہی کہہ رہے ہیں کہ منصور کو اُس کے پاس جانا چاہئے۔ تب ہی ممتا کی ماری کا دُکھ کم ہوگا۔"

"تمہارا ایک ہی بیٹا رہ گیا ہے۔ جب تک وہ دشمن جندہ ہے، اس کو اُدھر نہیں جانا چاہئے۔"

اُس نے سر ہلا کر کہا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر محبوب نے سینکڑوں لوگوں کے سامنے کہا ہے، اگر منصور وہاں آئے گا اور بھائی کے سوئم تک رہے گا تو وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"کیا یہ ماننے والی بات ہے؟"

"وہاں کے پنچ اور تمام معزز لوگ ذمے داری قبول کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں، محبوب زبان کا پکا ہے۔ وہ تین دن تک منصور سے دشمنی نہیں کرے گا۔ اور وہ لوگ کسی طرح کا لڑائی جھگڑا نہیں ہونے دیں گے۔"

"کیا تم بھی سمجھتے ہو، وہ منصور سے دشمنی نہیں کرے گا؟"

"ہاں۔ یہ سمجھیں کہ پورا ناگ پارا یہی کہتا ہے، محبوب میرے بیٹے کے سامنے بھی نہیں آئے گا۔"

شمبھو سر جھکا کر سوچنے لگا۔ مقبول نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "محبوب بہت مکار ہے۔ ابھی وہ نہیں جانتا ہے کہ میں نے منصور کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے وہ چاہتا ہے کہ منصور اپنے بل سے نکلے۔ تین دن کے لئے ناگ پارا جائے۔ جب وہاں سے واپس آئے گا تو وہ چھپ چھپا کے اس کا پیچھا کرے گا۔ اس طرح اُس کے گُپت اڈے تک پہنچے گا۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "ہاں۔ وہ خبیث اس طرح میرے بیٹے کا پیچھا کر سکتا ہے۔

منصور کی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ سکتا ہے۔ میں اُسے ناگ پارا نہیں لے جاؤں گا۔"

شمبھو تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، پھر سر ہلا کر بولا۔ "اب مجا آئے گا۔ وہ شکاری کھُد اپنے جال میں پھنسے گا۔"

"وہ کیسے؟"

وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ "بٹے کو جرور اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تین دن کے بعد اس کو منصور کے پیچھے آنے دو۔ میرے آدمی دُور دُور سے اس کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ پھر وہ جدھر ہتھے چڑھے گا، اُس کو دبوچ لیں گے۔ وہ پھڑ پھڑا کے رہ جائے گا۔"

وہ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے، وہ اِدھر نہیں آرہا ہے۔ منصور کے پیچھے جرور آئے گا، اُس کو موت اِدھر لائے گی۔"

مقبول کچھ بے چین سا ہو کر کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ شمبھو نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ، دادا!........وہ........اگر آپ کے آدمی اُسے پکڑ نہ سکے تو میرے بیٹے کی شامت آجائے گی۔"

وہ ذرا غصے میں آکر بولا۔ "کیا میرے آدمی موم کے بنے ہوئے ہیں؟ کیا اُس کے مُکابلے میں کم جور ہیں؟ ارے، وہ شمبھو دادا کے آدمی ہیں........ شمبھو دادا کے......اس دشمن کو نچوڑ کے رکھ دیں گے۔ کیا تم کو میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "کیسی بات کرتے ہیں، دادا!........آپ پر بھروسہ نہیں کروں گا تو اور کس پر کروں گا؟ میں تو بس، یوں ہی ڈر رہا تھا۔ آپ جو بہتر سمجھتے ہیں، وہی کروں گا۔ منصور کو بلائیں، میں اُسے ابھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

منصور کو کہیں کام سے بھیجا گیا تھا۔ وہ باقاعدہ شمبھو کا تابعدار کارندہ بن چکا تھا۔ کہیں دُور کسی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ چار گھنٹے بعد باپ کے پاس آیا۔ منظور کی موت کا صدمہ تھا۔ دونوں باپ بیٹا گلے لگ کر تھوڑی دیر تک روتے رہے، پھر تانگے میں بیٹھ کر ناگ پارا آگئے۔

وہاں پہنچتے ہی خلافِ توقع، محبوب سے اچانک ہی سامنا ہو گیا۔ وہ بنواری لال

سے ملاقات کرنے کے بعد حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاقاً اُس کی بگھی، تانگے کے سامنے آ گئی۔ دونوں طرف سے لگامیں کھینچی گئیں۔ دونوں گھوڑوں کے سر ایک دوسرے کے سامنے آ کر رک گئے۔

محبوب کو دیکھتے ہی منصور کی آدھی جان نکل گئی۔ مقبول نے گھبرا کر کہا۔ ''خبردار، محبوب! تم نے زبان دی ہے۔ میرے بیٹے کو کچھ نہیں بولو گے۔ اسے ایک ذرا نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ تم نے کہا تھا، اس کے سامنے بھی نہیں آؤ گے۔''

آس پاس سے گزرنے والے وہاں رک گئے تھے۔ محبوب نے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ان کے سامنے نہیں آیا ہوں، یہ میرے سامنے آئے ہیں۔ کیا ہم میں سے کوئی جانتا تھا کہ مقبول چاچا ابھی، اسی وقت اپنے کتے کو یہاں لائیں گے؟''

سب نے کہا۔ نہیں، ایسا اچانک ہو رہا ہے۔

محبوب نے کہا۔ ''میں نے اب تک ان سے کچھ نہیں کہا ہے۔ اس کتے کو گالی بھی نہیں دی ہے۔ یہ باپ بیٹا خوامخواہ ڈر رہے ہیں۔''

اُس کے بیٹے کو گالی دی جا رہی تھی، مگر وہ چپ تھا۔ بات بڑھاتا تو بیٹے کی شامت آ سکتی تھی۔ محبوب نے گھوڑے کو لگام کا اشارہ کیا۔ وہ تانگے سے کترا کر آگے چلنے لگا۔ بگھی اُن کے قریب سے گزرنے لگی۔ اس نے منصور سے کہا۔

''میں زبان پر قائم رہوں گا۔ تین دن تک اِدھر نہیں آؤں گا۔ جاؤ، اپنی ماں کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچاؤ۔''

وہ اُن کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ دونوں نے ایک گہری سانس کھینچی تھی، جیسے جانے والی جان واپس آ گئی ہو۔ یہ بھی اطمینان ہوا کہ وہ تین دن تک نہ ناگ پارا آئے گا، نہ ان کا سامنا کرے گا۔ وہ گھر کی طرف چل پڑے۔

بازار سے اور راستوں سے گزرتے وقت لوگوں نے منصور کو دیکھا تو خوشی کا اظہار بھی کیا اور طعنے بھی دیئے۔ ''ارے منصور! تم آ گئے؟''

کسی نے کہا۔ ''یہ تو بھگوڑا آ گیا۔''

کہیں دور سے آواز آئی۔ ''ارے وہ دیکھو...... کنوارا باپ آ رہا ہے۔''

''کنواری ماں حویلی میں ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟''

''ہونا کیا ہے؟ دونوں دو کنارے بن کر رہیں گے۔ بیچ میں محبوب، دریا کی طرح موجیں مارتا رہے گا۔''

وہ باتیں اور تبصرے سنتے ہوئے گھر پہنچے۔ کلثوم، بیٹے کو دیکھتے ہی لپٹ کر رونے لگی۔ ''ہائے منصور! میری گود تو بالکل خالی ہو گئی۔ میرا منظور...... میرا گبرو جوان بیٹا، زمین کی گود میں چلا گیا اور تُو جیتے جی بچھڑ گیا ہے۔ کیا میں خالی گھر میں ماتم کرتی رہوں گی؟ نہیں...... اب میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔''

وہ ماں کو تھپک کر جھوٹی تسلیاں دینے لگا۔ ''چپ ہو جاؤ، اماں! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، تمہارے پاس رہوں گا۔''

محلے کی عورتیں آ گئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں، ایک بیٹے کا صدمہ تب ہی کم ہو گا، جب دوسرا ماں کی چھاتی سے لگا رہے گا۔ اب منصور کو یہاں سے نہیں جانا چاہئے۔

ایک خاتون نے کہا۔ ''جانا تو ہو گا۔ محبوب تو اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کہتا پھرتا ہے کہ اسی نے پارو کو برباد کیا ہے، اسے مار ڈالے گا یا ہاتھ پاؤں توڑ کے اپاہج بنا دے گا۔''

دوسری نے کہا۔ ''یہ تو کھلی بدمعاشی ہے۔ کیا اُسے روکنے ٹوکنے اور قانون کی پکڑ میں لانے والا کوئی نہیں ہے؟''

مقبول نے اپنے سینے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہ باپ زندہ ہے۔ میں اپنے بیٹے کے دشمن کو خاک میں ملا دوں گا۔ منصور تین دن رہ کر جائے گا، پھر جلد ہی ہمیشہ کے لئے آ جائے گا۔''

وہ تین دن آسانی سے گزرنے والے نہیں تھے۔ پہلے دن سے ہی ماں باپ اور بیٹے کو دھڑکا لگا رہا کہ محبوب زبان سے پھر سکتا ہے۔ اپنے پہلوانوں کے ذریعے منصور کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ دن رات اندیشوں میں مبتلا رہے اور خوامخواہ اپنا خون خشک کرتے رہے۔

منصور جب گھر سے نکلتا تھا تو اس کے چند حمایتی، باڈی گارڈ کے طور پر اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ دوسرے دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ ناگ

پارا کے لوگوں سے ملاقات کر رہا تھا۔ ایسے وقت ایک بڑا سا پتھر آ کر اُس کی پشت پر لگا۔ وہ ایک دم سے چیخیں مارتا ہوا ایک دیوار کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

'محبوب نے حملہ کیا ہے......' اُس کے دماغ نے چیخ کر کہا۔ دوسروں کے ذہن میں بھی یہی بات آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ ایک بچے نے پھل توڑنے کے لئے پتھر پھینکا تھا۔ وہ سب پھل دار درختوں کے سائے میں کھڑے ہوئے تھے۔ منصور کے اندیشوں کے مطابق کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ محض دہشت طاری تھی۔

وہ راتوں کو دروازے کھڑکیاں بند رکھتے تھے۔ کلثوم نے کہا۔

"زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر محبوب نہ مرا، برسوں تک جیتا رہا تو ہمارا کیا بنے گا؟ کیا منصور ہمارے ساتھ کبھی نہیں رہ سکے گا؟ ساری زندگی اس سے چھپتا پھرے گا؟"

مقبول نے سر ہلا کر کہا۔ "مجھے بھی یہی خیال ستاتا رہتا ہے۔ یہ دشمنی مہنگی پڑ رہی ہے۔ حالانکہ شمبھو سے فائدہ بہت ہے۔ مگر ہم دوسرے بیٹے سے بھی محروم ہو رہے ہیں اور یہ بیٹا وہاں بدمعاشوں والی زندگی گزار رہا ہے۔"

منصور نے کہا۔ "ایسا تو نہ بولو، ابا! ایسی زندگی میں بڑا مزہ آ رہا ہے۔ جسے علاقے میں ابھی رہتا ہوں، وہاں کے لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ آدمی کو کہیں تو زبردست بن کر رہنا چاہئے۔"

کلثوم نے کہا۔ "کیا غنڈا بدمعاش بن کر رہنے کے لئے ماں باپ کو چھوڑ دو گے؟"

"کچھ دنوں کی بات ہے، اماں! میرا دشمن کتے کی موت مارے گا تو میں یہاں شمبھو دادا کا رائٹ ہینڈ بدمعاش بن کر آؤں گا۔ پھر میرا رعب اور دبدبہ دیکھو گی۔ ناگ پارا کے سب ہی لوگ مجھے جھک جھک کر سلام کریں گے۔"

مقبول نے کہا۔ "ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے بدمعاشی نہیں کی، مگر ہمیں کرنی ہوگی۔ یہ مویشیوں کا دھندا چمک رہا ہے۔ شمبھو دادا کا ہاتھ ہمارے سر پر ہے۔ ایک مہینے بعد بقر عید ہے۔ منڈی میں ہزاروں جانور بکیں گے۔ میں یونین کا صدر ہوں۔ چور دروازے سے بڑی کمائی ہوگی۔"

منصور نے کہا۔ "پھر یہ کہ محبوب سے دوستی کبھی نہیں ہو سکے گی۔ میں نے پارو کے ساتھ جو کیا ہے، اس کا بدلہ وہ ضرور لے گا۔ شکر کرو، ہم شمبھو دادا کی چھتر چھایا میں ہیں۔ وہ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں پا رہا ہے۔ دادا کا شکر ادا کرو۔ میں تمہارے سامنے سانسیں لے رہا ہوں۔ وہ خبیث مرے گا تو میں بوڑھا ہونے تک سانسیں لیتا رہوں گا۔"

ماں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "میں تو دن رات دعائیں مانگتی ہوں۔ یا اللہ! اس موئے کلوٹے محبوب کو اٹھا لے۔ میرے بیٹے کو میری عمر بھی دے دے۔ آمین۔"

باپ نے بھی آمین کہا۔ دعا غلط ہو تو تاثیر حسبِ منشا نہیں ہوتی۔ وہ جو نہیں چاہتے تھے، وہ ہو گیا۔ یک بارگی باڑے سے جانوروں کا شور سنائی دیا۔ پھر پچھلی کھڑکی سے کچھ روشنی سی دکھائی دی۔ وہ تینوں دوڑتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئے۔ باہر دیکھا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

باڑے میں آگ لگی تھی۔ احاطے کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ جانور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے باہر نکل کر بھاگ رہے تھے۔ مقبول سر پکڑ کر چیختا ہوا پچھلے دروازے کی طرف گیا۔ اسے کھول کر جانوروں کو پکڑنے کے لئے دوڑا۔ ماں نے منصور کو پکڑ لیا۔

"تم نہ جاؤ۔ وہ دشمن کہیں چھپا ہوگا۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

اُس نے دوڑ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ باہر مقبول حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ لوگوں کو مدد کے لئے، جانوروں کو پکڑنے کے لئے بلا رہا تھا۔ کتنے ہی لوگ دوڑے چلے آئے تھے۔ اس سے پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ پہلے بھی بستی کے لوگ جانوروں کو پکڑنے کے لئے دوڑتے اور ہلکان ہوتے رہے تھے۔

وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "میرے جانور واپس نہ آئے تو محبوب کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ دشمن میرے جانوروں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ پہلے بھی ہزاروں روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ آج تو حد ہو گئی ہے۔ میں اتنا بڑا نقصان برداشت نہیں کروں گا۔ مر جاؤں گا......میں مر جاؤں گا۔"

بستی کے لوگوں نے پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں لا کر باڑے کی آگ بجھا دی۔ معلوم ہوا کہ گھڑیالی اور نائٹ چوکیدار نے آگ لگانے والے کو دیکھ لیا تھا۔ اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگتے گئے ہیں۔

مقبول نے حلق پھاڑ کر کہا۔ ”آگ لگانے والا وہی محبوب ہوگا، یا پھر اس کا آدمی ہوگا۔ آج سب کو مل کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ میرے دشمن کو قانون کے حوالے کرنا ہوگا۔ سب آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مجھ پر کیسا ظلم ہو رہا ہے۔“

لوگ اُسے تسلیاں دے رہے تھے کہ محبوب کے خلاف کارروائی ہوگی۔ پہلے پنچوں کے ذریعے اُس کا حقہ پانی بند کیا جائے گا، پھر اُسے قانون کے حوالے کیا جائے گا۔

باڑے میں اٹھائیس بکرے، بکریاں تھیں۔ وہ بڑھا چڑھا کر بتا رہا تھا کہ ستر جانور تھے۔ جن میں سے صرف دس پکڑے گئے ہیں، باقی بھاگ گئے ہیں۔ وہ محبوب سے ہزاروں روپے وصول کر کے رہے گا۔

گھڑیالی اور نائٹ چوکیدار اس واردات کرنے والے کو پکڑ نہ سکے۔ گھڑیالی نے سب کے سامنے آ کر کہا۔ ”اس کے ہاتھ میں بڑی سی ننگی کٹار تھی۔ ہم نزدیک جا کر اُسے پکڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ ہم کو کھُون میں نہلا دیتا۔“

چوکیدار نے کہا۔ ”میں نے دُور سے لاٹھی گھما کر حملہ کیا تو لاٹھی اُس کی کٹار سے لگ کر کٹ گئی۔ یہ دیکھو۔“

اُس نے کٹی ہوئی لاٹھی دکھائی۔ مقبول نے کہا۔ ”تم دونوں نے اس کی صورت دیکھی ہوگی، اُسے پہچان لیا ہوگا؟“

”صورت دیکھی ہے، وہ ہمارے ناگ پارا کا نہیں ہے، باہر کا ہے۔ شہر سے آیا ہوگا۔“

منصور گھر سے نکل آیا۔ اس نے کہا۔ ”محبوب نے شہر سے کرائے کے بدمعاشوں کو بلایا ہوگا تاکہ اس پر کوئی الزام نہ آئے۔ وہ اپنی زبان سے پھر گیا ہے۔ اس نے بڑی مکاری سے ہم پر وار کیا ہے۔“

بنواری لال نے کہا۔ ”تم کسی ثبوت اور گواہ کے بنا اِلزام دو گے تو کوئی نہیں

مانے گا۔ پھر محبوب جھوٹا اِلزام برداشت نہیں کرے گا۔ تین دن کے بعد تمہیں ناگ پارا سے باہر نکلنے نہیں دے گا۔ اُس کو گستا نہ دلاؤ تو اچھا ہے۔“

مقبول نے کہا۔ ”اور تو ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے، پھر کون یہاں آگ لگانے، جانوروں کو بھگانے اور ہزاروں روپے کا نقصان کرنے آئے گا؟“

ایک نے کہا۔ ”ہاں۔ دشمنی کے بغیر کوئی اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

کشوری لال نے کہا۔ ”پارو کے پریوار سے بھی کسی کو دشمنی نہیں تھی۔ پھر اس کا گھر کس نے جلایا؟ کس نے اس کے پیاروں کو جلا ڈالا، مار ڈالا؟ کیا اس کا جواب کسی کے پاس ہے؟“

کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔ بظاہر بلوائیوں نے پارو کا گھر جلایا تھا، ہتیا کی تھی اور پورے دیس میں بلوائی کسی دشمنی کے بغیر خون کی ندیاں بہا رہے تھے۔ فی الحال یہ کوئی جان نہیں سکتا تھا کہ موجودہ واردات کس نے کی ہے یا کرائی ہے؟

شمبھو دوہری چالیں چل رہا تھا۔ پچھلے دنوں اُس نے مقبول کو دو ہزار روپے دیئے تھے۔ سخی داتا بن کر اس کے جانوروں کا نقصان پورا کیا تھا۔ اُسے مویشی منڈی کی یونین کا صدر بنایا تھا، اُسے انکم ٹیکس کی ادائیگی سے بچا رہا تھا۔ اس قدر فائدہ پہنچانے کے متعلق کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مویشی کے باڑے میں آگ لگوائے گا۔

وہ آگ اس نے محبوب کو بدنام کرنے کے لئے لگوائی تھی۔ یہ دل میں ٹھان چکا تھا کہ ناگ پارا کے لوگوں کو پیار و محبت، امن و شانتی سے نہیں رہنے دے گا۔ اس مقصد کو پانے کے لئے وہ دونوں باپ بیٹے کے سامنے رہ کر ان کے سر سہلا رہا تھا اور پیچھے سے انہیں لاتیں مار رہا تھا۔

پارو دیکھ رہی تھی کہ وہ دیوانہ عاشق اُس کی خاطر اپنے لئے کیسی بدنامیاں مول لے رہا ہے۔ طرح طرح کی مخالفتیں جھیل رہا ہے اور دیس کا نیتا بننے والے بدمعاش شمبھو سے تنہا ٹکر لے رہا ہے۔ وہ اسے حویلی میں آتے جاتے دیکھتی رہتی تھی اور دل ہی دل میں قربان ہوتی رہتی تھی۔

انہوں نے ایک چھت کے نیچے رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے فاصلہ رکھا تھا۔ وہ ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے، اپنے موجودہ حالات پر گفتگو کرتے تھے اور حالات ایسے اعصاب شکن تھے کہ حالِ دل بیان کرنے کے لئے فضا سازگار نہیں ہوتی تھی۔ دل کے ارمان دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتے تھے۔ مسائل اور پریشانیاں حاوی ہوتی چلی جاتی تھیں۔

وہ بڑے جذبے سے بے چین ہو کر سوچتی تھی۔

''اس کے لئے کیا کروں؟......وہ میرے لئے تن، من، دھن سب کچھ وار رہا ہے۔ عداوتیں اور بدنامیاں مول لے رہا ہے۔ وہ اندر سے بہت اُلجھا ہوا ہوگا۔ بکھر گیا ہوگا۔ ایسے وقت میرا فرض ہے کہ میں اُسے پیار سے سمیٹ لوں۔

مگر کس رشتے سے......؟

وہ مضطرب ہو کر سوچنے لگی۔ ''میں منکوحہ نہیں ہوں، محبوبہ تو ہوں۔ اسے حالات کے حبسِ بے جا میں ذرا آنچل کی ہوا دوں گی تو تازہ فرحت بخش جھونکے ملیں گے۔ ذرا اس کی جان میں جان آئے گی۔ اس حد تک پنکھا جھلنے کا رشتہ تو ہو سکتا ہے......؟

میں اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھوں گی تو گویا مرہم رکھوں گی۔ میں منکوحہ نہ سہی، نرس بن سکتی ہوں۔ کسی بھی مریض سے نرس کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ توجہ دیتی ہے۔ کلائی تھام کر ڈوبتی ہوئی نبض کی رفتار بڑھاتی ہے۔ حوصلہ دیتی ہے کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے، جب تک نبضِ حیات کی رفتار معلوم پر نہیں آئے گی، وہ ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

میرے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل تنہا ہیں۔ ایسے تو وہ بالکل ہی ٹوٹ جائیں گے۔ نہیں......انہوں نے مجھے بے یارومددگار نہیں رہنے دیا، میں بھی اُنہیں تنہا تنہا، دُور دُور نہیں رہنے دوں گی۔

وہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ اُس کی خدمت کے لئے دن میں چار عورتیں حویلی میں رہتی تھیں۔ رات کو دو عورتیں بیٹھک میں جاگتی رہتی تھیں۔ کسی وقت بھی اس کی ایک آواز پر دوڑی چلی آتی تھیں۔ وہاں آنے جانے والے اُسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ محبوب نے اُسے مہارانی بنا کر رکھا تھا۔

اس وقت وہ عورتیں رسوئی گھر میں اور حویلی کی صفائی میں مصروف تھیں۔ وہ اپنی خواب گاہ سے نکل کر محبوب کے کمرے میں آئی۔ وہ باہر جانے کے لئے جرابیں اور جوتے پہن رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔ ''آؤ پارو! میں ابھی تم سے مل کے جانے والا تھا۔''

وہ کبھی کمرے میں آتی تو اُس سے فاصلہ رکھ کر، کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرتی تھی۔ اس وقت قریب بیٹھنا چاہتی تھی، مگر بستر پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئی۔ وہاں ریوالور اور ڈھیر سارے بُلٹس رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

وہ ایک جوتے کا فیتہ باندھتے ہوئے بولا۔ ''ایک مہینہ اور دس دن ہو گئے ہیں، رام پور نہیں گیا۔ بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں۔ اپنے وکیل سے ضروری کاغذات لکھوانے ہیں۔ کچہری جا کر پیشکار سے ملنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''شام ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔ کچہری کا کام تو دن کو ہوتا ہے۔''

''ہاں، رات وہاں گزاروں گا۔ صبح وکیل اور پیش کار سے ملوں گا۔''

''رات وہاں کیوں گزاریں گے؟ کیا صبح نہیں جا سکتے؟''

''تم جانتی ہو، رام پور میں ہمارا ایک جانی دشمن ہے۔ وہ میری تاک میں رہتا ہو گا۔ اس لئے اندھیرے میں چھپ کر جاؤں گا۔ اُس کے غنڈے موالیوں کی نظروں میں نہیں آؤں گا۔''

''آپ ابھی چھپ جائیں گے، کل دن کی روشنی میں تو نظر آئیں گے۔''

''اللہ نے چاہا تو کل ہونے تک دشمن کا کل نہیں آئے گا۔''

''آپ اس سے ٹکرانے جا رہے ہیں...... کیوں جا رہے ہیں؟ خدا کے لئے نہ جائیں۔''

''میں کب تک اُس سے کتراتے ہوئے زندگی گزارتا رہوں گا؟ رام پور میں کچہری کے اور دھان مل کے کئی کام میرے بغیر ادھورے پڑے ہیں۔ کبھی تو دشمنی کو کسی انجام تک پہنچنا ہے۔ اس دنیا میں وہ رہے گا، یا میں رہوں گا۔''

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پارو نے کہا۔ ''آپ جان پر کھیلنے جا رہے ہیں۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا؟''

''میں نے کاغذ لکھ دیا ہے۔ میری تمام زمینیں، یہ حویلی اور دھان مل، سب تمہارے نام ہو جائیں گی۔ میرا وصیت نامہ بابو جی کے پاس ہے۔ وہ تمہارے سرپرست بن کر رہیں گے۔''

''میں یہ زمین جائیداد لے کر کیا کروں گی؟ آپ نہیں رہیں گے تو دشمن دندناتے ہوئے اِدھر آئیں گے۔ بابو جی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر کیا کِیا جائے؟ دشمنوں سے تو نمٹنا ہی ہو گا۔ زندگی اور موت کی بازی تو کھیلنی ہی ہو گی۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہم یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے۔''

''اپنا سب کچھ چھوڑ کر کہاں جائیں؟ زمین جائیداد کی خاطر واپس آنا ہی ہو گا۔''

''آپ نے خبر سنائی تھی کہ 14 اگست کو پاکستان وجود میں آ رہا ہے۔ ہم وہاں چلے جائیں گے۔''

''میں نے یہی سوچا تھا۔ تمہیں بدنام کیا جا رہا ہے۔ تم یہاں نیک نامی سے نہیں رہ سکو گی۔'' وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''جی چاہتا ہے، منصور کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں، تا کہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ پھر یہاں کسی کنواری کو برباد کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔''

''اگر ایک کو سزا ملنے سے دوسروں کو عبرت حاصل ہوتی تو ہماری دنیا سے بدکاری ختم ہو جاتی۔ آپ پاکستان چلنے کی بات کریں۔''

''زمین جائیداد فروخت کرنے میں مہینے لگ جائیں گے۔ تب تک پتہ نہیں، دشمن کیا کر گزرے؟ پھر یہ کہ باپ دادا کی زمینیں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔'' وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ ''ہاں، اگر میں نہ رہا تو تمہیں اختیار ہو گا، تم ساری زمین جائیداد بیچ کر پاکستان چلی جانا۔''

''آپ ایسا نہ کہیں۔ میں مر جاؤں گی، یہاں آپ کے بغیر ایک دن بھی جی نہیں سکوں گی۔ یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے۔''

''میں خدا کے بعد بابو جی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ وہ تمہیں بہ حفاظت پاکستان پہنچا دیں گے۔''

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی اُس کے بالکل سامنے آ گئی۔ اب سے پہلے وہ ایک چھت کے نیچے اتنے قریب نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو دُور ہی سے آنچ دیتی تھی۔ اب اتنے قریب آ کر احساسات میں سلگنے لگی۔ محبوب کی دھڑکنوں کو پاگل کرنے لگی۔

وہ بولی۔ ''میں جانتی ہوں، آپ میرے روکنے سے نہیں رُکیں گے۔ اِس پار یا اُس پار فیصلہ کر کے رہیں گے۔''

اُس نے ہاتھ بڑھا کر محبوب کو چھو لیا۔ اُس کے بازو کو بڑی نزاکت سے تھام کر کہا۔ ''میں نے فیصلہ کیا ہے، آپ کے بعد میری زندگی میں کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔''

یہ کہتے ہی وہ ایک دم سے آگے بڑھ کر لپٹ گئی۔ ہولے ہولے سسک سسک کر رونے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس کا دیوانہ ہے، وہ اچانک اپنے بدن

سے بدن پر دستک دینے لگے گی۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آیا، ایسے وقت کیا کرے؟ کیا اُسے بازوؤں کے حصار میں لے لے؟ قربت ایسی تھی کہ پاگل کر رہی تھی۔ اُس کا حُسن جس قدر اُجلا اُجلا، ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا، بدن اتنا ہی دوزخ کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پا...... پارو......! ہمیں فاصلہ رکھنا چاہئے۔''

وہ بولی۔ ''خدا نہ کرے۔ آج کے بعد جو فاصلہ قائم ہوگا، دائمی ہوگا۔ آپ نے میرے لئے کیا نہیں کیا؟ اتنا کیا ہے کہ میں آپ کے لئے کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ بس، یہ خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہوں۔ میرا پیار پالیں۔''

وہ ذرا ہچکچایا، پھر اُس کے بازوؤں نے اُسے پالیا۔ دُور دُور سے پیاسا رہنے والا، ساحل پر پہنچ گیا۔ بڑے جذبے سے بولا۔ ''آج مجھ جیسا خوش نصیب کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی پارو کو پا رہا ہوں، سینے سے لگا رہا ہوں۔ جو کبھی مل نہیں سکتی تھیں، مجھے وہ مرادیں مل رہی ہیں۔''

پارو نے بڑے کرب سے پوچھا۔ ''ان مرادوں کی عمر کیا ہے؟ ابھی آپ کے جانے کے بعد میرے پاس کیا رہ جائے گا؟''

وہ یک بارگی اس سے الگ ہوکر بولا۔

''میں رہوں گا...... تمہارے پاس میں رہوں گا۔ ابھی تمہیں سینے سے لگا کر یہ جذبہ، یہ ضد پیدا ہو رہی ہے کہ تمہیں ہمیشہ اپنی دھڑکنوں سے لگا کر رکھوں گا۔ خدا میرے ساتھ ہے، میں کل واپس آؤں گا۔''

وہ ذرا مطمئن ہوکر ہوکر بولی۔ ''میں تمام رات عبادت کرتی رہوں گی۔ آپ کی سلامتی اور واپسی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔''

''ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، دینی احکامات کے مطابق اپنے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھا ہے۔ دنیا ہمیں بدنام کر رہی ہے، مگر خدا سب جانتا ہے۔ ہم اس وقت کا انتظار کریں گے، جب ایک دوسرے کا مقدر ہو جائیں گے۔''

اُس نے تمام بُلٹس کو اُٹھا کر پتلون کی جیب میں رکھا، ریوالور کو لباس کے اندر چھپایا، پھر پارو کا ہاتھ تھام کر حویلی کے باہر آیا۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پارو

نے کہا۔ ''اماوس کی رات ہے۔ آج تو بہت اندھیرا ہوگا۔ کیا رام پور پیدل جائیں گے؟''

اس نے پچھلی جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر دکھائی، پھر کہا۔ ''دو کوس کا فاصلہ کچھ نہیں ہوتا۔ آرام سے ٹہلتا ہوا کھیتوں سے گزرتا ہوا چلا جاؤں گا۔ اندھیرا سازگار ہے۔ نہ کوئی دیکھے گا، نہ پہچانے گا۔''

پارو کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''خدا حافظ! میں آپ کے واپس آنے تک جاگتی رہوں گی۔ آپ کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتی رہوں گی۔''

آنسو پھر بہنے لگے۔ وہ بڑے پیار سے آنسو پونچھ کر جانے لگا۔ رات کی تاریکی مسلط ہو رہی تھی۔ وہ حویلی کے احاطے سے باہر جاتے جاتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

❁ ✪ ❁

شمبھو اپنے مخبروں کے ذریعے محبوب کی کڑی نگرانی کرتا آ رہا تھا۔ اُسے دن رات یہ رپورٹ ملتی رہتی تھی کہ وہ حویلی میں کتنا وقت گزارتا ہے اور کیا کرتا پھرتا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا کہ وہ رام پور کب آئے گا؟

اور وہ جیسے رام پور کا راستہ بھول گیا تھا۔ اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لئے نہیں آ رہا تھا۔ انتظار کی حد ہوتی ہے۔ ایک ماہ دس دن ہو چکے تھے۔ وہ بے زار ہو گیا تھا۔ محبوب کا وکیل اور دھان مل سے تعلق رکھنے والے بیوپاری اس سے لین دین کے سلسلے میں حویلی آتے تھے، وہ رام پور نہیں جاتا تھا۔

سب کہتے تھے کہ وہ پارو کا دیوانہ ہو گیا ہے، اس سے چپک کر رہ گیا ہے۔ جب تک اس کی زچگی کا وقت نہیں آئے گا، اس سے الگ نہیں ہوگا۔ جب وہ وقت آئے گا اور وہ پارو کو رام پور کے میٹرنٹی ہوم میں لائے گا، تب شمبھو کے نشانے پر آئے گا۔

اس کے متعلق ایسی رائے قائم کرنے کے باعث شمبھو کے مخبر کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ بے چارے دن رات اُس کی نگرانی کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ محبوب نے دشمنوں کو بڑی حد تک تھکا مارا تھا۔ پھر شہر جانے کے لئے اماوس کی اندھیری رات

میں نکلا تھا۔

اُس کے اپنے مخبر بھی بڑا کام دکھا رہے تھے۔ منصور ناگ پارا میں تین دن رہنے کے بعد واپس گیا تھا۔

خیال تھا کہ محبوب یا اس کے پہلوان اس کا تعاقب کریں گے۔ مگر ایسا کوئی پیچھا کرنے والا دشمن مخبروں کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اماوس کی رات سے پہلے محبوب کے آدمی شمبھو کے گھر کی اور دفتر کی نگرانی کرتے رہے۔ شہر کے لاری اڈّے اور ریلوے اسٹیشن میں موجود رہے۔ وہ عام مسافروں کی طرح اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تھے۔ ان پر مخبر ہونے کا شبہ کسی نے نہیں کیا۔

منصور، ناگ پارا سے واپس آنے کے بعد کانگریس پارٹی کے دفتر میں بیٹھا رہا۔ اس کے ساتھ دو رکھوالے تھے۔ ان کے پاس لانبے پھل والے دو چاقو تھے۔ وہ ہتھیار لوگوں کو ڈرانے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ وہ ان باڈی گارڈز کے ساتھ رات کے آٹھ بجے ایک لاری میں بیٹھ کر بیس میل دُور دھنّو بستی میں گئے تھے۔ یہ معلوم ہوگیا کہ وہ وہاں ایک مکان میں بڑے آرام سے رہتا ہے۔

شمبھو کے متعلق اطلاع ملی کہ اُس نے کہیں سے بڑا مال کمایا ہے۔ موج مستی کے لئے، ناچ گانے اور پینے پلانے کے لئے دہلی کی ایک مہنگی طوائف کو بلایا ہے۔ وہ اپنے رنگ محل نامی اڈّے میں رات گزارنے والا تھا۔

منصور، دھنّو بستی میں پہنچ کر مطمئن ہوگیا تھا۔ آرام سے سونے کے لئے بستر پر جا رہا تھا، اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔

"کون ہے......؟"

ایک رکھوالے کی آواز سنائی دی۔ "میں ہریا ہوں۔ دروجا کھولو۔"

"کیوں کھولوں؟ اتنی رات کو کیوں آئے ہو؟"

"دادا کا آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے، انہوں نے ابھی ہم سب کو بلایا ہے۔"

اُس نے دادا کا نام سن کر دروازہ کھولا۔ اس کے دونوں رکھوالے پیچھے سے دھکے کھاتے ہوئے اندر آئے۔ ان کے پیچھے دو پہلوان دکھائی دیئے۔ پھر منصور کو ایک

دماغی جھٹکا پہنچا۔ کھلے ہوئے دروازے پر محبوب کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی آدھی جان نکل گئی۔ کھڑے رہنے کی بھی سکت نہ رہی۔ وہ گرنے کے انداز میں فرش پر بیٹھ گیا۔

محبوب نے آگے بڑھ کر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ اُس کے رکھوالے اُس کی رکھشا نہیں کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے محبوب کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اپنے چاقو، پہلوانوں کے حوالے کر دیئے تھے۔ اب فرش پر اُکڑوں بیٹھے منصور کی دُھلائی ہوتے دیکھ رہے تھے۔

وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا، معافیاں مانگ رہا تھا۔ محبوب نے کہا۔ "کیا تجھے معاف کر دینے سے تُو نیک اور شریف انسان بن جائے گا؟......کیا شیطان کی جوتیوں سے نکل آئے گا؟ کیا تجھے معاف کر دینے سے پارو پہلے کی طرح اَن چھوئی کنواری دُلہن بن سکے گی؟......کیا وہ آخری سانسوں تک یہ بدنامی دھو سکے گی کہ دُلہن بننے سے پہلے آبرو لٹا چکی تھی؟

"نہیں......تمام عمر اُس کا سر جھکا رہے گا۔ وہ عورتوں کی محفلوں میں بھی سر اُٹھا کر نہیں چل سکے گی۔ تجھے تو ایسی سزا ملنی چاہئے کہ تُو جیتے جی مرتا رہے اور مر مر کے جیتا رہے۔

وہ اُسے ٹھوکریں مارتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ اُسے یہ صدمہ تھا کہ پارو اُس خبیث کی بدکاری کے باعث ٹوٹ گئی ہے۔ دونوں پہلوانوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ ایک پہلوان نے کہا۔ "منصور! اِدھر دیکھو۔"

اُس نے مار کھاتے کھاتے سر گھما کر دیکھا۔ اُس پہلوان نے ایک رکھوالے کے سینے میں چاقو گھونپ دیا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرے پہلوان نے دوسرے رکھوالے کے ساتھ بھی یہی کیا۔ وہ موت کا منظر منصور کو دہلا رہا تھا اور جیسے کہہ رہا تھا کہ ان کے بعد اس کی باری ہے۔

محبوب نے کہا۔ "ہم نے چشم دید گواہوں کو ختم کیا ہے۔ کوئی یہ جان نہیں سکے گا کہ میں اِدھر آیا تھا۔"

پھر اُس نے پہلوانوں سے کہا۔ "یہ زندہ رہے گا۔ اسے لے جاؤ۔ جہاں میں نے کہا تھا، اسے وہیں پہنچا دو۔"

وہ دونوں اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ”تم زبردست بھگوڑے ہو۔ جب بھاگتے ہو تو کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔ اگر یہ رسیاں توڑ کر بھاگنا چاہو گے تو یہ پہلوان تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

دونوں پہلوان اسے اٹھا کر وہاں سے چلے گئے۔ محبوب نے باہر آ کر دروازے پر تالا لگایا، پھر ایک کوس تک پیدل چلتا ہوا ہائی وے پر آ گیا۔ وہاں سے لاریاں گزرتی رہتی تھیں۔ وہ ایک لاری میں بیٹھ کر رام پور پہنچ گیا۔

اس شہر میں اُس کے پہلوان اور جی دار ملازم اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شمبھو اپنے رنگ محل میں ہے۔ اُس وقت رات کے تین بجے تھے۔ گانے بجانے کی محفل سرد پڑ چکی تھی۔ رنگ محل کے اندر خاموشی اور نیم تاریکی تھی۔

باہر اُس کے تین پہرے دار تھے۔ انہوں نے بھی دادا کی چھوڑی ہوئی شراب سے پیاس بجھائی تھی۔ اب نشے میں اونگھ رہے تھے۔ ذرا سی جدوجہد کے بعد اُنہیں قابو میں کرلیا گیا تھا۔

محبوب نے اندر آ کر دیکھا۔ ایک خواب گاہ کے بیڈ پر شمبھو نشے کی حالت میں بے لباس پڑا تھا۔ اس کے قریب رتن بائی کی چولی، بلاؤز اور لہنگا بکھرا ہوا تھا۔ وہ خود نہیں تھی۔

اُس نے غسل خانے کے بند دروازے کے قریب آ کر کان لگا کر سنا۔ پتہ چلا، وہ اندر گنگنا رہی ہے اور اشنان کر رہی ہے۔

اُس نے ایک بڑی سی چادر اُٹھا کر کمرے اور غسل خانے کی لائٹس آف کر دیں۔ رتن بائی نے اندر سے پوچھا۔ ”اے جی! شمبھو جی! کیا لائٹ گئی ہے؟“

پھر وہ بولی۔ ”تم نے تو اتنی پی لی ہے کہ میری آواز بھی نہیں سن رہے ہو گے۔ میرے بٹوے میں ماچس ہے۔ میں آ کر موم بتی جلاتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ محبوب نے اُس پر چادر ڈال کر بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اُس کے حلق سے چیخ نکلی تھی، پھر وہ دھمکی سن کر چپ ہو گئی۔ اس نے لائٹ آن کر دی۔ وہ تاریکی میں اُسے دیکھ نہ سکی، اب روشنی ہوئی تو چادر

میں چھپا دی گئی تھی۔ دو پہلوان آ کر اُسے اُٹھا کر رنگ محل کے ایک دُور اُفتادہ حصے میں لے گئے۔

محبوب نے شمبھو کے لباس کی تلاشی لی۔ فرش پر ایک گاؤ تکیے کے پاس اُس کا بھرا ہوا پستول پڑا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھا لیا۔ ایک ملازم نے غسل خانے سے بھری ہوئی بالٹی لا کر اُس پر ڈالی تو وہ ہڑبڑا گیا۔ بستر پر لیٹے ہی لیٹے اِدھر سے اُدھر ہو کر خمار آلود آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

محبوب نے ایک اُلٹا ہاتھ اُس کے منہ پر رسید کیا۔ مار پڑتے ہی وہ کراہتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا۔ ”مجھے نہ دیکھ، اپنے آپ کو دیکھ۔“

وہ اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہی اُچھل کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ خود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے دُور پڑے ہوئے لباس کو دیکھنے لگا۔ محبوب نے کہا۔

”تیری قسمت میں ننگا رہنا لکھا ہے۔ اور تُو ننگا ہی اس دنیا سے جائے گا۔“

وہ بولا۔ ”بڑے بھاگ وان ہو۔ ہمیشہ مجھ پر بھاری پڑ جاتے ہو۔ میرے کو گولی مارنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو، پھانسی پر لٹک جاؤ گے۔ راج دھانی کے نیتا تم کو بیچ کے نکلنے نہیں دیں گے۔“

”میرے خلاف کسی کو کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ یہ پستول تمہارا ہے اور تم نشے کی حالت میں خودکشی کر رہے ہو۔“

اُس نے پستول کی نال کو اُس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ بولا۔ ”مجھے نہ مارو۔ میں قسم کھا کے بولتا ہوں، پھر کبھی تم سے دشمنی نہیں......“

ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ وہ ایک ذرا تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ محبوب نے پستول کو اُس کی مٹھی میں پکڑا دیا۔ یہ ظاہر ہونے لگا کہ اس نے خود ہی اپنے آپ پر گولی چلائی ہے۔

پہلوانوں نے آ کر کہا۔ ”مالک! وہ طوائف تو مر گئی۔“

”کیسے مر گئی؟......میں نے اُسے ہلاک کرنے کو نہیں کہا تھا۔“

ایک پہلوان نے کہا۔ ”میں نے جان بوجھ کر اُس کی ہتیا نہیں کی ہے۔ بس،

تھوڑی دیر تک اُسے دبوچ کر رکھا تھا۔ چادر کے اندر اُس کا دم گھٹ گیا۔''

''ہوں....'' محبوب نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔''اُسے یہاں لے آؤ۔''

وہ دونوں واپس گئے، پھر اُسے اُٹھا کر لے آئے۔ محبوب نے اُس کی نبض ٹٹولی۔ وہ واقعی مر چکی تھی۔ اس نے کہا۔''یہ بیان دے سکتی تھی کہ یہاں کچھ لوگ آئے تھے۔ پھر یہ شمبھو کی خودکشی کا کیس نہ بنتا۔ بے چاری نے جان سے جا کر میرے لئے بہتری پیدا کر دی ہے۔''

وہ سب وہاں سے نکل آئے۔ باہر تین پہرے داروں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ محبوب کے وفادار انہیں اٹھا کر لے گئے۔ وہ شہر سے بہت دور جنگل میں جا کر انہیں منوں مٹی تلے دبانے والے تھے۔

وہ طویل تھکا دینے والی عداوتیں ایک رات میں اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔ محبوب شام کے گہرے اندھیرے میں حویلی سے نکلا تھا۔ صبح کی اذان سے پہلے واپس آ گیا۔ پارو مسرتوں کے پنکھ پر پرواز کرتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ اُس کے آنسو تمام مصائب کی تلخیاں دھو کر ایک نئی زندگی کی دہلیز پر جگمگا رہے تھے۔

اُس نے بے شک جان لیوا عداوتوں کو ختم کر دیا تھا، لیکن شیطان مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کی جگہ دوسرے شیطان آ جاتے ہیں۔ شمبھو، رام پور کا بہت بڑا بدمعاش تھا اور کانگریس کا ایک ایسا رُکن تھا، جو نیتا بنتا جا رہا تھا۔ اُس کی موت پر دہلی سے کانگریس پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر آئے اور اس کی ہلاکت کے سلسلے میں شدید ردِعمل ظاہر کر رہے تھے۔ بڑے جوش و جذبے سے انکوائری کر رہے تھے۔

پولیس اور سراغ رساں رپورٹ پیش کر رہے تھے کہ شمبھو نے اپنے ہی پستول سے خودکشی کی ہے۔ رتن بائی اختلاجِ قلب کی مریضہ تھی، اُس کی خودکشی کا منظر نہ دیکھ سکی، اُس کا دم نکل گیا۔ رنگ محل کے باہر جو تین پہرے دار تھے، اُنہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔

شمبھو کے جتنے کارندے اور چیلے چپاٹے تھے، اُنہیں طلب کیا جا رہا تھا۔ یہ

معلوم ہوا کہ اس کے لئے کام کرنے والا منصور، دھنو بستی میں رہتا تھا۔ وہاں سے لاپتہ ہے۔ اس کی رہائش گاہ میں دو رکھوالوں کی لاشیں پائی گئی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کیوں کیا ہے؟

پھر شمبھو کے دشمنوں کی فہرست بنائی گئی۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام محبوب علی کا تھا۔ شمبھو کی بیوہ نے محبوب کے خلاف بیان دیا تھا۔ دہلی سے آنے والی پولیس کا افسر اس کے پیچھے پڑ گیا۔

کلثوم اور مقبول اپنے بیٹے کی گمشدگی سے پریشان تھے۔ محبوب نے انکوائری سے پہلے ہی انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ اس کے خلاف بیان دیں گے تو منصور زندہ سلامت نہیں ملے گا، اس کی حمایت میں بولتے رہیں گے تو وہ ایک ماہ کے اندر ناگ پارا آ کر ہمیشہ ماں باپ کے ساتھ رہے گا۔

انہوں نے انکوائری کرنے والوں کو بیان دیا۔''ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہمارا بیٹا، شمبھو دادا کے گینگ میں شامل ہو جائے۔ منصور ہماری بات نہیں مانتا تھا۔ ہم نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں گیا ہے؟ جہاں بھی گیا ہے، جلد ہی واپس آ جائے گا۔ زیادہ دنوں تک اپنی ماں سے دُور نہیں رہے گا۔''

محبوب کو شبے کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ اُس کے خلاف ثبوت اور چشم دید گواہ نہیں تھے۔ بنواری لال نے اُسے ضمانت پر رہا کرا لیا۔ پورے ناگ پارا میں یہ خیال، یہ رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا کہ محبوب نے رام پور کے خطرناک بدمعاش اور کانگریس کے نیتا کو اس کے بدمعاشوں سمیت موت کے گھاٹ اتارا ہے اور قانون کی گرفت میں نہیں آ رہا ہے اور نہ آئے گا۔

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ انکوائری کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ رام پور کے بدمعاشوں میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ محبوب سے ٹکراتے۔ وہ اسے اپنا دادا بنانا چاہتے تھے۔ اس نے کہہ دیا۔''میں شریف بدمعاش کہلانے لگا ہوں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے باقاعدہ بدمعاش بن کر رہنے کا شوق نہیں ہے۔ تم لوگ ناگ پارا کے رہنے والوں کو پریشان نہیں کرو گے تو میں تمہارے معاملات میں مداخلت کرنے نہیں

آؤں گا۔"

ناگ پارا میں اسے اور پارو کو بدنام کرنے والے، بھیگی بلی بن گئے تھے۔ اسے شریف بدمعاش مان کر جھک جھک کر سلام کرنے لگے تھے۔ ایک روز پارو اپنے محبوب کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر ناگ پارا آئی تو کیا بچے، کیا جوان اور کیا بوڑھے، سب ہی اُسے سلام کرنے لگے تھے۔ جو دُور کھڑے ہوئے تھے، وہ خوش آمدید کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلانے لگے۔

وہ دونوں، بنواری لال کے پاس آ گئے۔ اس سے کچھ باتیں کیں، پھر بنواری اپنے بیٹے کشوری لال کے ساتھ بگھی میں بیٹھ گیا۔ وہ سب ناگ پارا کے مختلف محلّوں سے گزرنے لگے۔ کشوری اونچی آواز میں بولنے لگا۔

"ناگ پارا کے باسیوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ منصور ابھی آ رہا ہے۔ وہ کہاں تھا؟ اتنے دنوں تک کہاں گم رہا؟ یہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو پیپل کی چھیّاں میں آ جاؤ۔"

منصور کے ماں باپ نے سنا تو خوش ہو کر محبوب کو دعائیں دینے لگے۔ فوراً ہی دروازے پر تالا ڈال کر پیپل کی چھیّاں میں آ گئے۔ وہاں بستی کی عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے سب ہی چلے آ رہے تھے۔ ایک تو منصور طویل گمشدگی کے بعد آ رہا تھا اور پارو بھی جیسے ایک مدت کے بعد ملکہ عالیہ بن کر آئی تھی۔ جیسے نئی ہو گئی تھی۔ لوگ اسے بھی دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے تھے۔

اونچے چبوترے پر پارو، محبوب، بنواری لال، کلثوم اور مقبول بکرے والا کے علاوہ پنچ کمیٹی کے بزرگ بھی تھے۔ سامنے دُور تک عورتیں ایک طرف اور مرد دوسری طرف زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے وقت شور اُٹھا کہ منصور آ رہا ہے۔

سب نے اُٹھ کر چبوترے کے پچھلے حصے کی سمت دیکھا۔ وہاں ایک تانگا آ کر رُکا۔ وہ دو پہلوانوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کلثوم تڑپ کر بیٹے کی طرف لپکی۔ وہ تانگے سے اُتر کر ماں سے لپٹ گیا۔ وہ اُسے چومنے لگی۔ لبالب ہو جانے والی ممتا چھلکنے لگی۔ پھر بیٹا اُس کے ساتھ چلتا ہوا چبوترے پر آ گیا۔

پچھلے دنوں محبوب نے دھمکی دی تھی کہ اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اُسے اپاہج بنا

دے گا۔ لوگ دیکھ رہے تھے، وہ سر سے پاؤں تک صحیح سلامت تھا۔ پارو چادر میں لپٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دُور تک دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری ماؤ......! بہنو......! بزرگو......! اور بھائیو! آپ سب کی مہربانیوں سے یہاں مجھے خوب بدنام کیا گیا۔ جس کمینے کی وجہ سے بدنام ہوئی، وہ مجرم بھی آپ کے سامنے ہے۔ اس ذلیل کمینے سے پوچھا جائے، کیا میں اس سے راضی تھی یا اس نے جبر کیا تھا؟"

منصور، ماں باپ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ بنواری نے کہا۔

"چلو اُٹھو اور جواب دو۔"

اُس نے دائیں بائیں سر گھما کر ماں باپ کو دیکھا، پھر وہاں سے اُٹھ کر پارو سے کچھ فاصلے پر آ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"میں مجرم ہوں۔ پارو کو چاقو سے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر ظلم کیا تھا۔"

بہت سی عورتیں تھُو تھُو کرنے لگیں۔ اپنی اُنگلیاں چٹخا چٹخا کر اُسے کوسنے لگیں۔ مرد بھی اُس پر لعنت بھیج رہے تھے۔ پارو نے کہا۔

"ابھی آپ سب کو معلوم ہو گا کہ شیطان سچ کیوں بول رہا ہے۔"

پھر وہ محبوب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بولی۔ "پہلے ہم کمزور تھے، ہم میں سچ بات منوانے کی طاقت نہیں تھی۔ آج میرا محبوب، ناگ پارا سے رام پور تک اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا ہے۔ آج میں جھوٹ بھی بولوں گی تو آپ سب سر جھکا کر اسے سچ مان لیں گے۔ ہم انسان کیا ہیں؟...... انسانیت اور شرافت کو کیوں نہیں سمجھتے؟ فرعون کی طاقت رکھنے والوں کے سامنے کیوں جھک جاتے ہیں؟...... پیار سے کیوں نہیں مانتے؟ ڈنڈے سے کیوں مان جاتے ہیں؟"

اُس نے منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس درندے نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ آپ لوگوں کا فرض تھا کہ مجھ سے ہمدردی کرتے۔ مگر انسانی فطرت عجیب ہے۔ کیچڑ اُچھالنے میں مزہ آتا ہے۔"

پھر وہ چیخ کر بولی۔ "ہے کوئی، جو ابھی مجھ پر کیچڑ اُچھالے؟...... میں اس کمینے کے ساتھ کھڑی ہوں۔ آؤ، مجھے پتھر مارو اور اسے بے گناہ مان کر پھولوں کے

ہار پہناؤ۔ جو ناانصافی کل تک کرتے رہے تھے، آج کر کے دکھاؤ۔"

وہ اچانک دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اُس کا یوں رونا قیامت ہو گیا۔ ساری عورتیں اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ منصور کو لعنت ملامت کرنے لگیں۔ مرد بھی بول رہے تھے۔ "یہ انسان نہیں، جانور ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اسے ناگ پارا سے نکال دو۔ ہم اس پر تھوکتے ہیں۔"

سب ہی اُس کی طرف منہ کر کے تھو تھو کرنے لگے۔ محبوب نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "میری ماؤ!...... میرے بزرگو!...... میری بہنو!...... اور میرے بھائیو! خاموش ہو جاؤ اور میری بات سنو۔"

اس کے بولتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ اس نے کہا۔ "منصور کے خلاف آپ کا غصہ دیکھ کر، لعنت ملامت سن کر یہ فیصلہ ہو گیا کہ اسے سزا ملنی چاہئے۔ ایسی سزا، جسے دیکھ کر دوسرے بھی عبرت حاصل کریں۔ اس نے پارو کو ایسا نقصان پہنچایا ہے، جسے کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسے بھی ایسا نقصان پہنچایا جائے، جسے کوئی پورا نہ کر سکے۔"

ایک بزرگ خاتون نے کہا۔ "محبوب! تم اسے سزا دو۔ ایسی سزا، جس سے پارو کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے۔"

ہر سمت سے آوازیں آنے لگیں۔ "تم جو سزا اسے دو گے، ہم منظور کریں گے۔ اسے دوسروں کے لئے عبرت کا نشان بنا دو۔"

محبوب نے کہا۔ "آپ ایسا چاہتے ہیں تو سنیں۔ میں اسے سزا دے چکا ہوں۔ اس نے پارو کا سر جھکایا ہے۔ آئندہ اس کا بھی سر مرتے دم تک جھکا رہے گا۔ یہ کبھی کسی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔ دنیا کی ہر عورت کو بہن کہے گا اور ساری عورتیں اسے بہن کہا کریں گی۔"

اس بات پر سب نے چونک کر منصور کو توجہ سے دیکھا۔ محبوب نے کہا۔ "اسے اچھی طرح دیکھیں۔ یہ سر سے پاؤں تک صحیح و سالم ہے...... مگر اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔"

اس نے کلثوم اور مقبول کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے ہلاک نہیں

کیا ہے۔ اسے اوپر سے اپاہج نہیں بنایا ہے مگر یہ ٹوٹ چکا ہے۔ آئندہ یہ ہم سب کی بہن بن کر اپنی آخری سانسوں تک زندہ رہے گا۔"

مقبول نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ کلثوم روتی ہوئی آ کر بیٹے سے لپٹ گئی۔ بڑا بیٹا منظور بے اولاد رہ کر مر گیا تھا۔ منصور سے آئندہ اولاد ہونے والی نہیں تھی۔ محبوب نے اُس کے زندہ وجود پر ختم شد لکھ دیا تھا!

(تمت بالخیر)